ابتدائی گفتگو

رب العزت نے جب انسان کو پیدا کیا تو کائنات کے رازوں کا سراغ لگانے کی جستجو اس کی فطرت کا ایک لازمی جزو بنادیا۔

حضرت آدم سے لے کر اب تک کا انسان کبھی اپنے متعلق، کبھی دوسروں کے متعلق، کبھی ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ چند بنیادی سوالات کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں اور ہر اس دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے؟ ہمیشہ سے اس کے لئے مسجد بنے رہے۔ اس کائنات کا وجود اور کو تسخیر کرنے کی سعی انسان کا مقصد بن گئی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا انسان پہ یہ عقدہ کھلا کہ انسان بذات خود اس ایک وسیع کائنات کی مانند ہے اور اس کی اندرونی وسعت بیرونی کائنات کی وسعت سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی لئے (خالق کائنات نے ایک خاص انداز میں وجود عطا سے ہر ڈھونڈنے والے کو نئی دنیا کی نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح دنیا کا نظام ہمیشہ بہتری کی طرف مائل رہا ہے۔ بہتری علم و عرفان کی محتاج رہی ہے اور علم و عرفان کو ہمیشہ عمل کا سہارا لینا پڑا ہے۔ یوں تو اپنی اپنی بساط کے مطابق آدمی تو کیا دنیا کا ہر وجود ارتقا کے مراحل سے گزر رہا ہے لیکن آدمی ان مراحل سے یونہی نہیں گزرتا اسے اس کے لیے سعی پیہم کرنی ہوتی ہے اور سنگلاخ وادیوں میں بھٹکنا ہوتا ہے اور خالق کائنات کا منشا بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ لہٰذا دنیا کی عظیم ترین شخصیتیں عظیم ترین دل و دماغ کے علاوہ عظیم ترین صلاحیتوں اور خصوصیتوں کی بھی حامل ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے کندھوں پر بیشمار انسانوں کی زندگی کا بوجھ ہوتا ہے۔ وہ خواہ مفکر ہوں یا شاعر، صلحا ہوں یا فقیہا، اولیا، ہوں یا انبیا، سبھوں کا تعلق انسانوں کی برادری سے ہے، یہ اور بات ہے کہ انبیا، کا علم کسبی نہیں ہوتا بلکہ وہبی اور الہامی ہوتا ہے اور وہ مکمل طور پر محض دانائے راز ہی نہیں ہوتے بلکہ ان میں عملی طور پر دوسروں کو کامل بنانے کی جبلی صلاحیتیں بھی موجود ہوتی ہیں اور ایسی ہی ہدایت یافتہ باکمال ہستیوں نے انسانیت کے دائرہ اختیار کو عالم بالا سے ملا دیا ہے۔ اس لیے آدمی کا ایک مثالی آدمی کے لیے متظر رہنا عین فطری ہے۔

مثالی شخصیت تعارف:

مثالی آدمی یا شخصیت کے متعلق جاننے سے پہلے ہمیں بنیادی طور پر انسانی شخصیت اور کردار کے بارے میں آنا ہی ہوگا ضروری ہے تاکہ ہم مثالی شخصیت کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ شخصیت اور کردار کے بارے میں تفصیل سے ذکر "اقبال شناسی اور کارواں" میں بعنوان اقبال اور مثالی شخصیت کے تعمیری مراحل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون "پروفیسر سمیع اللہ قریشی" نے تحریر کیا ہے آپ لکھتے ہیں کہ:

"انسان کی ہستی پر من حیث المجموع یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ سب انسانوں کی شخصیت ایک ہوتی ہے۔ البتہ یہ خواہش ضرور کی جا سکتی ہے اور اسے جائز ہی کہا جائے گا کہ بہت سے انسانوں یا زیادہ سے زیادہ انسانوں کی شخصیات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ انسان اپنی فطرت میں ایک خاص وحدت کا مالک ضرور ہے مگر انسانوں میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی الگ شخصیت ہے جو واضح بھی ہو سکتی ہے اور غیر واضح بھی۔ مکمل بھی ہو سکتی ہے اور نامکمل بھی۔ یہاں تک کہ مثبت بھی ہو سکتی ہے اور منفی بھی اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی ذات میں اس کی شخصیت کا مثبت یا منفی ہونا ہی سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہر انسان کی اپنی فطرت اور ذات کے اندر جو کچھ بھی ہنگامہ کارزار برپا ہے اس میں شخصیت ہی بالآخر ایک نقطۂ توازن قرار پاتی ہے۔ انسان بے شک تضادات کا مجموعہ ہے مگر یہ کہنا محل نظر ہوگا کہ انسان کا سرے سے کوئی (Synthesis) ہی نہیں ہے۔ ہر شخص میں دیانت اور سچائی کا کچھ نہ کچھ مادہ ضرور ہوتا ہے، اور ہر شخص چونکہ اپنی ذات میں ایک علیحدہ شخص ہے۔ لہٰذا ایک کردار بھی ہے۔ اگر وہ اس کردار کو کھو دے یا نظر انداز کے کیے رکھے تو وہ محض ایک شخص ہے اور اگر وہ اس کردار کو نہ صرف یہ کہ برقرار رکھے بلکہ اس کی صفت ارتقا پذیری کی تحریم بھی کرے تو وہ شخصی "شخصیت" بن سکتا ہے۔

کردار شخصیت کا بیرانہ اظہار ہے اور یہ مکمل بھی ہو سکتا ہے اور نامکمل بھی یعنی اچھا بھی اور برا بھی۔ اگر کردار مکمل ہے تو شخصیت کو مکمل اور بھرپور کہا جائے گا اور اگر کردار یا نامکمل ہے تو شخصیت نامکمل اور ناقص اور منفی رجحانات کی حامل ہوگی۔ مکمل کردار شخصیت کے مثبت رجحانات کے اظہار کا صراط مستقیم ہے اور اس طرح صراط مستقیم پر گامزن ہونے کے لیے بنیادی طور پر فطرت انسانی کا شعور لازم ہے جب کہ فطرت انسانی اپنی کنہ میں وہی کچھ ہے جو فطرت ازلی یا فطرت خداوندی ہے۔ اقبال تعمیر شخصیت اور رخ کردار کی تشکیل کے باب میں درحقیقت اسی فطرت ازلی کا لقب ہے جو فطرت انسانی کا منبع ہے مگر جس سے انسان نے عملاً یا تو ہمیشہ اغماض کیا یا اسے گم شدہ کیا جسے مثلاً رسل (Russel) کا قول ہے:

"جہاں تک طبعی قوانین کا تعلق ہے سائنس نے ان کو سمجھنے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے لیکن اپنے بارے میں ہم ابھی اتنا بھی نہیں جان سکے جس قدر ستاروں اور الیکٹرون کے متعلق جانتے ہیں۔"

شخص اور شخصیت دو مختلف چیزیں ہیں جن میں بنیادی فرق ظرف کا فرق ہے۔ ایک شخص معاشرے میں اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جس قدر کہ قطرہ دریا میں لیکن یہی شخص جب شخصیت کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو ایک طرح سے پوری معاشری ہیئت پر محیط ہو جاتا ہے۔ شخص شخصیت میں اس وقت ڈھلتا ہے جب اسے زندگی کرنے کے عمل کے دوران اپنی ذات کا اجتماعی شعور سے رشتہ جوڑنے کے راز کا علم ہو جائے چنانچہ شخصیت یا مثالی شخصیت سے مراد کسی ایسے شخص کا وجود ہے جو ہر اعتبار سے انسانیت کے معیار پر پورا اترتا ہو جو اپنے وجود کو انسانیت کے لیے اور انسانیت کی امانت خیال کرتا ہو۔ شخص کے اندر جوہر انسانیت کی موجودگی ہی اسے شخصیت بخشتی ہے۔ شخص محض ایک وجود ہے جس کے اعمال معاشرے کے اقوام پر مثبت یا منفی کسی بھی رنگ میں شدت سے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ جب کہ مثالی یا مثبت شخصیت ذات اور صفات پر دو کا خوبصورت اجتماع ہے۔ محض ایک شخص ہونا میرے اور آپ کے معقول اور معتبر ہونے کا ثبوت نہیں۔ یہ ثبوت تو شخصیت مہیا کرتی ہے۔ یہ کارنامے فقط شخصیت ہی انجام دے سکتی ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے۔ معاشرے میں عام طور پر چلتے پھرتے لوگ شخص کی ذیل میں آتے ہیں۔ شخصیتیں گنی چنی ہوا کرتی ہیں۔ اقبال کی خودی کا اختیار بھی اپنے اندر شخص سے شخصیت بننے کا مفہوم ہی رکھتا ہے۔ اختیار خودی کا موقع بھی شخص کو کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ خودی یا شخصیت ہی وہ رتبہ بلند ہے کہ ملا جس کو مل گیا۔ شخصیت کی تعمیر کے ان تعمیری مراحل میں قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت، بلکہ بلند، سخن دلنواز اور پرسوز جان کی کیفیات شامل ہیں جن کا حصلہ جہاں داری جہاں بینی جہاں بانی اور جہاں آرائی ہیں۔ اب اس کا سوز ہمہ سوز ہے وہ شمیر غاب ہے اور اس کا شباب بے داغ ہے۔ وہ قبیلے کی آنکھ کا تارا ہے۔ جمود و غیور ہے۔ اس کی ضروب کاری ہے اور اس کا جگر چیتے کا ہے اور تجسس شاہین کا سا۔ وہ لہو گرم رکھنے کے لیے پلٹ پلٹ کر جھپٹتا ہے۔

خود شناسی، خدا شناسی کے طفیل مثالی شخصیت فقر و غنا کے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ جو انسانی کردار کی ایک اعلیٰ ترین صفت ہے جس سے اسرار جہانگیری کھلتے ہیں اور مٹی میں بھی اکسیر کی صفت در آتی ہے۔ شمیر کا وجود اسی فقر و غنا کا مرہون ہے۔ مگر کچھ اس طرح کہ فقر و غنا کا معیار بلند ہو جاتا ہے۔ فقر شخصیت کے ہاتھ میں ایک ایسی تلوار ہے جو کردار کے محسوس پیکر میں ڈھل کر حیدر کرار اور خالد بن جاتی ہے۔ یہ بھی تعمیر شخصیت کے مرحلے ہیں اور شخصیت اب تکمیل کی حدود میں داخل ہو رہی ہے۔ اب اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ قرار پاتا ہے وہ غالب کار آفریں اور کارکشا کارساز ہو جاتی ہے۔ اسے خاکی ہونے کے باوجود نوری نہاد اور بندہ مولا صفات کی سند عطا ہوتی ہے۔ خدا کی نیابت کی پوری پوری اہلیت اس میں آ جاتی ہے۔ پھر ہر لحظہ اس کی ایک نئی شان ہے اور وہ واقعتاً گفتار و کردار میں خدا کی برہان بن جاتی ہے۔ اب اس کے اسیر حرص و ہوس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اکل حلال اس کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ مثالی شخصیت اب اپنی پہچان مشرق و مغرب کے حوالے سے نہیں کرتی بلکہ گیرندہ آفاق اور سوار اشہب دوراں بن کر ایک طرح کی روحانی جمہوریت کے ایوان میں داخل ہو جاتی ہے اور انفس کی قرات کرتی

ہیں۔ یوں تعمیر شخصیت کا عمل اقبال کے نزدیک ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کو پہچانتا ہوا نظریے سے واردات کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی تربیت یافتہ شخصیتوں کا پھیلاؤ خود ملت پیغا ہے۔ ''شخصیتوں کی موت، موت نہیں بلکہ ہجرت سوئے دوست ہے اوردم مرگ ان کے لبوں کا تبسم ہی ان کی شخصیت کی مثالیت اور عینیت اور ہمہ گیری کا راز فاش کرتا ہے۔ یقیناً ایسی ہی شخصیات انسان کامل یا مثالی شخصیت کی اہمیت کو ''طیب عثمانی ندوی'' نے مزید اجاگر کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ:

انسان کامل کے تصور سے ہمارے ذہنوں میں ''مسلم'' کی دو تقسیمیں آتی ہیں ایک اس کا وجود انسانی ہے دوسرا اس کا وجود ایمانی! اپنے وجود انسانی میں، اس میں اور دوسرے انسانوں میں اشتراک ہے، عام انسانوں کی طرح پیدا ہوتا ہے اور ویسے ہی پروان چڑھتا ہے اور بڑا ہوتا ہے۔ ہر انسان کی طرح اسے بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی! اسے گرمی کا بھی احساس ہوتا ہے اور سردی کا بھی، بیمار بھی پڑتا ہے اور صحت مند بھی ہوتا ہے، فقر و غنا میں بھی وہ عام انسانوں کی مثل ہے۔ زراعت و تجارت اور دوسرے انسانی شعبوں سے بھی اسے دلچسپی ہے اولاد سے محبت کرتا ہے اور اپنے پہلو میں بھی دل رکھتا ہے، غرض کہ وہ اپنے وجود انسانی میں قانون طبعی کا ویسا ہی تابع ہے، جیسے اس کے مثل اور دوسرے انسان! انقلاب زمانہ اور حوادث روزگار اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برت سکتے، محض اس لئے کہ اس کا کوئی خاص نام ہے اور اس کا تعلق کسی خاص نسل سے ہے یا وہ کوئی خاص قسم کا لباس پہنتا ہے بلکہ اس کا وجود اس وسیع کائنات میں صرف ایک ذرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور عالم کی اس بحر ذخار میں اس کی مثال ایک موج کی ہے۔ اگر ایک مسلم بھی عام انسانوں کی طرح زندگی گزارنے پر اکتفا کرے تو پھر اس کی اس کائنات میں کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی اور اس کی موت پر نہ زمین روئے گی اور نہ آسمان ماتم کناں ہوگا اور اس دنیا کی رنگینیوں میں کچھ بھی کمی واقع نہ ہوگی، لیکن اس کا وجود ایمانی اپنے اندر ایک پیام رکھتا ہو جو انبیاء کا پیام ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کے کچھ مبادی اور اعتقادات ہیں، جن پر وہ ایمان رکھتا ہے اور اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے گزرتی ہے اس حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو وہ حیات انسانی کے اسرار سربستہ کا ایک راز ہے، عالم کی بقا کے لئے اس کا وجود ایک لازمی کی حیثیت رکھتا ہے، انسانی زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے، لہذا وہ مرد مومن اور مسلم مثالی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کائنات میں زندگی گزارے، پھلے، پھولے اور پروان چڑھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کائنات کی بقا کے لئے اس کا وجود اور اس کا پھلنا پھولنا، پروان چڑھنا ضروری ہے، جس طرح اس کائنات کو پانی، ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے اسی طرح اسے ایک مرد مومن کی بھی ضرورت ہے اگر حیات انسانی پانی، ہوا، روشنی اور حرارت و برودت کے وجود پر منحصر ہے تو اسی طرح ایک ایسے مقصد زندگی، روح ایمانی اور اخلاق کا وجود بھی ناگزیر ہے جس کی روشنی انبیاء علیہم السلام کی دعوت و پیام سے حاصل کی گئی ہو اور جس کا بوجھ ایک مرد مومن کا دوش ناتواں اٹھائے ہوئے ہو اور اس کے قیام و بقا کے لئے اپنی زندگی کی ساری قوتوں اور توانائیوں کو لگا رکھا ہو، اس لئے کہ اگر مومن نہ ہو تو یہ پیام زندگی اور مقصد بلند ضائع ہو جائیں گے اور ان کا وجود عالم میں ایک راز سربستہ بن کر رہ جائے گا۔ اس مرد مومن کا وجود بقا اس عالم میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت آفتاب جہانتاب کی ہے۔

یونانی تصورات

فوق البشر کے مختلف تصورات:

آج کے انسانوں کی طرح پچھلے انسانوں کا بھی بنیادی مسئلہ انسان ہی تھا۔ بشر اور فوق البشر کی تلاش انہیں بھی تھی۔ انسان کی لامحدود صلاحیتوں کا انہیں بھی اندازہ تھا، کائنات کو مسخر کرنے کا حوصلہ بھی وہ رکھتے تھے۔ انہیں بھی یہ معلوم تھا کہ ہمارے ہاتھوں کی لمبائی ہمارے تخیل کی پرواز کے برابر ہے۔ ساری دنیا کے مختلف گوشوں کے انسان مختلف عہد میں خواہ کتنے ہی بیدار نہ کیوں نہ رہے ہوں لیکن یونان قدیم دنیا کے مرکزی دماغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالے کی ابتدا بھی یونانی مفکرین ہی سے کی جائے۔

بعض انسان مخصوص صلاحیتوں اور قوتوں کے مالک ہوتے ہیں اور ان خصوصیات کے تمام تر امکانات کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ تاریخ ایسی برگزیدہ ہستیوں کی امین ہے جنھوں نے وقت کی تند و تیز دھارے کو اپنی مرضی کے مطابق بدلنے کی سعی کی ہے۔ یونانی فلسفیوں نے آئندہ کے انسانوں کے خدوخال واضح کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ چونکہ فوق البشر کا تصور ایسی ہی خواب اور حقیقتوں اور بصیرت افروز خوابوں کا شیریں آمیزہ ہے۔ اس لیے ان کے تصورات کا ایک سرسری خاکہ اس ذیل میں بے حد اہم ہے۔

یونانی مفکرین:

انسانوں کو آلام و مصائب اور توہم پرستی سے نجات دلا کر مسرت سے ہم کنار کر دینے والی ہستی کا تصور قدیم ترین یونانیوں کے یہاں بھی موجود ہے۔ انہوں نے زندگی سے بہت سے سوالات کیے ہیں۔ بہت سے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے جدوجہد کی ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلیز کہتا ہے:

''یونانی مفکرین نے فطرت کا محاسبہ شروع کیا، مگر وہ مسائل کا قطعی حل نہ تلاش کر سکے۔ لیکن ایسا کہہ کر جدید انسان بھی خود کو فریب نہیں دے سکتا کہ یونانی مفکرین نے جو سوالات کھڑے کیے ہیں وہ ان کا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

افلاطون اور ارسطو کا نام لیے بغیر تو شاید علم و فن کی گفتگو ہی ادھوری رہ جاتی ہے لیکن ان اساتذہ کے قبل کے اہم فلسفیوں کے خیال سے واقفیت کئی جہت سے مفید ہے۔ اولاً یہ کہ ان کے اسلاف بھی ان کے شانہ بشانہ دوررس طبیعت اور خلاقانہ ذہنیت کے مالک تھے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے بعد کے مفکرین پر گہرے اثرات بھی چھوڑے ہیں۔

جے۔ ڈبلیو۔ این (J.W.Allen) کا خیال ہے کہ:

''افلاطون کے اسلاف میں سب سے پہلا نام ہومر کا لیا جا سکتا ہے جسے ہم مغربی تہذیب کا روحانی باپ کہہ سکتے ہیں۔''

ہومر کا مرد آزاد (Homer Free Man):

ہومر (Homer) کا تصور بشر یہ ہے کہ انسان بنیادی طور پر آزاد پیدا ہوا ہے اور وہ کسی طرح پابند نہیں۔ کبر اس کا پیدائشی حق ہے۔ وہ آزادانہ ساری دنیا میں کیف و مستی کے ساتھ جینے کا مستحق ہے۔ ہومر کے متکبر اور آزاد رو بشر کے یہاں جذبہ عبودیت میں بھی ربودگی اور خود سپردگی نہیں ہے بلکہ خدا کا تصور مساویانہ اور رفیقانہ ہے اس کے مثالی انسان کا خدا انسانوں جیسا ہی ہے۔ اس کے شہنشاہ کا تصور بھی مشرقی تصور نہیں ہے فشر (Fisher) رقمطراز ہے۔

''زندگی کی مسرتوں کا احساس، انسان کی عظمت کا شعور، فرد کی تشہیر کا شدید جذبہ، بلند ہمتی، تجسس، مردانہ جوہر، بے انتہا آرزوئیں، جو کہ یونان کی خصوصیات کہی جاتی ہیں اور بعد میں انہیں خصوصیات پر سارا یورپ نازاں رہا۔ حسن اتفاق سے یہ ساری چیزیں سب سے پہلے ہومر کے یہاں ملتی ہیں۔

قدیم یونانیوں نے سیاسی تاریخ (Political History) کے لیے ہومر سے یہ سیکھا کہ ''کاموں کو سلیقے سے انجام دینا ہی عدم تشدد کا راستہ ہے۔'' ہومر کو اس لیے اہمیت دی جانی چاہیے کہ اس نے سب سے پہلے یونانیوں کو انسانی عظمت سے روشناس کرایا۔ ''ایلیڈ'' (Illid) اور اوڈیسی (Odyssey) ایسی قدیم ترین تہذیبی دستاویزیں ہیں جو ہمیں سماجی اور ثقافتی زندگی کا بیدار شعور فراہم کرتی ہیں اور سماجی زندگی کے ان گنت مسائل کا حل تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

سولون کا متوازی آسمان:

چھٹی اور ساتویں صدی (قبل مسیح) میں یونان سیاسی بحران اور انتقام سے دوچار ہوا۔ یونان

(Tyrtaeus)

سولون (Solon) نے اپنی شاعری میں تنظیم نو کا پیغام دیا۔ سولون ایک مقنن کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے بلکہ اسے یونانی جمہوریت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے انصاف، تنظیم اور مساوات پر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ تشدد کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ خود کہتا۔

"میں نے لوگوں کو ایسی قوت عطا کی ہے جس کے وہ اہل ہیں نہ تو ان سے ان کا صحیح احترام چھیننے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی انہیں ایسا حق دیا ہے جو ان کا حق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں امیر و غریب دونوں کے حقوق کا محافظ ہوں اس لیے میں نے ان دو طبقوں میں سے کسی ایک کو بھی ناجائز مداخلت کی اجازت نہیں دی ہے۔"

چھٹی صدی قبل مسیح کے یونان کو ہمیں علمی اعتبار سے بہت اہم مقام دینا پڑتا ہے، کیونکہ اس عہد میں ریاضی، سائنس اور فلسفے کے علوم نے باضابطہ صورت اختیار کرلی۔ اسی عہد میں تاریخ بھی باضابطہ طور پر مرتب ہوتی۔ اس عہد کے متعلق برٹرنڈرسل (Burtrend Russel) رقمطراز ہے:

"اس صدری میں کیا کچھ ظہور پذیر ہوا یہ بہت ہی حیرت انگیز ہے جس کے متعلق دور جدید کا انسان بھی ٹھہر کر سوچتا ہی نہیں بلکہ اس خلا کو پر کرنے سے معذور نظر آتا ہے اور متعلقہ عہد کے حکماء کے متعلق پر اسرار طور پر گفتگو کرتا ہے۔

بارکر (Barker) نے اس بارے میں اپنا خیال مندرجہ ذیل لفظوں میں ظاہر کیا ہے۔

"جہاں کہیں ان لوگوں نے مظاہر فطرت میں نمود یکھا اسے پرکھنے اور اصولوں میں سمونے کی کوششیں کیں اس لیے اس عہد سے اب تک کی موسیقی اور سیاست کی کڑیاں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

فیثا غورث کا تصور انسان:

اس عہد کے مفکرین کی طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن انسان اور انسانیت کے متعلق جس فلسفی نے بہت کچھ لکھا اس میں فیثا غورث کا نام سر فہرست ہے۔ برٹرنڈرسل فیثا غورث کے متعلق مندرجہ ذیل لفظوں میں رطب اللسان ہیں:

"ساموس کے رہنے والے فیثا غورث نے غایت کمال کے ساتھ ذہنی اور روحانی آویزشوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی فکر" Philosophy" جیسا لفظ تراشا اور اس کی تشریح شاہراہ حیات کے معنوں میں کی اور علم کو روح کی پیداوار سے تعبیر کیا۔ کروٹون میں اس نے اپنے شاگردوں کا ایک ایسا حلقہ بنایا جنہوں نے معاشرے کو خاطر خواہ متاثر کیا۔ لوگوں کے اچھے نظریات کو تقویت پہنچائی لیکن اتفاق سے قدیم نظریات کے انہدام نے پانسہ پلٹ دیا۔ آخر کار وہاں کے شہری ان کے دشمن ہو گئے اور یہ اپنے منصوبوں میں ناکام ہو گئے۔ نتیجتاً یہ دوبارہ جنم لینے کے عقیدے کے قائل ہو گئے۔ ان کا روح کی ابدیت پر ایمان تھا۔ انہوں نے عوام کو یہ تعلیم دی کہ ہم لوگ اس کائنات کے لیے اجنبی ہیں اور یہ کہ ہمارا جسم ہماری روح کا مدفن ہے۔ لہذا ہم لوگوں کو خودکشی کے ذریعہ راہ فرار نہیں تلاش کرنی چاہیے۔ ہم سب خدا کے چہیتے ہیں، اس لیے مشیت ایزدی کے خلاف فرار کی تلاش کا ہمیں کوئی حق نہیں نہ انہوں نے مزید یہ تعلیم دی کہ تین طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ 1۔ عقل کے عاشق 2۔ عزت کے دلدادہ اور وہ دولت کے پرستار۔ پاکیزگی عقل میں ہی مضمر ہے۔ ان کا نظریہ عقلی سے زیادہ وجدانی تھا، سریت سے زیادہ متعلق سے قریب تھا۔ فیثا غورث بجائے خود بہت بڑا ریاضی داں تھا۔ اس لیے اس نے ہر چیز کا تعین اعداد سے ہی کرنا چاہا۔ جو مذہبی قسم کے شعور اور اخلاقی جذبات ہمیں افلاطون، سینٹ آگسٹائن تامس اکونیاس، ڈیکارٹس، اسپینوزا اور لیبنیز کے یہاں ملتے ہیں، ان تمام پیغامات میں فیثا غورث کی تعلیمات کے اثرات موجود ہیں جو اب تک زمانے کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔

دراصل فیثا غورث نے انسانوں کی تقسیم جن تین خانوں میں کی ہے اس سے دو نتیجے اخذ ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ تینوں خواص ہر فرد و بشر کے اندر موجود ہیں۔ دوسرے یہ کہ بہتر انسان وہی ہے جو ان آرزوؤں کو بے عنائی کا شکار نہ ہونے دے اور توازن برقرار رکھے۔ توازن اور تناسب کا یہی احساس ہمیں افلاطون اور ارسطو کے یہاں شدید تر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

سقراط کا حکیم خود آگاہ:

اب ہم اس فلسفی کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جس نے اپنی قوم اور ملک کو سوفسطائیوں کے پھیلائے ہوئے غلط خیالات سے پیدا شدہ انتشار سے بچانے کی کوشش کی اور جس نے عرفان نفس کے ساتھ ساتھ حیات کے لیے علم و ادراک کو بہت ضروری خیال کیا۔ یہ ہے سقراط:

سقراط معاشرے کا ایک سچا خادم اور مصلح ہے۔ وہ بجائے خود ایک اعلیٰ درجے کا انسان ہے اور اس کا موضوع سخن بھی انسان ہی ہے۔ سقراط کے متعلق پروفیسر آرپانڈے رقمطراز ہیں:

"یونانی فلسفیوں کے مورث اعلیٰ حضرات کے درمیان سقراط کی شخصیت بڑی ہی نادر اور پرتاثر ہے۔ سقراط اپنے عہد کا منصف ترین اور عاقل ترین انسان تسلیم کیا جاتا ہے۔ سقراط نے اپنے عہد کی زندگی کو تین طرح سے متاثر کیا۔ اولاً اپنے سلوک سے، دوم اپنے اقوال سے اور سوم اپنی موت سے۔"

"اعتذاریہ" (اپولوجی) میں وہ اپنے مقاصد یوں بیان کرتا ہے کہ

"مجھے دوسرا کوئی شغل اس سے زیادہ محبوب نہیں کہ میں تم سب لوگوں کا پیچھا کروں۔ تم تمام جوانوں اور بوڑھوں کو اس کی تلقین کروں کہ اپنے جسم اور اپنی دولت پر بہت توجہ نہ دو بلکہ روح کی بالیدگی پر زیادہ دھیان دو اور مجھے یہ کہنے دو کہ اچھائی دولت سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ دولت بھی نیکی کی رہین منت ہے۔"

سقراط کی سب سے اہم تعلیم یہ تھی کہ:

"آگہی ہی نیکی ہے" اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ صحیح علم ہی سے حیات کا صحت مند احساس بیدار ہوتا ہے اور اس طرح سے فرد کو تمام نوع انسانی کی بہبود کا سراغ ملتا ہے۔ علم و آگہی نام ہے روح کی گہرائیوں میں صداقت کے اتر جانے کا۔ ایسی صداقت جو حیات کا جز ولاینفک بن جائے۔ جب انسان کچھ جانتا ہے تو اس کی زندگی پر اس کی معلومات کا تصرف ہوتا ہے اور اس طرح وہ احسن طریقے سے کوئی کام انجام دیتا ہے زندگی اور روح کی غایت بالیدگی ہی مسرت کا سبب بن سکتی ہے۔ جو محض عقلمندوں کا مقدر ہے یعنی یہ کہ آگہی محض نیکی ہی نہیں بلکہ مسرت بھی ہے۔"

سقراط کی گفتگو نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اس کے خیالات میں جدت اور ندرت ہے۔ حیات کے مختلف گوشوں پر وہ گہری نظر رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک عظیم انسان وہی ہو سکتا ہے جسے اپنے وجود کا صحت مند شعور ہو، جس کا علم سچا ہو، جس نے اپنی ذات کا عرفان حاصل کیا ہو۔ جس کی قوت خیر و شر کی تمیز کے بلند درجے تک پہنچ چکی ہو، جو عدل و انصاف پر چلنے کا عادی ہو۔ جو خود عاقل و عادل ہو اور عاقل و عادل حکمران کی اطاعت کر سکتا ہو کیونکہ اس کی نظر میں دونوں ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔

سقراط کو زہر ہلاہل محض اس لیے پینا پڑا تھا کہ وہ یونانیوں کے خود ساختہ خداؤں کا منکر تھا۔ اسے جیل سے فرار ہونے کے مواقع بھی حکومت نے فراہم کیے، اسے ملک چھوڑ کر بھاگ جانے کے بھی اشارے کیے گئے کیونکہ وہ ملک و قوم کا چہیتا فلسفی تھا۔ اگر یونانیوں کو اس سے نفرت تھی تو محض اس بات سے تھی کہ وہ ان کے خداؤں کی توہین کرتا تھا۔ اسے اپنی صدائے درون (Inncer Voice) پر جتنا اعتماد تھا اتنا خوف شہنشاہ کا بھی نہ تھا کیونکہ وہ آزادی، خودداری اور نیک چلنی کا معلم تھا۔ راستبازی، جان عزیز سے بھی عزیز تر تھی اور ایک اعلیٰ انسان کا اس کا شخصی تصور بھی وہی تھا۔ سینٹ پال سقراط کے بارے میں لکھتا ہے:

"جن باتوں کا تعلق قیصر سے تھا اسے رہنا دیا اور جو چیزیں خدا کی قدرت میں شامل تھیں، ان کے اسے پرواہ نہ تھی وہ موت سے خوف نہیں کھاتا تھا کیونکہ وہ سچی حیات کا عاشق تھا۔ وہ پرستار صداقت تھا اور اس نے ایسی حیات پر موت کو ترجیح دی جس حیات کو صداقت پر عمل پیرا ہونے کا حق حاصل نہ تھا اور جسے "صدائے دروں" کے خلاف جینا تھا۔"

ناک اور عبرت ناک ہیں۔ جب اسے اپنے ملک کی عدالت میں صفائی کا بیان دینے کے لیے پیش کیا گیا تو اس نے جو بیانات دیئے ان سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ وہ کیسے انسان کا آرزومند تھا۔ 'اپولوجی' سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں ؂

''خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ایک فلسفی کے اغراض و مقاصد کو اپنی ذات میں تلاش کروں۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے انسانوں کی حیات سے بھی مقصد حیات حاصل کروں۔ ایک حکیم کے اس المیہ ہے کو اس المناک موڑ پر بجز بنا دینا میرے لیے شرمناک فعل ہے۔ موت سے خوف کھانا عقلمندی نہیں ہے جبکہ ہم سبھوں کو معلوم ہے کہ موت خدا سے بدتر نہیں ہے۔''

اگر سقراط کو سزائے موت سے اس شرط پر بری کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے اصول اور نظریہ حیات کو بھول جائے تو اس کا جواب سقراط نے یوں دیا:

''ایتھینز کے لوگو! مجھے آپ سے محبت ہے اور میں آپ لوگوں کا احترام کرتا ہوں لیکن میں خدا کا مطیع بندہ ہوں کسی اور کا غلام نہیں اور جب تک میں زندہ ہوں، مجھ میں سکت ہے، میں آپ سبھوں کے حکم سے اپنے فلسفہ حیات کی تبلیغ و اشاعت بند نہیں کرسکتا۔ میں اس کے لیے سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہی خدا کا حکم ہے اور یہ میرا عقیدہ ہے کہ اسی حالت میں خدا کے سامنے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا نیک کار نہیں ہوسکتا۔''

سقراط کے خیال میں ایک بھلے مانس کو نیکی سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی عقلمند انسان کو دانش مندی سے کوئی دوسرا انسان روک سکتا ہے اور نہ ان امور میں موت ہی مداخلت کرسکتی ہے۔ شریف اور عقلمند لوگ اپنی مرضی سے زندگی گزارتے ہیں اور یہی سچی زندگی ہے اور وہ لوگ جو دوسروں کے ساتھ ناانصافی کرکے اسے نقصان پہنچاتے ہیں، وہ دراصل اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچا کر اپنی نادانی پہ مسرور ہوتے ہیں۔ اپولوجی میں وہ دوسری جگہ لکھتا ہے:

''مجھے اس سے زیادہ کچھ کہنا ہے جس پر شاید تم رونا دھونا شروع کردو لیکن مجھے یقین ہے کہ مجھ سے کچھ سننا تمہارے لیے مفید ثابت ہوگا۔ اس لیے میں تم سے معذرت کرتا ہوں کہ چلاؤ نہیں۔ جہاں تک میں تمہیں جانتا ہوں کہ تم مجھ جیسے ایک انسان کو قتل کردو گے لیکن ایسا کرکے تم اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ زخمی کرلو گے۔ مجھے کوئی قوت مجروح نہیں کرسکتی، نہ ملیٹس اور نہ انائٹس نہ یہ قوتیں ایسا ہرگز نہیں کرسکتیں، ایک برے آدمی کا یہی وطیرہ ہے کہ وہ کسی اچھے آدمی کو زخمی کرکے خود کو نسبتاً زیادہ زخمی کرلیتا ہے۔

اور اب اے لوگو! تم میں سے جن لوگوں نے میری ہتک کی ہے، ان کے لیے میری پیشن گوئی ہے کہ میں مرنے ہی والا ہوں اور موت کا وقت جب قریب ہوتا ہے تو انسانوں کو پیغمبرانہ قوتیں عطا کردی جاتی ہیں اور تمہارے سامنے پیشن گوئی کیے جاتا ہوں کہ میرے قتل کے بعد میرے قاتلوں کے لیے ایک عذاب عظیم منڈلا رہا ہے۔ اگر تم یہ سوچتے ہو کہ ایک آدمی کو مار کر تم کچھ لوگوں کا منہ بند کردو گے تاکہ وہ تمہاری گناہ آلود زندگی کا محاسبہ نہ کرسکیں تو تم غلط سوچتے ہو۔ یہ نہ تو فرار کا ممکن راستہ ہے اور نہ قابل احترام طریقہ حیات، آسان ترین اور اصلی ترین راستہ تو یہ ہے کہ دوسروں کو نااہل نہ بناؤ بلکہ خود اہل بننے کی کوشش کرو۔''

''اپولوجی'' سے ماخوذ چند اقتباسات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سقراط بجائے خود ایک فوق بشر ہستی کی طرح ابھرتا ہوا نظر آتا ہے اس کے اندر فکر و عمل کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس کے قول و فعل میں ذرہ برابر بھی تضاد نہیں۔ اس کی زندگی اصولوں کی پابند ہے۔ اس کے جینے کا انداز پیغمبرانہ ہے۔ موت کے منہ میں بھی وہ حق گوئی سے باز نہیں آتا۔ حتیٰ کہ مسکراتے ہوئے زہر کا پیالہ پی جاتا ہے یہی سقراط کی تعلیم ہے اور اس تعلیم پر اسے اتنا پختہ ایمان ہے کہ موت بھی اس کے عقیدے کا دامن تھامنے میں تھرتھراتی ہوئی نظر آتی ہے اس کے قول و فعل سے ایک ایسا پیکر ابھرتا ہے جس کے اندر بہ یک وقت اخلاقی، روحانی اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ عملی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے، جو حق کے لیے جیتا ہے اور حق پر جان دیتا ہے، اس کے خیال میں ناحق بجائے خود موت کے مترادف ہے۔ یہ تاریخ کا ایک ایسا ہیرو ہے، ایسا شہید ہے جو آزادی، صداقت، طلب علم، نیکی، مساوات، انسانیت، زندہ ضمیری اور معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنے کا آرزومند ہونے کے گناہ میں شہید کردیا گیا لیکن اس کی شہادت نے فوراً ہی افلاطون (Plato) کو جنم دیا۔ جس نے مزید اس امر کا اعادہ کیا کہ علم و آگہی ہی سے انسان انسان بنتا ہے، ضمیر کی آواز سماجی روایات پر مقدم ہے۔ صداقت کی تڑپ اور زندہ ضمیر ہونے کے معنی اعلیٰ ترین کردار پیدا کرنے کے ہیں اور جو کوئی اعلیٰ ترین کردار کا حامل ہو وہی مثالی انسان ہوگا۔ افلاطون اور سقراط میں ''من تو شدم تو من شدی'' والا معاملہ ہے۔ سقراط کی تعلیمات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ وہ دیوتاؤں کو تمثیلی حقائق سمجھتا ہے اور ان کا قائل ہے تو اسی طرح قائل ہے جس طرح بعض حکما فرشتوں یا انسان سے بلندتر ہستیوں کے قائل ہوتے ہیں۔ ہومر کے ہاں ہر قسم کے دیوتا ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض چور ہیں، بعض حاسد، بعض زانی، بعض ڈاکو سقراط اپنی قوم کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ دیوتا بد اخلاق نہیں ہوسکتے ان جھوٹے دیوتاؤں کو تعلیم میں سے خارج کردینا چاہیے اور فقط اچھے، خوش اخلاق دیوتاؤں کو رکھ لینا چاہیے۔ اور وہ بھی بچوں کی تعلیم کے لیے بطور دروغ مصلحت آمیز کے۔ وہ حقیقت میں فقط ایک خدائے واحد کا قائل تھا جو سراپا عقل اور سراپا عدل ہے۔ اس کے نزدیک خدا خیر مطلق تھا اور نفس کے اندر اسی خیر مطلق کے عرفان کا نام نیکی ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ روح اس جسم میں داخل ہونے اور مادے سے ملوث ہونے سے پہلے بھی موجود تھی اور اس جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہے گی۔ وہ کہتا تھا کہ اعلیٰ درجے کی زندگی مرنے سے قبل موت کی ایک کوشش ہے۔ جذبات اور مادی خواہشات سے بچ کر عقل خالص اور خیر محض کی طرف جانا جسمانی موت اور روحانی حیات ہے۔ دانا انسان اس قسم کی کوشش جسمانی زندگی کے اندر رہتے ہوئے ہی شروع کردیتا ہے۔ اس کے بعد جسم کی مطلق تحلیل سے ڈرنے کی بجائے اس سے خوش ہوتا ہے اور اس سے گریز نہیں کرتا۔ مرد عاقل کی نشانی یہ ہے کہ جسمانی موت کا قطعاً کوئی خوف اس کے دل میں نہ ہو۔ سقراط نے اپنی شہادت کے وقت اس کا ثبوت دیا کہ اس کے قول اور فعل میں کس قدر کلی مطابقت ہے۔''

ہم یہاں سقراط کی تعلیمات کے بعض اہم نکات بغیر کسی منطقی ترتیب کے پیش کرتے ہیں:

1۔ تمام انسانوں کا علم محدود ہے۔ غیر انسانی مخلوقات کا علم محال بھی ہے اور غیر ضروری بھی انسان کو نیکی کا علم ہوسکتا ہے لیکن وہ بھی کامل طور پر نہیں۔

2۔ دوسرے لوگ بھی جاہل ہیں اور میں بھی جاہل ہوں لیکن وہ اپنی جہالت سے ناواقف ہیں اور اس جہالت کو علم سمجھتے ہیں مجھ کو ان پر فوقیت یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

3۔ اپنے نفس کو پہچانو۔ تمام حقائق کا دروازہ اسی عرفان نفس سے کھلتا ہے۔

4۔ اخلاقیات ہی اصل علم ہے۔ باقی تمام علوم اس کے مقابلے میں ظنی اور اضافی ہیں۔

5۔ انسان معیار کائنات ہے لیکن اس سے مراد کسی فرد کے ہنگامی جذبات اور محسوسات نہیں۔ خیر مطلق کا معیار انسان کی فطرت کے اندر مضمر ہے۔

6۔ جاننا دو سمتوں کا ہے۔ ایک رائے اور دوسرا علم۔ عام آدمی فقط رائے رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ علم صرف حکیم کو حاصل ہوتا ہے۔

7۔ علم کے اصلی اصول انسان کی فطرت کے اندر مضمر ہیں۔ تعلیم کا مقصد خارج سے کسی کے اندر معلومات کا داخل کرنا نہیں بلکہ اس کے اندر سے فطری اصول کا بے نقاب کرنا ہے۔ تمام اصلی علم روح انسانی کا ازلی سرمایہ ہے۔ فطرت انسانی علم سے حاملہ ہے۔ معلم کو دایہ کا کام کرنا چاہیے۔

8۔ نیکی میں ایک وحدت پائی جاتی ہے۔ اگر کسی ایک پہلو میں انسان پوری طرح نیک ہو جائے تو باقی نیکیاں بھی اس کے ساتھ آجائیں گی۔ کوئی شخص ایک پہلو میں بد ہو کر دوسرے پہلو میں نیک نہیں ہوسکتا۔

9۔صحیح علم اور نیکی کے لیے لازمی ہے کہ وہ عمل میں سرزد ہو۔

10۔انسان کی فطرت کا کوئی پہلو فنا کر دینے کے قابل نہیں ہے۔

11۔فرد کی زندگی میں سعادت اور ہم آہنگی عدل ہی سے قائم ہو سکتی ہے اور جماعت کی زندگی میں بھی عدل ہی سے۔فرد اور جماعت کا عدل ایک دوسرے کے آئینہ ہیں:

12۔انسان سے اعلیٰ تر فوق الفطرت ہستیوں کا وجود ہے لیکن اصل الوہیت ایک خدائے واحد کو حاصل ہے جو خیر مطلق اور علم مطلق ہے اور رب العالمین ہے۔

13۔انسان ہمیشہ اپنی عقل کی رہبری میں نہیں چلتا بلکہ اعلیٰ قوتیں بھی اس کو ہدایت کرتی اور غلط راستوں پر چلنے سے روکتی ہیں۔سقراط خود اپنے اندر سے وقتاً فوقتاً ایسی آواز سنتا تھا۔

14۔بدی کرنے سے کبھی حقیقی مسرت اور سعادت حاصل نہیں ہو سکتی نیکی خود ہی اپنا اجر ہے اور بدی خود ہی اپنی سزا،لیکن خدا نے ان کے ساتھ دوسری جزائیں اور سزائیں بھی وابستہ کر رکھی ہیں جن کا پورا انکشاف کسی دوسری زندگی میں ہوگا۔

15۔ظلم کرنا،ظلم سہنے سے بدرجہا بدتر ہے۔ظلم سہنے سے فقط جسم کو اذیت پہنچتی ہے جو غیر اصلی اور عارضی ہے۔ظلم کرنے سے انسان کی اصلیت یعنی اس کی روح کو صدمہ پہنچتا ہے اور اس میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

16۔جب تک داناؤں اور عادلوں کی حکومت نہ ہو کوئی شریف آدمی پبلک لائف میں حصہ نہیں لے سکتا۔اگر دانائی اور سچائی سے کام لے گا تو اس کو بہت نقصان پہنچے گا۔اس کو کسی قسم کی قوت حاصل کرتے ہیں اور جمہوری حکومتوں میں بعض ذہین لوگ اس رہنمائی کو خطابت سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔خطیب ایک خوشامدی باورچی کی طرح ہوتا ہے جو مریضوں کے سامنے چٹخارے دار کھانے پیش کرتا ہے اور ان کو تھوڑی دیر تک یہ خوشامدی باورچی سچے طبیب کے مقابلے میں قابل تعریف آدمی معلوم ہوتا ہے کیونکہ سچا طبیب مریضوں کے لیے کڑوی دوائیں اور سادہ غذائیں تجویز کرتا ہے۔

18۔سچ وہی شخص بول سکتا ہے جو دانا ہو اور جس کا نفع وزر حکومت یا عوام کے ہاتھوں میں نہ ہو۔سچا آدمی موت سے نہیں بلکہ بد اعمالی اور تخریب روح سے گھبراتا ہے۔

19۔نیکی کے ساتھ ذوق فقر یعنی سادہ ترین زندگی کی خواہش ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نیکی قائم نہیں رہ سکتی۔بدی کرنے کے بعد سزا پانا بہ نسبت بچ کر نکل جانے کے بدرجہا بہتر ہے۔بدی ایک روحانی بیماری ہے اور سزا اس کی دوا ہے۔بیماری کے ہوتے ہوئے دوا سے بچنے والا احمق ہے۔''

افلاطون کا ''حکیم حکمراں'' Philosopher Ruler:

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے،فیثا غورث کی شخصیت اتنی متنوع اور باغ و بہار تھی اور اس نے ایک مثالی انسان کے خط،خال پیش کرنے میں اتنی دقیقہ سنجی سے کام لیا تھا کہ سقراط نے بڑی آسانی سے اپنی شخصیت کے سود کے ساتھ ''حکیم'' (Philosopher) کی شبیہ کو نکھار کر پیش کیا اور لائق استاد کے لائق ترین شاگرد افلاطون نے حکمران حکیم Philosopher Ruler کا ایسا تصور پیش کیا کہ عصر حاضر تک کے دنیا کے تمام بڑے دانشور اس کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔تمام یونانی حکیموں میں سب سے زیادہ افلاطون نے ہی اس نظریے کی وکالت کی کہ محض حکیم (Philosopher) ہی دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے اور تمام نوع انسانی کو صداقت حسن اور روحانیت کی لذتوں سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

''افلاطون کا سن پیدائش 427 ق م ہے۔اس کا گرو سقراط ایک غریب سنگتراش کا بیٹا تھا۔ لیکن افلاطون بڑا خاندانی شخص تھا۔اس کا اصل نام ارسٹوکلیز (Aristoclase) تھا۔بعد میں لوگ غالباً اس کے فراخ سینے کی وجہ سے اس کو پلاٹون پکارنے لگے۔(اس لفظ کے معنی ہیں فراخ سینے والا) جو ہماری زبان میں آکر فلاطون یا افلاطون ہو گیا۔افلاطون کو مختلف علوم میں بڑے بڑے اساتذہ فن کی شاگردی کا موقع ملا۔تقریباً چالیس سال کی عمر میں وہ اطالیہ میں فیثا غورثیوں سے ملا۔407ء ق م سے 399 ق دم تک اس نے سقراط کی شاگردی کی۔افلاطون کو سب سے زیادہ فائدہ سقراط کی تعلیم سے پہنچا۔سقراط نے اس کے سامنے اعلیٰ درجے کے علمی اور اخلاقی نصب العین پیش کیے اور اس کی ذہنی قوتوں میں ربط اور نظم پیدا کیا۔افلاطون پہلے کچھ شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا،لیکن سقراط کی شاگردی کے بعد اس نے اس شغل کو ترک کر دیا۔''

دوسرے قدما کے مقابلے میں افلاطون اس معاملے میں بھی زیادہ خوش نصیب ہے کہ اس کی اکثر تصانیف موجود ہیں ایسی تصانیف جنہیں صحیح طور پر اس سے منسوب کیا جا سکتا ہے،چھتیس کے قریب ہیں۔ان میں سے بہت سے مکالمات ایسے بھی ہیں جن میں سقراط کی تعلیم کو اس کی زبانی کہلوایا گیا ہے اور جن کے متعلق یہ شکوک دامن گیر ہو جاتے ہیں کہ یہ تعلیم سقراط کی ہے یا افلاطون کی۔بہر حال افلاطون (Plato) پر اس امر پر مصر نظر آتا ہے کہ جب تک حکمراں حکیم نہ ہو تب تک نوع انسانی قعر مذلت سے نہیں نکل سکتی،اس کے لیے اس نے عملی کوششیں بھی کیں لیکن اپنی زندگی میں ناکام رہا۔اس سے قبل کے ہم افلاطون کے فلسفے سے بحث کریں یہ جان لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کے نزدیک حکمت (Philosophy) اور حکیم (Philosopher) جیسے لفظوں کا استعمال خاص معنوں میں ہوتا تھا۔بقول پروفیسر برنٹ یونانیوں کے یہاں ''زندگی میں صداقت کے حلول کے مراحل کا نام فلسفہ ہے۔یہ وہ علم ہے جو ہمارے اخلاق کا سنگ بنیاد بن جاتا ہے،فلسفہ محض عالمانہ آرزو نہیں ہے،بلکہ بنیادی طور پر صداقت کے عرفان سے ہی فلسفہ بھی عبارت ہے اور فلسفی بھی بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ یونانیوں کا فلسفہ کا تصور کسی حد تک اسلامی عقائد سے ہم آہنگ ہے۔

افلاطون کسی حکیم کی زندگی کے ابتدائی مراحل ہی میں اس کے ہاتھوں میں عنان حکومت نہیں دینا چاہتا بلکہ اس کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ کب اور کس حالت میں وہ انسانیت کی رہبری کا اہل ہو سکتا ہے۔

''لہٰذا افلاطون کا حکیم حکمراں بیک وقت صاحب عرفان،باریک بیں اور سیاسی بصیرت رکھنے والا ایک ایسا انسان ہے جو وسیع النظری اور کم آمیزی کے ساتھ صداقت اور نیکی پر عمل پیرا ہوتا ہے اور اسے اپنی خدمات کے انجام دینے میں اعلیٰ درجے کی مسرت کا احساس ہوتا ہے،ایسی مسرت کا جو قربانی اور ریاضت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔اس کی تشخیص کا تعلق دماغ سے کم اور روح سے زیادہ ہوتا ہے۔واقعتاً اس کے شعور کا ارتقاء درجہ کمال تک پہنچ جاتا ہے لیکن اس کی یہ ذہنی ترقی محض روحانی چھلاوے کا ایک سنگ میل ہوتی ہے،منزل نہیں،سماجی رسوم و رواج کو افلاطون انسانی تجربے کی حیثیت سے اہم قرار نہیں دیتا بلکہ وہ حکیم حکمراں کی عملی تربیت پر بہت زیادہ زور دیتا ہے۔اس کے خیال میں حکمراں کے فرائض کی انجام دہی کے لیے متعلقہ حکیم کو آزمائشوں اور زندگی کے امتحانوں کے مراحل سے گزرنا ہوگا اور حکیم کو حکمراں کی حیثیت سے تقرر کے قبل ہی عملاً اپنی قدر و قیمت اور صلاحیت کو ثابت کرنا ہوگا اور جب حکیم حکمراں جدلیاتی تربیت کے مراحل سے 35 سال کی عمر میں فارغ ہوگا اس کے بعد اسے مزید پندرہ سال اپنے کردار کی تکمیل کے سلسلے میں صرف کرنے ہوں گے اور صرف وہی حکیم حکمراں کی حیثیت سے قابل قبول ہوں گے جو تربیت کے ان مراحل کو بحسن و خوبی طے کر لیں گے۔ اس کے بعد انہیں سرکار کے کسی کم اہم رتبے پر رکھ کر ان کی صلاحیتوں کی عملی پرکھ ہوگی اور جب وہ ایک لائق حکمراں کا ثبوت دیں گے،تو ان کے ہاتھوں میں عنان حکومت دی جائے گی۔''

حکیم حکمراں کے دائرہ کار اور تربیتی مراحل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ افلاطون کا حکیم جدید جمہوری قائد کے مقابلے میں ریاستی آئین پر بہت زیادہ انحصار نہیں کرتا بلکہ وہ شہریوں کے تئیں زیادہ ذمہ دار نظر آتا ہے۔اس طرح افلاطون اپنے حکیم حکمراں کے لیے فیصلے کی آزادی کے گوشے نکالتا ہے۔عوام کافی حد تک حقیقت پسند نہیں ہوتے،لہٰذا ان کی آراء کو مدنظر رکھتے ہوئے حکیم شخصی فیصلہ ...

افلاطون کا حکیم ایک ایسی ہستی ہے جسے حقیقت کا عرفان حاصل ہے۔ جس کی حیات میں ایک باضابطہ روحانی انقلاب رونما ہو چکا ہے اور وہ اپنے قلب و دماغ میں پوشیدہ اُجالے کو ساری نوع انسانی میں تقسیم کر دینا چاہتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ دنیا ایک تاریک گھاٹی ہے اور اس کے قلب میں ایسی شمعیں روشن ہیں جو اس گھاٹی کو بقعہ نور بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس لیے وہ اپنا سب کچھ انسانیت کے نام پر قربان کر دینے کو آمادہ ہے۔ بظاہر افلاطون کا حکیم بھی دنیا کو تاریکیوں کا مسکن تصور کرتا ہے لیکن اس کا یہ خیال حتمی فیصلے کی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اسے اس بات کا پورا احساس ہے کہ خالق کائنات نے دراصل کائنات کو کچھ اس انداز سے نہیں بنایا ہے بلکہ ہمارے رہنماؤں کی کم بینی اور بے بصری کے سبب ہم اندھیروں کے باسی بن گئے ہیں اور صدیوں سے تاریکیوں میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لیے دنیا تاریک ہی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ یہ کائنات اور حیات تو حد درجہ سرور افزا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اسے اپنے سے سنوار لے اور خلیفۃ الکائنات ہونے کا ثبوت دے۔ افلاطون کے حکیم کی ساری زندگی علم و عرفان کی روشنی میں غرق نظر آتی ہے۔ اس کے وجود سے روشنی پھوٹتی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا کہ وہ مجسم نور کا ایک مینارہ ہے۔ تاریکی اس سے دور بھاگتی ہے۔ تاریکی کو روشنی میں تبدیل کر دینے کا اس میں لامتناہی جذبہ ہے۔ اس لیے وہ حد درجہ ربانی ہے۔ شکست و فتح کے جذبات سے بے نیاز وہ عین حیات کی تلاش میں سرگرداں ہے اور ہر لمحہ حیات کے رخ روشن پر صدیوں سے جمی ہوئی گرد کو کھرچتا ہوا نظر آتا ہے:

''میں چاہتا ہوں کہ تمہارے سامنے عرفان اور جہالت کی تصویریں رکھ دوں۔ ہماری انسانی زندگی کچھ ایسی ہے۔ کسی تہہ خانے کا تصور کرو، ایک ایسے غار کی طرح جس میں دن کی روشنی کی کرنیں تو جاتی ہیں لیکن روشنی نہیں کر پاتیں۔ اس تہہ خانے میں انسان قیدیوں کی طرح اپنے بچپن ہی سے محبوس ہے۔ اس کے پاؤں اور اس کی گردنیں اس قدر تیزی سے متحرک ہیں کہ وہ محض اپنے سامنے تھوڑی دور تک دیکھ سکتا ہے لیکن وہ اپنی گردن موڑ کر پیچھے کی جانب نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن وہ اپنی گردن موڑ کر پیچھے کی جانب نہیں دیکھ سکتا۔ ان کے پیچھے اور ان کے اوپر آگ جل رہی ہے۔ ان قیدیوں اور آگ کے بین بین راہیں ہیں۔ لیکن جس طرح تھیٹر کے اسٹیج پر ناظرین اور کرداروں کے بیچ میں پردہ حائل ہوتا ہے۔ ویسے ہی محبوس قیدیوں اور راہوں کے بیچ دیواریں حائل ہیں۔ یہ قیدی زندگی سے دور ہیں۔ تم ہی مجھ سے کہو کہ کیا یہ محبوس لوگ اپنا یا اپنے دوستوں یا اس جلتی ہوئی آگ سے اٹھتے ہوئے شعلوں کا نظارہ کر سکیں گے۔ دھندلی روشنی انہیں دیواروں کے اوپر مخالف سمت میں نظر آئے گی۔ تب تم ہی سوچو کہ اگر انہیں اس پر فریب تہہ خانے سے نکال دیا جائے تو فطری طور پر ردعمل کیا ہوگا۔ فرض کرو کہ اس میں سے ایک آدمی کو آزاد کر دیا جاتا ہے اور اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ تم آگ کے پاس جاؤ اور آزادی کے ساتھ ہر چہار سمت گردنیں موڑ کر اپنے اردگرد کا جائزہ لو۔ یہ عمل اس متعلقہ شخص کے لیے حد درجہ تکلیف دہ اس لیے ہوگا کہ اس کی نگاہیں چکا چوند روشنی میں چندھیا جائیں گی۔ کیا تم ایسا نہیں سوچتے کہ اس طرح وہ خسارے میں رہے گا اور یہ سوچے گا کہ اشیاء کی وہ شکلیں ہی زیادہ حقیقی تھیں جو اس نے دھندلکے میں دیکھی تھیں اور اگر اسے براہ راست آگ میں دیکھنے کو کہا جائے تو اس کی آنکھوں پر خراب اثر پڑے گا۔ اور وہ پھر سے اپنے مجلس میں واپس لوٹنے کا آرزومند ہو جائے گا۔ کیونکہ دھندلکے کی دنیا میں دیکھنے کی اسے عادت ہو چکی ہے اور اپنے ان تجربات کو وہ براہ راست کھلی ہوئی نگاہوں سے کیے گئے نظارے کے مقابلے میں زیادہ واقعی قرار دے گا۔''

افلاطون کا خیال ہے کہ محض وہی لوگ دوسروں کو روشنی دکھا سکتے ہیں جو بجائے خود روشن ضمیر ہیں۔ جنہوں نے صداقت اور مسرت کا شخصی مساہدہ اور تجربہ حاصل کیا ہے، وہی دوسروں کو حیات کے مقاصد سے روشناس کرا سکتے ہیں، کیونکہ جمہور کے دل و دماغ تاریک گلیاروں کے مانند ہوتے ہیں اور مفکر پستی و بلندی کے اسرار و رموز کا عارف ہوتا ہے۔ اس کی روح نیک جذبات سے لبریز ہوتی ہے۔

حکیم حکمران کی سلطنت کا تصور محض فلسفیانہ ہی نہیں بلکہ اس کے عملی پہلو بھی نمایاں ہیں۔ اپنی عملی زندگی میں ہم آئے دن اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کا مستقبل روشن ہونے کی بجائے تاریک ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری سائنسی ترقیاں بے مقصد ہیں، ہماری ظاہری ترقی بے راہ اور بے جہت ہے۔ حیات ایک سوالیہ نشان سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ سماجی اور اجتماعی بہبود کے منصوبے بنائے جاتے ہیں لیکن ان پر عمل کے نتیجے کے طور پر ہمیں کس عظیم الشان مستقبل کا سراغ نہیں ملتا۔ ایسا محض اس لیے ہوتا ہے کہ انسانیت کی نشوونما کے لیے جو دستور اور ضابطے بنائے جاتے ہیں، ان ضابطوں کے بنانے والے ہمارے معاشرے کے چیدہ اور ذہین ترین اشخاص نہیں ہوتے بلکہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی نگاہیں روشنی میں خیرہ ہو جاتی ہیں اور وہ نادانی کے سبب توہمات رسم و رواج اور صداقت آمیز جھوٹ کو عین صداقت تصور کر لیتے ہیں۔ افلاطون اسی لیے کائنات کے مقدر کو ایک تربیت یافتہ اور ہدایت یافتہ فرد کی ذات میں مرکوز کر دیتا ہے۔ اس طرح ایک فرد کا مقدر حکومتوں اور قوموں کا مقدر بن جاتا ہے۔ ایک فرد کی زندگی سارے سماج کی زندگی کے مترادف ہو جاتی ہے۔ انبیاء اور صلحا کی بات تو درکنار، مارٹن لوتھر اور مہاتما گاندھی جیسے لوگ بھی آج قوموں کے عروج و زوال کا سبب بن سکتے ہیں۔

افلاطون کا حکیم خیر برترین سے بخوبی آگاہ ہے اسے افراد اور اقوام کی منزل کا پتہ ہے۔ وہ انسانوں کی رہبری اس انداز پر کرتا ہے کہ ان کے جینے کا مقصد پورا ہو جائے۔ حکومت کی کشتی کھینا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ جمہور کو منزل کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ان میں کا بہترین شخص ہی اس فرض کو بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ افلاطون کے حکمران حکیم کے تربیتی مراحل کو مدنظر رکھتے ہوئے دو طرح کے حکیم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ ایک وہ فلسفی جو ریاست کے لیے صحت مند منصوبے تیار کرتا ہے اور دوسرا وہ جوان منصوبوں کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے۔ جمہور دوسری قسم کے فلسفی کی ہی تقلید کے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ یہ فکر و عمل کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔

ناقدین افلاطون کے اس نظریے پر تنقید کرتے ہوئے یہ سوال پیدا کرتے ہیں کہ ہم دنیا کی ریاستوں پر حکمرانی کے لیے مسلسل ایسے لائق حکمرانوں کی توقع نہیں کر سکتے، اس لیے ایک سیاسی دستور ہی زیادہ موزوں ہے۔ دوسری چیز یہ کہ یہ کلی طور قابل عمل فلسفہ نہیں ہے بلکہ اس پر جزوی حیثیت سے ہی عمل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افلاطون کے سلسلے میں یہ سوالات بہت زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتے۔ کیونکہ افلاطون یہ پابندی عائد نہیں کرنا چاہتا کہ کس صورت میں انسان اپنے آپ پر کیسے حکومت کرے۔ بلکہ اسے تو محض اس امر کی یقین دہانی کرنی ہے کہ اگر حکومت کی نمائندگی ایسے افراد کے ذریعہ نہ ہوئی جو اخلاقی، جسمانی اور روحانی طور پر معاشرے کے بہترین افراد ہوں تو پھر ہمیں اس بات کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہئے کہ ہم تاریکی کے غار میں ڈوبنے ہی والے ہیں۔

''اگر ہمیں افلاطونی فلسفیانہ قیادت کو صحیح معنوں میں سمجھنا ہے تو چار باتوں کو ذہن نشین کرنا ہمارے لیے ضروری ہوگا۔ اول یہ کہ افلاطون اپنے حکمران حکیم کے تصور کے ذریعہ زندگی کے تقاضوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہے اس کے مقصد حقیقی اور مسائل کو منطقی طور پر بیان کرنا اسے مقصود ہے۔ دوسرے یہ کہ سرکار کی نوعیت کے تعین میں اسے اتنی دلچسپی نہیں جتنا کہ اسے حیات و کائنات میں جاذبیت نظر آتی ہے۔ تیسرے یہ کہ فلسفیانہ قیادت کا تعلق فرد کی تکمیل کے لیے اصول مرتب کرنے سے ہے اور یہ کامل انسان ریاست سے زیادہ انسانیت کی بقا کا ضامن ہے۔ چوتھے یہ کہ اس کا یہ عقیدہ وجدان آگہی کے ذریعے اسرار و رموز حیات کی گرہ کشائی کر کے آخری حقیقت سے پردہ ہٹانے کی آرزو پر مبنی ہے۔''

''مختصراً اس باب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ افلاطون کے بارے میں شاید ایسی رائیں اس لیے قائم کی جاتی ہیں کہ ارسطو نے ایک مثالی حکومت چلانے کے لیے ایک فعال دانشور کی ضرورت محسوس کی ہے لیکن ارسطو کا یہ مثالی انسان اور مثالی حکومت کا یہ تصور افلاطون کے تصور کا بدل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ حق تو یہ ہے کہ افلاطون کا تصور ایسا تصور ہے جس کے مطابق ارسطو کے نظریات کی تردید ہوتی ہے۔ اگر آپ

خواستگار رہیں تو پیر کلیز اور چرچل یہاں تک کہ اسٹالن بھی اس کام کو انجام دینے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن اگر آپ کو ایسی ریاست چاہیے جہاں کے معاشرے میں ہم آہنگی ہو، صداقت کی تڑپ موجود ہو، شہریوں سے نیکی اور احسان کی امیدیں وابستہ ہوں، اپنی زندگی میں امن اور مسرت درکار ہو تب آپ کو پیر کلیز اور نہرو نہیں چاہیے بلکہ سقراط اور گاندھی کی ضرورت ہوگی۔

شیلی (Shelley) نے اس باب میں مختصر اً بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ افلاطون کا مقصد اس فلسفے سے محض یہ ہے کہ ریاست کی نمائندگی دولت مند ترین انسانوں کے ہاتھوں میں نہ ہو بلکہ یہ باگ دوڑ ہوشمندوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔'' یہ بات واضح رہے کہ افلاطون کے نزدیک ہوشمندی، چالاکی اور عیاری کے مترادف نہیں ہے بلکہ جسم اور روح کے تقاضوں میں توازن پیدا کر کے رموز معرفت سے آشنا ہونے کے بعد ہی کوئی فرد ہوشمندی کا ثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ خیر و شر سے بے نیاز عمل پیرا افراد نادان ہوتے ہیں۔ ان کی بے نیازی ہی اس امر کی غماز ہے۔

افلاطونی فلسفہ حیات کی مثال ایک ایسے دستر خوان سے دی جا سکتی ہے جس کے خوشہ چیں ہیگل، ویلی، روسو، نطشے اور فرائڈ سب کے سب ہیں۔ ہر قماش کے افراد اس سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں اسی لیے ایفرسن کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

''فلسفہ افلاطون ہے اور افلاطون فلسفہ''

افلاطون کی ''جمہوریہ'' میں ایک جگہ ایک کردار گلوکون دوسرے کردار سقراط سے یہ سوال پوچھتا ہے کہ جب ریاستوں کی بہبود اسی میں ہے کہ وہ کسی حکمران حکیم کے زیر نگیں ہو تو ذرا اس حکیم کی تعریف تو بیان کیجیے۔ اس پر سقراط یہ جواب دیتا ہے:

''علم دو طرح کا ہے۔ ایک جزئیات یا محسوسات کا علم اور دوسرا تصورات مجردہ کا علم تصورات مجردہ کا علم ہی حکمت کہلاتا ہے۔'' محسوسات کی بنا پر فقط رائے کی قائم ہو سکتی ہے۔ رائے علم اور جہل کے مابین ایک درمیانی چیز ہے۔ محسوسات کی کثرت کو تصورت کی وحدت میں لانا فلسفہ ہے۔ جو شخص حسین چیزوں کی طرف دوڑتا ہے لیکن حسن مطلق کا تصور اس میں نہیں ہے، وہ حکیم نہیں ہے۔ رائے عملی زندگی میں کام آ سکتی ہے۔ لیکن روح میں بصیرت پیدا نہیں کر سکتی۔ ایک حقیقت اضافی ہے ایک مطلق۔ جب تک کوئی حقیقت اضافی کو ساقط کر کے حقیقت مطلقہ تک نہ پہنچے وہ حکیم نہیں ہے۔

گلوکون مندرجہ بالا بیان کی مزید وضاحت چاہتا ہے۔ اس صورت میں سقراط مرد حکیم کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے یہ بتلاتا ہے کہ وہ علم کا عاشق ہوتا ہے۔ ازلی اور ابدی حقائق پر نظر رکھتا ہے۔ اس کی بلند خواہشیں اس کے ادنیٰ جذبات کو سوخت کر دیتی ہیں۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا، خوش طبع اور فیاض ہوتا ہے نہ مغرور ہوتا ہے، نہ بزدل اس کی عقل تیز ہوتی ہے، اس کے نفس میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس پر اس کا ہم نشین اڈی منٹس مداخلت کرتے ہوئے کہتا ہے:

''تم مرد حکیم کو اس طرح کا انسان کامل بنا رہے ہو لیکن عام تجربہ یہ ہے کہ فلسفے میں عمر گزارنے والے اگر فطرت کے خراب آدمی ہوں تو اور زیادہ مکار اور بدمعاش ہو جاتے ہیں اور اگر نیک طینت ہوں تو زندگی کے امور کے لیے احمق ہو جاتے ہیں''

اس کا جواب سقراط نے یوں دیا کہ:

''سچا فلسفی بڑی کم یاب مخلوق ہے۔ جن بدفطرتوں نے استدلال کے ہتھکنڈے سیکھ لیے ہیں ان کو تم فلسفی کہتے ہی کیوں ہو ہم اچھی فطرت والوں پر ذرا غور کرتے ہیں کہ سوسائٹی میں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اگر سوسائٹی کا نظام غلط ہو تو اس میں ایک اچھی صلاحیت کا شخص اپنی خوبیوں کی وجہ سے عظیم خطرات میں پڑ جاتا ہے۔ صحت، دولت، قوت، مرتبہ اور بہت سی نیکیاں بھی غلط ماحول میں آ کر نفع کی بجائے نقصان کا باعث ہو سکتی ہیں۔ کمزور فطرت اور ادنیٰ صلاحیت کا شخص نہ کوئی بڑی نیکی کر سکتا ہے اور نہ کوئی بڑی بدی۔ بھاس پھوس اور ادنیٰ قسم کے بیج خراب زمین میں بھی بغیر آبیاری کے زندہ رہتے ہیں اور پنپ بھی سکتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ درجے کے بیجوں کو عمدہ زمین اور پانی نہ ملے اور ماحول صحیح نہ ہو تو ان کا برا حال ہوتا ہے۔ یہی حال فلسفی کا ہے اگر اس کو اپنی غیر معمولی قوتوں کے لیے صحیح ماحول نہ ملے تو وہ بدترین خلائق ہو جائے گا۔ ایسا بڑا مجرم ہوگا کہ خلق خدا اس سے پناہ مانگے۔ وہ دیکھے گا کہ صداقت سے اس سوسائٹی میں سوا عذاب یا موت اور کسمپرسی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ عوام کے جذبات کا مطالعہ کر کے ان پر قابو حاصل کر لے گا۔ سچائی کو بالائے طاق رکھ کر رائے عامہ کی پیروی کرے گا۔ دیکھنے میں وہ رہنما معلوم ہوگا لیکن حقیقت میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی درندوں کو پالنے والے کی۔ وہ ان کی خواہشات اور جذبات کو مدنظر رکھ کر ان پر قابو پا لیتا ہے۔ خود ان کے شر سے بچتا ہے اور جس طرح چاہے ان کی درندگی کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس قسم کا جھوٹا رہنما عوام کے جذبات کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ خود نہ کسی اصول کو سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے اور نہ دوسروں کی ہدایت اس کو مقصود ہے۔ اس کا کام یہی رہ جاتا ہے کہ عوام جس چیز کو اچھا سمجھیں وہ اس کی اچھائی کے لئے دلائل مہیا کرے اور اپنا الو سیدھا کرتا جائے۔ عوام کو ادنیٰ جذبات کے پورا کرنے کے لیے بھی اپنے رہنماؤں میں بڑی بڑی صلاحیتوں کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایسے قابل آدمیوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو اپنی قابلیت کو ان کی اغراض کے لیے استعمال کریں۔ کسی اعلیٰ خاندان کا تندرست خوبصورت، تعلیم یافتہ، مالدار خوش بیان نوجوان اگر ان کو مل سکے تو وہ اس کا شکار کرتے ہیں۔ وہ اس کی ایسی خوشامد کرتے ہیں کہ اس کا دماغ بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ بادشاہی کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ وہ حکیم بننے کے بجائے پیشہ ور خطیب اور سیاست داں بننے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ اچھے کام بھی کر سکتا ہے لیکن اس کا بھی احتمال ہے کہ وہ ان قوتوں کا غلط استعمال کر کے انسانوں کے لیے بڑی تباہی کا باعث ہو۔ ہمارے موجودہ نظام جماعت میں نہ صرف بدفطرت لوگ فلسفے کی شد بد سیکھ کر انسانوں کے لیے ضرر کا باعث ہوتے ہیں بلکہ اچھی استعداد کے لوگ بھی غلط راہوں پر پڑ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں راست اندیش اور راست کار حکیم کہاں ملے گا۔ اگر وہ کہیں ایسی جگہ رہتا ہو جہاں سیاست نہ ہونے کے برابر ہو تو البتہ پبلک کی لیڈری کے جراثیم سے محفوظ رہے گا یا یہ کہ کم زور صحت کا آدمی ہو جو حکمت کی لذات سے آشنا ہو چکا ہو۔ لیکن شدید جدوجہد اور سیاسی کشمکش کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ عدالتوں اور آئین ساز مجلسوں کو وہ دور سے جھانک کر دیکھتا ہے اور جان جاتا ہے کہ یہ درندوں اور چوروں کے اکھاڑے ہیں۔ وہ اپنی نیکی اور سکون قلب کو بچانے کے لیے گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ جہاں نہ کوئی تیر کمان میں ہے اور نہ صیاد کمین گاہ میں، یہ تو کر سکتے ہیں کہ اچھا کیا اس نے اپنی روح کو غلاظت سے بچا لیا لیکن کوئی بڑا کام تو ایسے آدمی سے نہیں ہو سکے گا۔ اس نے اپنا دامن موجوں سے بچا لیا اور نہنگوں کے منہ میں نہیں گیا۔ وہ سمندر کی تہہ سے کوئی موتی نکال کر نہیں لا سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ کامل انسان کامل جماعت کے اندر ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ انسان ایک اجتماعی فرد ہے۔ گوشہ گزینی میں کوئی بڑے کمالات بھی پیدا نہیں ہو سکتے اور پیدا بھی ہو گئے تو جماعت سے الگ ان کا مصرف کیا ہے۔ جو تلوار میان میں خلوت گزیں رہے اور جو موتی صدف میں سے نہ نکلے، اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔''

مندرجہ بالا بیان سے مرد حکیم کی شبیہ کافی نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کی نشوونما کے ارتقائی مراحل سے بھی ہم اچھی طرح آگاہ ہو جاتے ہیں۔ افلاطون سقراط کی زبانی فرد اور سماج کے رشتے کی وضاحت بڑے ہی صاف لفظوں میں کر دیتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ مرد حکیم کی پرورش و پرداخت کے لیے کافی انسانوں کی ایک جماعت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ نا کارہ قوموں کے افراد کے درمیان اس کی فطری صلاحیتوں کی جلا نہیں ہو پائے گی اور کامل جماعت کا تصور اسی وقت عملی جامہ پہن سکتا ہے جب نوع انسانی ایک با مقصد حیات کے لیے کسی مخصوص ضابطہ حیات پر عمل پیرا ہو۔ وہ ضابطہ حیات افراد کو پستیوں سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جائے گا۔ اس کی نشاندہی بھی افلاطون نے اپنی کتاب ''جمہوریہ'' میں کر دی ہے۔

ارسطو کا فراخدل انسان Magnanimous Man:

نے اپنے استاد سقراط سے کافی گہرے اثرات قبول کیے، اسی طرح ارسطو نے بھی افلاطون سے اثرات ضرور قبول کیے ہیں لیکن اس کا انداز فکر ناقدانہ ہے اور کسی قدر باغیانہ بھی۔ وہ استاد کی شاہراہ پر چلنے کی بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔

''وہ 384 ق م میں سٹاجیرا میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ مقدونیہ کی ریاست میں شاہی طبیب تھا۔ ارسطو کی عمر اٹھارہ برس کی تھی جب باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس نے باپ ہی سے طبابت کی تعلیم پائی اور غالباً جراحی کی بھی مشق کی۔ باپ کی بدولت مقدونیہ کی ریاست سے اس کا تعلق قائم رہا۔ یہاں تک کہ وہ سکندر کا استاد اور اتالیق بن گیا۔ علم الابدان کا فرق بھی اس کو ورثے میں ملا۔ باپ کی وفات کے بعد وہ ایتھنز چلا آیا، جہاں اسے تقریباً بیس برس تک افلاطون کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ طب، حیاتیات اور نباتیات کے علاوہ اب افلاطون کی صحبت میں اس کو اخلاقیات، الٰہیات، اور۔ سیاسیات میں بھی انہماک ہوا۔ اس طرح وہ نفس اور بدن کے تمام مروجہ علوم پر حاوی ہو گیا۔ افلاطون کے یہاں علوم الگ الگ نہیں ملتے۔ فنی تدوین اور تنظیم نہیں اس کام کو اس کے شاگرد ارسطو نے پورا کیا۔ ہر قسم کے علوم پر الگ الگ تصنیف کی اور ہر ایک کا الگ موضوع قرار دیا۔ علوم کو اس خوبی سے مرتب کیا کہ قریباً دو ہزار برس تک مشرق اور مغرب میں وہ بانی حکمت اور خاتم حکمت شمار ہوتا رہا اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کے تلمذ کے بغیر بھی علم حاصل ہو سکتا ہے یا اس سے الگ راہ اختیار کر کے بھی کوئی مفکر اور محقق صداقت تک پہنچ سکتا ہے۔ جہاں تک کہ صداقت کا تعلق علوم اور استدلال سے ہے۔''

''افلاطون اور ارسو کی باہمی موافقت اور مخالفت پر دو ہزار برس کے عرصے میں سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ کہیں استاد کے قدم بہ قدم چلتا ہے اور کہیں دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے اور کہیں ظاہری مخالفت کے باوجود اساسی اور باطنی موافقت پائی جاتی ہے۔ افلاطون خود اس کی نسبت نہایت صحیح رائے رکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ارسطو میرے مدرسہ کی عقل ہے لیکن وہ جانے مجھ سے اس طرح گریز کرتا ہے جس طرح کے گھوڑی کا بچہ بڑا ہو کر ماں کو دھتکارنے لگتا ہے۔ ارسطو اپنی تصنیفوں میں اپنے استاد کا نام احترام سے لیتا ہے اور بعض اہم نظریات میں استاد کو ساتھ ملا کر کہتا ہے کہ ''ہماری'' رائے میں اس امر میں یوں ہے۔

پھر بھی افلاطون کی طرح ارسطو کا تصور بشر روحانیت سے بہت زیادہ ہم آہنگ نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ عمل زیادہ تر استدلال پر منحصر ہے اور اس کی شخصیت میں عقلی عناصر روحانی اور وجدانی عناصر پر غالب نظر آتے ہیں۔ افلاطون زمین پر کھڑا ہے لیکن اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں اور اس قادر مطلق کی متلاشی ہیں جو تمام علوم اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے لیکن ارسطو کی نگاہیں کائنات اور انسان پر لگی ہوئی ہیں۔ یہ نسبتاً فرد سے زیادہ سماج کو ترجیح دیتا ہے۔ مطلق العنان شہنشاہیت کو ہی بہتر قسم کی حکومت تصور کرتا ہے۔ لیکن اسے لائق عمل نہیں سمجھتا کیونکہ بادشاہ کے لیے جتنی خوبیاں لازمی ہیں، ان خوبیوں کا کسی ایک شخص میں یکجا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ارسطو جمہور کو ہی زیادہ اہم قرار دیتا ہے۔ اور ان کی تنظیم (Polity) کو سب سے بہترین صورت سمجھتا ہے۔ ارسطو افلاطون کی مشکلات کو حل کرنے کا مدعی ہے لیکن اخیر میں خدا کے متعلق اظہار خیال کرتے وقت اسے تصور بے مادہ تک پہنچنا ہی پڑا۔ اس طرح منزل پر پہنچ کر استاد شاگرد میں کوئی بین فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ارسطو کسی موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل موضوع بحث کی وضاحت کر کے اس کی صحیح ماہیت متعین کر لیتا ہے تب مبحث پر بحث کرتا ہے۔

''اگر صداقت کا حصول تفکر اور استدلال سے ہوتا ہے تو یہ امر نہایت اہم ہے کہ خود فکر و استدلال کی ماہیت پر غور کیا جائے۔ اس کے قوانین مرتب کیے جائیں اور بطور فن اس کی مشق کرائی جائے۔ سب کو معلوم ہے کہ استدلال صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی لیکن جب تک معیار معین نہ ہو صحیح و غلط کو کیسے پرکھیں؟''

ارسطو ریاست اور جمعیتوں کے متعلق اپنے خیالات ان لفظوں میں ظاہر کرتا ہے:

''مشاہدے سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ ریاست کا ہر فرد ایک جمعیت اور تنظیم کا رکن ہے اور ثانیاً یہ کہ تمام تنظیمیں یا ریاستیں کسی نیک مقصد کے حصول کے لیے معرض وجود میں لائی جاتی ہیں۔ تمام افراد اپنے افعال کو اسی اصول کے تحت کرتے ہیں کہ وہ وضیلت پا سکیں۔''

بنیادی طور پر انسانی مطالعے کے لیے ارسطو تمام ذی روح میں فطرت کے کسی نہ کسی حسین پہلو کی تلاش کرتا ہے۔

''ہمیں چاہئے کہ تمام ذی روح کی فطرت کا مشاہدہ کریں اور اس مرحلے میں اس امر کو فراموش کر دیں کہ کون پست ہے اور کون بلند۔ ہمیں زندگی کی مختلف ہیئتوں کا مطالعہ بغیر کسی ناامیدی اور مسرت کے یہ جانتے ہوئے کرنا چاہئے کہ ہر ذی روح کی ذات میں فطرت کا کچھ نہ کچھ عنصر موجود ہے۔''

ارسطو کا مثالی انسان ''مرد جوسخا'' (Magnanimous Man) ایک ایسی ہستی ہے جو کبھی تو ذات واحد نظر آتا ہے اور کبھی یہ فریضہ تنظیمیں انجام دیتی ہیں۔ کردار سے زیادہ وہ آئین پر توجہ رکھتا ہے۔

''جمہوری ریاستوں میں ہمیشہ شہری ہی مقتدر اعلیٰ ہوتا ہے اور یہ مقتدر اعلیٰ لازمی طور پر کوئی تنہا آدمی ہو سکتا ہے یا کسی جماعت کے چند لوگ ہو سکتے ہیں یا بہت سے لوگ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب کوئی ایک یا چند لوگ یا بہتیرے افراد مل کر عام مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت کریں تو ان کے سامنے کوئی صحت مند دستور ہونا چاہئے۔''

افلاطون کے فلسفے میں فرد کی انانیت تو کبھی سماج پر غالب ہو کر ابھرتی ہے اور کبھی فرد کا وجود جمہور کے اژدہام میں غائب ہوتا نظر آتا ہے۔ افلاطون کے حکیم حکمراں کی طرح ارسطو کسی تصور کو پیش نہیں کرتا۔ حکمراں کی صفتوں پر اس انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔

''حکمراں'' کو چاہئے کہ وہ ایسے مشاہدے کا مالک ہو تا کہ ریاست کی کشتی کو سیاست کے اتھل پتھل کی وجہ سے گدلاتے ہوئے پانی سے آسانی کے ساتھ نکال سکے۔ معمولی بساط کا آدمی سر پر منڈلاتے ہوئے آلام کا اندازہ نہیں کر پاتا اس لیے صحیح حکمراں اور مدبر کی ضرورت ہوتی ہے' اس ذیل میں دولت اور تعلیم کو دفتری کاموں کے لیے ترجیح دی جا سکتی ہے۔ کسی آدمی کو ایسا موقع نہیں دینا چاہئے کہ وہ محض اپنی دولت کے بل بوتے پر شہ زور اور بدتر بن جائے۔ اگر کوئی اس طرح کا ہو جائے تو اسے ملک بدر کر دینا چاہئے۔''

ارسطو انسانی سماج میں توازن اور توافق کا قائل ہے۔ وہ کسی فوق الفطرت ہستی کے وجود کا تصور نہیں کرتا بلکہ اسے زمینی انسان ہی سے زیادہ پیار ہے۔ وہ حکومت اور سیاست کی عملی پیچیدگیوں سے بخوبی آشنا ہے۔ افلاطون کی بہ نسبت اسے انسانی نفسیات کا زیادہ گہرا شعور حاصل ہے۔ اس لیے ارسطو کے یہاں Philosopher Ruler جیسے تصور کی تلاش بے سود ہے، کیونکہ اب تک جن فلسفیوں کا مطالعہ کیا گیا ان میں سب کے سب ریاست اور اس کی تنظیم کے باب میں ہی اعلیٰ و ارفع انسان کا تصور پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ارسطو انسان کی رفعت اور عظمت کو اس قدر بے کراں ہونے سے روکتا ہے جو دوسروں کی حق تلفی کا باعث بن جائے۔ اسے متوازن حیات پسند ہے۔ ارسطو کا نظریہ اعتدال ہی عظمت کا ضامن بنتا ہے۔ اس کے خیال میں نیکی اور فضیلت اعتدال اور توازن ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس پر بہت زور دیتا ہے کہ ہر نیکی دو بدیوں کے بین بین موجود ہوتی ہے۔ افراط اور تفریط گناہ کے مترادف ہے ایک خاص حد سے تجاوز سے شر پیدا ہوتا ہے اور مقررہ حد سے بہت پیچھے بھی برائی ہے۔

''صراط مستقیم کے ادھر بھی خرابی ہے اور ادھر بھی۔ صفت میں، فطرت میں، فضیلت میں ہر

میں یہ وسط زریں الگ مقام پر قائم ہوگا۔ اس لیے تقلید محض سے اخلاقی زندگی بسر نہیں ہوسکتی۔ یہ طب روحانی بھی طب جسمانی کی طرح ہے۔ اس کے عام اصولوں کی تعلیم ہوسکتی ہے اور عام بصیرت پیدا کر سکتے ہیں لیکن کسی حالت میں وسط زریں کیا ہے اس کا کوئی کلیہ قاعدہ نہیں بن سکتا۔ جو لوگ عمل سے پاکیزگی حاصل کر چکے ہیں وہ درمیانی راستے کو بصیرت اور فراست سے معلوم کر لیتے ہیں اور ان کے قلب کا فتویٰ صحیح ہوتا ہے ہر حالت میں صراط مستقیم ایک ہی ہوتا ہے لیکن افراد و تفریط کے غلط راستے بے شمار ہوتے ہیں۔ وسط جمیل کی بعض مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے فقط عام نظریے پر روشنی پڑتی ہے۔''

افراط	وسط	تفریط
تہوریا کورانہ شجاعت	بہادری	بزدلی
شہوت پرستی	عفت	ٹھنڈاپن، بے حسی
فضول خرچی	فیاضی، کفایت شعاری	بخل
خوشامد، تملق	تواضع	درشتی
اپنے حق سے زیادہ لینا	انصاف	اپنے حق سے کم لینا

افلاطون چار انسانی فضیلتوں کو مانتا ہے۔ حکمت، عفت، شجاعت اور عدالت، ارسطو تین فضیلتوں کو تو من وعن تسلیم کرتا ہے لیکن چوتھی فضیلت اس کے یہاں اخوت یا دوستی ہے لیکن ارسطو کے متعین کردہ فضائل میں افلاطون کے تصورات کی وسعت اور ہم آہنگی نہیں ہے۔ علم کا اثر کہاں تک عمل پر پڑسکتا ہے، اس سلسلے میں ان ارکان ثلاثہ کے یہاں اختلاف ہے۔

''سقراطی، افلاطونی اخلاقیات اور ارسطا طالیسی اخلاقیات میں ایک بڑی وجہ اختلاف یہی مسئلہ ہے۔ سقراط و افلاطون کہتے ہیں کہ کوئی شخص جان بوجھ کر غلط عمل نہیں کرسکتا۔ ہر غلط کار جو کچھ کرتا ہے اس کو اس وقت صحیح سمجھ کر کرتا ہے۔ اگر وہ اس کو اچھا اور صحیح نہ سمجھے تو کبھی اس کا مرتکب نہ ہو۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر انسان خراب سے خراب عمل کرنے سے پہلے کسی نہ کسی طرح اس کا جواز اپنے نفس کی تسلی کے لیے مہیا کر لیتا ہے۔ کسی غلط تاویل سے کوئی غلط نظریہ قائم کر کے اور اس کو صحیح سمجھ کر فعل بد کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہر شخص کو یہ یقینی علم حاصل ہے کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ جل جاتا ہے۔ اس لیے کوئی شخص جان بوجھ کر کبھی آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اگر کسی شخص کو خیر وشر کے متعلق اسی قسم کا یقینی علم ہو تو وہ شر کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ حقیقتاً غلط کار کے علم میں ہی فتور ہوتا ہے۔ اس مسئلے کا حل غالباً اس طرح ہوسکتا ہے کہ پہلے علم کی قسمیں اور یقین کے مدارج معین کیے جائیں۔ یقین کے تین درجے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص دوسروں سے سنتا ہے کہ فلاں چیز کے کھانے سے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ یہ محض علم الیقین ہے جس کا عمل پر اثر یقینی نہیں ہوتا۔ دوسرا درجہ یہ ہوا کہ اس نے لوگوں کو دیکھا کہ جو ایسی چیز کھاتا ہے وہ درد شکم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس مشاہدے میں اس کا یقین پہلے کے مقابلے میں زیادہ استوار ہو جائے گا۔ لیکن علم اور یقین کا درجہ کمال وہاں ہوگا جہاں اس نے خود اس کا تجربہ کیا، جب کبھی وہ چیز کھائی پیٹ میں درد ہوگیا۔ اسی قسم کے علم و یقین کے بعد غلط کاری دشوار بلکہ محال ہو جائے گی۔ سقراط اور افلاطون جب علم کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی مراد حقائق کے حق الیقین سے ہوتی ہے۔ اس پر غالباً ارسطو کو بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن عملی زندگی کا تجربہ ارسطو کی حمایت کرتا ہے۔ دنیا میں بہت کم انسان ایسے عارف ہوتے ہیں کہ خیر وشر کے متعلق ان کا علم حق الیقین کا درجہ رکھتا ہو۔ فطرت کی کنجی سے یا خراب عادتوں کے باعث انسان کا نظام عصبی خاص قسم کے اعمال کا خوگر ہو کر خالی علم کے مقابلے میں مجبور و مفلوج ہو جاتا ہے۔ انسان اسی عمل کو آسان سمجھتا ہے اور آسانی سے کرتا ہے جس کو بار بار وہ کر چکا ہو، اس لیے خالی علم پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ خراب عمل کی عادت بوقت عمل اس علم ہی کو مسخ کر دے گی اور مسخ شدہ علم سے غلط کاری ہی سرزد ہوگی جس پر سقراط اور افلاطون کہیں گے کہ پہلے غلط سمجھا پھر غلط کیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ غلط عادت نے بوقت عمل سمجھ میں عارضی فتور پیدا کر دیا۔''

اس سے یہ بات واضح ہے کہ ارسطو خالی علم پر یقین نہیں کرتا اس کے نزدیک فضیلت اور نیکی میں علم اسی وقت متبادل ہوسکتا ہے جب صحیح علم کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ تاریخ فلسفہ میں سب سے پہلے علم و عمل کی اس گتھی کو ارسطو نے سلجھایا۔ اس نے علم و ایمان کے ساتھ عمل کو لازمی قرار دیا۔ اس امر کی بھرپور وضاحت کی کہ فقط علم نیکی نہیں ہوسکتا بلکہ نیکی علم و عمل کی بنا پر مرتب شدہ اعمال کا نام ہے۔ جن لوگوں کو نیکی کرنے کی خو نہ پڑ جائے انہیں نیک سمجھنے کی گنجائش نہیں، حادثاتی طور پر سرزد نیک اعمال بھی سیرت کا جز و نہیں بنتے اور ان افعال و اعمال کی روشنی میں کسی کی سیرت پوری طرح اجاگر ہو پاتی ہے، بلکہ نیکی جذبات کے مسلسل تصرف اور ضبط نفس کی متواتر مشق سے پیدا ہوتی ہے۔ سقراط افلاطون اور ارسطو تینوں کے نزدیک انسان کا جوہر حقیقی اور اس کی صفت امتیازی عقل ہے۔ اگر انسان کا اصل جوہر عقل ہی ہے تو بہترین زندگی وہی ہے جس پر حیات کے اسرار و رموز منکشف ہو جائیں۔ اگر اصل مقصد حصول معرفت ہی ہے تو اصل زندگی یعنی اخلاقی زندگی محض۔ وسیلہ ہے، منزل نہیں۔

''اخلاق کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ معرفت اپنے موانع کو راستے سے ہٹا کر آزاد ہونا چاہتی ہے۔ جب معرفت آزاد ہو جائے تو خیر وشر کی پیکار بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس زندگی میں انسان کے ساتھ جسم لگا ہوا ہے اور نفس الٰہی کے ساتھ نفس ادنیٰ کے تقاضے بھی دست و گریباں رہتے ہیں۔ کچھ کشمکش انسان کے اندر ہے اور کچھ کشمکش جماعت کے افراد کے مابین رہتی ہے۔ یہ کھینچا تانی روح کو اپنی اصل فعلیت سے روکتی ہے اور روح کی اعلیٰ قوتیں انہیں مزاحمتوں پر غالب آنے میں صرف ہوتی رہتی ہیں۔ ہر وقت آئینہ قلب پر سے زنگ اتارنے کے لیے اس کو صیقل کرنا پڑتا ہے۔ اس کام کے لیے اخلاقی زندگی سب سے بہتر آلہ ہے لیکن یہ عقل کو آزاد رکھنے کا ذریعہ ہے۔ خود مقصود حیات نہیں۔ عرفان کے دارالسلام میں خیر وشر کی پیکار منسوخ ہو جاتی ہے۔ انسان کا جوہر اصلی الٰہی ہے اور خدا خیر وشر سے ماورا ہے۔ اخلاقی زندگی میں ہر خیر وشر سے وابستہ ہے اگر جسمانی اور مادی زندگی کا شر نہ ہو تو کسی اخلاقی فضیلت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ معرفت سراپا خیر بھی ہے اور سراپا سرور بھی۔ اس کے بعد کوئی کیفیت باقی نہیں رہ جاتی جس کی خواہش کی جائے۔ حیات معرفت ہی خیر برتر ہے۔ اس زندگی میں نیکیاں فرد اور جماعت کے نقائص کی پیداوار ہیں۔ عارفوں کی جماعت میں نہ شجاعت کی ضرورت ہوگی اور نہ عفت کی اور نہ عدل کی۔ حیات معرفت میں اخلاق کی کوئی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ ظاہر ہے کہ اس نصب العین کا اس زندگی میں حاصل ہونا ناممکن ہے، جہاں کشمکش اور جہاد کے بغیر گزارا نہیں۔ جب تک روح ہر قسم کے خوف اور ہر قسم کے حزن سے بلند نہ ہو جاتے تب تک معرفت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتی۔ ادنیٰ زندگی فوراً اس کو جھٹکا دے کر نیچے کی طرف کھینچے گی۔ نفس امارہ اور نفس لوامہ سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہی نفس مطمئنہ حاصل ہوسکتا ہے۔ یہی خیر برتین، مدعا اور مقصود حیات ہے۔ راستہ دشوار گزار اور خارزار ہے لیکن منزل اور منتہیٰ وہی ہے۔ عمل صحیح وہ ہے جس میں اس منزل کی طرف قدم اٹھیں۔ اور عمل شر وہ ہے جس میں انسان پشت بہ منزل ہو کر چلے۔''

یعنی یہ کہ عارف کو حیات کے تمام مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ افراد یا جماعتوں کے عملی اور نظری تصادم کا شکار ہونا پڑتا ہے کشمکش حیات میں اکثر موڑوں پر پنجہ آزمائی کرنی ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ خیر برتین کے حصول کی خاطر۔ اپنی خود غرضی کی تسکین کے لیے نہیں اپنی فضیلتوں میں اضافے کے لیے انسان جب ان مراحل کو طے کر لیتا ہے تب جا کر عارفوں کی صف میں شمار کیا جاتا ہے اور اپنی

نظامات فلسفہ کی تعمیریں یونانی میں ارسطو کے ساتھ ہی فنا ہوگئیں۔ اس کے بعد الگ الگ موضوعات پر طبع آزمائیاں ہوتی رہیں۔ لیکن کسی نے بھی مذکورہ بالا ارکان ثلاثہ کی طرح کوئی منظم اور ہمہ گیر فلسفہ حیات پیش نہ کیا۔ اس انقلاب کی سب سے نمایاں وجہ سیاست تھی۔ سیاسی انتشار اور ذہنی بحران سوفسطائیوں (Sophists) کے دور ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو نے اپنی قد آور شخصیتوں کے بل بوتے پر کچھ دنوں تک تو طوفان کے اس دھارے کو روکے رکھا، لیکن پیلو پونیشن کی جنگ اور ایشیا کے زوال کے بعد یونان میں ابتری پھیل گئی۔ اخیر میں یونان کو رومتہ الکبریٰ کے سامراج کا جز و بننا پڑا اور بحیثیت قوم یونانیوں کی پسپائی ہوگئی لیکن نوع انسان کو اس سے بہت بڑا فائدہ پہنچا۔

ارسطو سکندر اعظم کا استاد تھا۔ یہ فاتح شاگرد یونانیوں کے سرمایہ علم و تہذیب کو اپنی فتوحات کے ساتھ تنگ حدود سے نکال کر وسیع تر دنیا میں لے گیا۔ اس کے بعد روما کی سلطنت کے زیر سایہ بحیرہ روم کے گرد اگرد کی تمام اقوام میں یہ علوم پھیل گئے اور ان اقوام کے اپنے مزاج اور سرمایہ افکار کے ساتھ مل کر نئے نئے نتائج ظہور میں آئے۔ ایشیائی مذاہب اور خیالات مغربی افکار کے ساتھ گھل مل گئے جس سے کئی قسم کی مرکب معجونیں پیدا ہوئیں۔ یونانیت اپنی حدود سے نکلی تو رومائیت کی وسعتوں میں اس نے خاص خاص صورتیں اختیار کیں۔ اس کے بعد عیسائیت کے عروج نے ان تمام اجزا کو ایک مشرقی مذہب کے خم میں ڈال دیا۔ مغربی تہذیب و مذہب کے یہی تین بڑے ستون ہیں۔ یونانیت، رومانیت، عیسائیت، لیکن اس تمام ڈھانچے کے اندر عقلی عناصر، یونانی حکمت ہی نے فراہم کیے ہیں۔‘‘

عیسائیت کے عروج و زوال کی داستان ایک طویل داستان ہے۔ اس لیے بھی مجھے اس سے گریز کرنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں سوپر مین یا فوق البشر کا تصور نہیں ملتا اور ان کی تعلیمات کی روشنی میں جو عظیم ترین انسان کی شبیہ ابھرتی ہے، وہ قیل و قال اور تنازعوں اور مباحثوں سے اس قدر پر ہے کہ اس کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی جس انداز میں تصدیق قرآن کریم نے کی ہے اس روشنی میں اغراض و مقاصد نے مواد نہیں چھوڑا ہے۔ اور ایک سچے نبی کی تعلیمات میں اپنی خواہشوں کو شامل کر کے عیسائیت کے عظیم ترین انسان کو خدا کا بیٹا کہہ کر بشری حدود سے باہر نکال لیا ہے پھر بھی جس یوروپی مفکر کی نظر میں عیسائیت کے دھندلے نقوش ہمارے موضوع سے متعلق پائے جاتے ہیں، وہ منظر عام پر عیسائیت کے زوال کے وقت آتے ہیں اور اس وقت نشاۃ ثانیہ کے لازمی نتیجے کے طور پر افراد کے آزادانہ انفرادی شعور میں بیداری کا عام احساس پیدا ہو چکا ہے۔ نشاۃ ثانیہ انسان کو مذہب کی قیود سے نکالتی ہے۔ اسے سماجی درجات (Social Status) کی فکر دامن گیر رہ جاتی ہے۔ وہ انسان کو خدا کی بندگی سے آزاد کر کے ہی دم نہیں لینا چاہتا بلکہ سماجی قیود و پابندیوں کو پھلانگ کر اس سرنو نئی دنیا کی تعمیر میں مصروف نظر آتا ہے۔ انسانوں کی خانہ بندی کو باطل ٹھہرا کر اسے انسانوں کے بنائے ہوئے ناہموار آئین سے رہائی دلانے کا حوصلہ دلاتا ہے اور انسانوں کی کھوئی انسانیت اسے واپس کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سیاست، مذہب سے پیچھا چھڑانے کے درپے ہے اور حکمراں آئین خداوندی کی اطاعت کی بجائے خود ساز دستور حیات پر عمل پیرا ہونے کا آرزومند۔ مذہب کہتا ہے کہ یہ عالم خدا کی تخلیق ہے لیکن نشاۃ ثانیہ دعویدار ہے کہ ہم دھرتی کے باسی ہیں، یہ دنیا ہماری گرفت میں ہے انسان ہی کا اس پر حق ہے وہ جس طرح چاہے تصرف کرے۔ نشاۃ ثانیہ اپنے سے قبل کے فکری اور سماجی ڈھانچے کے خلاف ایک اعلان جنگ ہے۔ میکیاولی جو اس عہد کا پیشوا ہے فطری طور پر اپنے مزاج کے اندر ان سارے تاثرات کو سموئے ہوئے ہے۔

میکیاویلی کا مختار مقنن Machiavelle's Omnipotent Legiolator :

میکیاویلی (Machiavelle) کا یقین ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جس کی بنیاد منہدم ہو چکی ہے۔ اور جو زوال پذیر ہے ایک ایسے غیر معمولی اوصاف کے عظیم انسان کی ضرورت ہے جو اپنے اندر بے پناہ قوت و صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ از سر نو افراد کے اندر نئی روح پھونک سکتا ہے اور مزید اذہان کی تعمیر کر سکتا ہے۔ حب الوطنی کے جذبات کو پھر سے بیدار کر سکتا ہے۔ وطن پرستی اس کا شعار ہوگا اور وہ اپنے اعمال کے لیے ایک آئین کا رہین منت ہوگا۔ ایسے انسان کو وہ ایک مختار مقنن (Omnipotent Legistatos) کے نام سے یاد کرتا ہے وہ اپنی کتاب ’’Discourses‘‘ میں رقمطراز ہے:

’’ہمیں اس امر کا یقینی طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ عموماً چند استثنائی مثالوں کے سوا کبھی بھی شہنشاہیت اور جمہوریت میں خوش نظمی نہیں پائی جاتی یا قدیم ڈھانچے مکمل طور پر متبادل ہو چکے ہیں۔ اس کی اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب کوئی ایک آدمی، محض تنہا اس فرض کو انجام دے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جس کے دماغ میں ایک ایسا آئین پرورش پا کر ہمارے سامنے آئے وہی شخص اس کا مجاز ہوگا کہ عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لے۔‘‘

یعنی یہ طاقتور ترین قانون ساز خود قانون بنائے گا اور وہی اس پر عمل پیرا بھی ہوگا۔ یہ محض سیاسی حالات کی ہی اصلاح نہیں کرے گا بلکہ عوام کی روحانی اور اخلاقی نشوونما کی ذمہ داریاں بھی اسی پر عائد ہوں گی۔ یہ اپنے اعمال و افعال میں قطعی طور پر مختار ہے۔ یہ اپنے بنائے ہوئے قانون کی روشنی میں جو کام جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔ پروفیسر جی۔ ایچ۔ سبائن لکھتے ہیں:

’’میکیاویلی محض سیاسی تنظیموں کے متعلق نہیں سوچتا بلکہ وہ فرد کے تمام سماجی اور اخلاقی اعمال پر بھی اپنے ہیرو کو اختیار دیتا ہے۔ افراد کو ’’آئین ساز‘‘ کی فہم و فراست پر ہی ایمان لا کر اخلاقی اور انفرادی نشوونما کرنی ہوگی۔ عملاً اس کی کوئی انتہا نہیں کہ حکمران کیا کچھ نہیں کر سکتا ہے؟ بشرطیکہ حکمرانی کے فن سے بخوبی واقف ہو۔ وہ قدیم ریاست کا بوسیدہ چولا قطعی طور پر پھاڑ کر پھینک سکتا ہے اور بالکل نیا نظام قائم کر سکتا ہے۔ سرکار کی ہیئت بدل سکتا ہے۔ آبادی کو کم و بیش کر سکتا ہے اور اپنی رعایا کو نیکی کا نیا معیار عطا کر سکتا ہے۔ اگر اسے فوج کی قلت کا احساس ہوتا ہے تو گویا اسے کسی کو ملزم ٹھہرانے کی بجائے خود کو مجرم سمجھنا چاہیے کیونکہ اسے ایسے اقدامات کرنے ہیں جو افراد کی نرگسیت کو سرے سے ختم کر دے۔ یہ قانون ساز ایک معمار کی مانند ہے جو ریاست کی تعمیر کے دوش بدوش معاشرے کی بھی تعمیر کرے گا۔ معاشرے کے تمام مذہبی، اخلاقی اور معاشیاتی ادارے اس کے زیر نگیں ہوں گے۔‘‘

میکیاویلی کے ایسے مبالغہ آمیز نظریے کی کئی وجوہات ہیں جن پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ جزوی طور پر یہ تصور ’’قدیم خرافات‘‘ (Ancient Myth) میں موجود تھا۔ جو سسرو (Cicero) اور پولی بس (Poleybious) کی تحریروں کے ذریعے میکیاویلی تک پہنچا۔ اس کے علاوہ سولہویں صدی کے اٹلی کے حکمرانوں کے مسائل کا عکس بھی اس تصور کا جز و لاینفک بنا ہوا ہے۔ خالصتاً ایک سیاسی مدبر کی حیثیت سے متعلقہ عہد کے حکمراں کو منتشر شہروں کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک دھاگے میں پرونا ہے اور فوجی طاقت کو بڑھا کر جمہور کو آئین کا احترام سکھانا ہے۔ اس طرح یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس تصور کی پشت پر اس عہد کے متعلقہ مسائل کی گہری چھاپ موجود ہے۔

میکیاویلی کے ’’مختار مقنن‘‘ پر تنقید کرتے ہوئے ہابس کہتا ہے کہ جب حکمران ہی ریاست کا آقا ہوگا ایسی صورت میں وہ بجائے خود آئین سے بری ہی نہیں ہوگا بلکہ اسے قانون کے نفاذ کے تحت جمہور کے اخلاق کی تعمیر کا حق ہے تو ویسی حالت میں وہ خود اخلاق کی سرحدوں سے باہر ہوگا۔ وہ کھلے طور پر اپنے ہیرو کو بے رحمی، کشت و خون، مکاری اور دوسری قسم کی بدعنوانیوں کی اجازت دیتا ہے۔‘‘ اس کردار کے خمیر میں سولہویں صدی کے ظالم بادشاہوں کی تصویر نظر آتی ہے۔ جن کا شعار جبر و ظلم اور جارحیت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میکیاویلی ’’ڈسکورسز‘‘ میں ایک جگہ لکھتا ہے:

’’کسی ماحول میں لوگ جس انداز سے جیتے ہیں وہ ماحول اس ماحول سے قطعی جداگانہ ہوتا ہے جس ماحول میں انہیں زندگی بسر کرنا چاہیے تھی اور زندگی کی یہ عمومیت انہیں بربادی کی راہ پر لے جاتی ہے چہ جائیکہ ان کی محافظت ہو سکے لہذا ایک ایسا شہزادہ جو اس بات کا آرزومند ہو اسے یقینی طور پر مزید

آپ کو بدلنا ہوگا۔ اس سلسلے میں اسے گناہوں کی طرف سے بے نیاز رہنا چاہئے وہ ایسے گناہوں کا مرتکب ہوسکتا ہے جس سے اسے ریاست پر حکمرانی میں سہولت فراہم ہوسکے۔ اگر بعض اقدامات ایسے ہوں جو سروں کی نگاہ میں گناہوں کے خانے میں ہوں۔ لیکن جو شان خسرس کو برقرار رکھنے میں معاون ہوں اسے بے جھجک عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔''

میکیاویلی کا شہزادہ خیر وشر اور اخلاق کے ادنیٰ اصولوں سے بھی بیزار نظر آتا ہے۔ اسے جاہ وجلال عزیز ہے۔ وہ چنگیز اور ہلاکو بننا چاہتا ہے۔ وہ عوام کو محض ایک کٹھ پتلی کی طرح اپنے ادنیٰ اشاروں پر نچانے کا متمنی ہے۔ گناہ گار سے نیک عمل کی توقع بیکار ہے۔ میکاویلی کا یہ تصور خالصتاً ناقص ہے کہ اخلاقی اصولوں سے آزاد ہوکر اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو انصاف قرار دے کر شہزادہ ریاست اور جمہور کے اخلاق کی تربیت کرسکے گا۔ جن کے اخلاق کی خود ضمانت نہ ہو وہ دوسروں کو اخلاق سکھائیں یہ بات تو ٹھیک ویسی ہی ہے جیسے کوئی نابینا کسی آنکھ والے کو راستہ دکھلائے۔ میکیاویلی کا شہزادہ ایک شہ زور، خودغرض مطلق العنان، گناہ گار بے اصول جابر حکمران ہے جو کسی صورت میں بھی انسانی فلاح و بہبود کے حسب حال نہیں ہے۔

روسو: ''خواہش عامہ'' General Will :

اٹھارہویں صدی میں روسو خواہش عام (General Will) کی آواز بلند کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ:

''میں آسانی کے ساتھ اپنی بدنصیبیوں کو بھول سکتا ہوں لیکن میں اپنی غلطیوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے نیک جذبات کا بھی قدرداں ہوں۔''

روسو کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ انسان جبلی طور پر نیک پیدا ہوا ہے اور یہی عقیدہ اس کے فلسفہ کی تہہ میں جاری وساری ہے۔ وہ اپنی تمام تحریروں میں اپنی شخصیت کی خامیوں کی خانہ پری میں مصروف نظر آتا ہے۔ اسے ہمیشہ یہ خدشہ رہتا ہے کہ وہ ایک خراب آدمی ہے اس لیے وہ ایک اچھے انسان کی شبیہ ہمیشہ اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اپنی برائی پر پردہ ڈالنے کے لیے نیکی کی باتیں کرتا ہے۔ روسو استدلال پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ اس نے استدلال پر شدید حملہ کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ''سوچ میں ڈوبے ہوئے انسان کی مثال ایک بے رہ جانور کی سی ہے'' اس کی تمام اخلاقی قدریں یہی عمومیت لیے ہوئے ہیں۔

روسو کا مثالی انسان یا پیروعہد عتیق کا کوئی حقیقی فقیر نہیں بلکہ وہ بورژ وانتظام کا پروردہ ایک آوارہ، بے جہت، جھنجھلایا ہوا انسان ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے افراد کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیونکہ سوسائٹی نے اسے ہمیشہ ہتک آمیز لفظوں سے یاد کیا تھا۔ وہ اپنے دل کی پاکیزگی اور اپنے تخیل کے ریگستانوں کی وسعت پر نازاں نظر آتا ہے۔ موجودہ سماج اور نظام میں انقلاب برپا کرکے سماج کی ازسرنو ایسی تنظیم کے منصوبے رکھتا ہے جس کے افراد سادہ لوح ہوں۔ روسو کے خیال میں اخلاقی قدریں سادہ لوح عوام کے اندر بڑے پیمانے پر پائی جاتی ہیں۔ وہ ''Emile'' میں کہتا ہے:

''یہ عام لوگ ہی ہیں جو انسانیت ساز ہوتے ہیں۔ ان میں کیا نہیں ہے جو ایک انسان کے اندر ہونا ضروری ہے مختلف رتبے کے مختلف لوگ بباطن ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔''

دوسری جگہ ایک اچھے شہری اور ریاست کی وسعت کو ان لفظوں میں بیان کرتا ہے:

''ہمیں خاص قسم کے معاشرے کی روشنی میں ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنا ہوگا جس میں آفاقی عمومیت ہو۔ ان چھوٹی ریاستوں کو دیکھ کر ہمارے دل میں ایک عظیم الشان ریاست کا تصور پیدا ہوتا ہے اور ہم دھیرے دھیرے ایک اچھے شہری ہونے کے ناطے ایک معقول انسان بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور ہم میں اپنے ملک کیلئے محبت کے سوا ساری انسانی برادری سے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ہمیں کسی خاص فرد کو پیار کرنے کی عادت سے نجات مل جائے تو ہم ساری دنیا کے لوگوں سے پیار کرسکتے ہیں۔''

اپنی کتاب معاشرتی اجارہ (Social Contract) میں اس نے فطری انسان کے مزاج کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک ایسے معاشرے کا تصور کیا ہے جس کی اجتماعی خواہش کو وہ انفرادی تقاضوں پر مقدم گردانتا ہے۔

''اگر ریاست کو ایک زندہ انسان تصور کرلیا جائے جس کی زندگی اراکین ریاست کی اکائی میں مدغم ہے اور اگر انفرادی طور پر کسی امر کی شدید آرزو ہے تو اسے اس آرزو کی تہذیب اس انداز میں کرنی ہوگی کہ عملی جامہ پہن کر وہ اجتماعی افادیت کا موجب بن سکے۔''

اس طرح روسو کا تصور ''خواہش عامہ'' (General Will) تنظیموں سے متعلق ایک عجیب وغریب تصور پیش کرتا ہے اور اس اجتماعی بہبود کا پہلو ہی نمایاں ہوکر ابھرتا ہے۔ فرد کی اپنی آرزوئیں اور اس کے عظیم تر عزائم بھی اجتماعی شعور ہی کی ایک رو بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس تصور کے تحت فرد کی بڑھی ہوئی انانیت کچلی جاتی ہے وہ خود کو اسی وقت عظیم ترین تصور کرسکتا ہے جب سارا معاشرہ عظمت کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہو۔ اس طرح روسو نے انسان کو سماج کے ساتھ جارحانہ حد تک جکڑ دیا ہے۔ شاید اس کی اپنی سماجی زندگی کا پس منظر اسے اس امر کی نفسیاتی طور پر اجازت نہیں دیا کہ کوئی دوسرا فرد اپنی ذاتی انسانیت ایسی بلندیوں پر لے جائے جہاں سے معاشرے کے دوسرے تمام افراد بونے نظر آنے لگیں بلکہ وہ ہر صلاحیت اور ذہین ترین انسانوں کو معاشرتی فرائض سے زیربار کرکے اسے سبک رفتار بننے سے روکتا ہے۔ اس سے حلم، اخلاق، بردباری، نیکی اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کا قصور تو ضرور ابھرتا ہے لیکن ایسے انسان سے کسی بہت بڑے انقلاب کی توقع ناممکن تو نہیں محال ضرور معلوم ہوتی ہے۔ روسو کسی حد تک فرد کی جبلت پر پابندیاں عائد کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آدمی کی جبلت ہمیشہ اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ زندگی کی تگ ودو میں سب سے آگے نکل جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی عظمت عام انسانوں کے لیے رحمت بن جاتی ہے اور اس سے دوسرے افراد بھی حسب ظرف مستفیض ہوتے ہیں۔ لیکن اس سرچشمہ فیض پر کوئی ضابطہ جبراً مسلط کردینا انسانی فطرت کو مجروح کردینا ہے۔

ہیگل کا تاریخی انسان Hegal's Historical Man :

اس کے برعکس ہیگل کا ''تاریخی انسان'' Historical Man'' کچھ ایسی ابدی قدروں کا قائل ہے جو کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتی ہیں۔ وہ افراط وتفریط سے گریزاں نظر آتا ہے۔ اس کی زندگی ایک ضابطے اور فطرت کے اساسی اصولوں کی رہین منت ضرور ہے۔ لیکن وہ کمال کی آخری سرحدوں کو چھونے کا آزادانہ طور پر استحقاق رکھتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی ساری قوت اور صلاحیت معاشرے کی اجتماعی بہبود میں صرف ہوتی ہے۔ اسے اس بات پر مکمل یقین ہے کہ صداقتیں افراط و تفریط کے بین بین ہیں۔ اس لیے اس کی طبیعت میں انتہاپسندی اور جارحیت کے عناصر بہت کم ہیں۔ یہ ''تاریخی انسان'' تاریخ کے پیچ وخم سے آشنا ہے۔ اسے اس امر کا اچھی طرح علم ہے کہ خیر وشر ایک ہی حقیقت کے دو قطبین ہیں۔ وہ دنیا کی ہر شے کو اس کی ضد سے پہچانتا ہے۔ دن کو رات کی علت سے برائی کو نیکی کے سبب اور تاریکی کو روشنی کے ذریعہ ''کل شی تعرف باضدادھا'' کی طرح ہی وہ ''ہر کمالے را زوال'' کا قائل ہے۔ اس کے خیال میں ہر چیز اپنے نقطہ عروج پر جاکر پھر مائل بہ زوال ہوجاتی ہے۔ جب کوئی تصور اپنی حد سے گزر جاتا ہے تو اس تصور کی نفی ہوجاتی ہے لیکن محض ناقص پہلو ہی کی نفی ہوتی ہے۔ مثال کے طور ''محبت'' کے تصور کو لیجئے۔ ماں اور بچے کی محبت فطری ہوتی ہے۔ لیکن اگر ماں بچے سے صرف محبت ہی کرے تو بچے کی تربیت نہ ہوسکے اور ماں کی فطری محبت یعنی بچے کی تربیت کا مقصد ہی فوت ہوجائے۔ اس لیے ماں نہ صرف بچے سے محبت کرتی ہے بلکہ بچہ کے ذہن میں خوف کا تصور بھی پیدا کرتی ہے اور بعض اوقات اسے سزا دینے کے لیے بے دردی کا سلوک روا رکھتی ہے۔ خوف اور بے دردی محبت کا عکس ہے۔ محبت کے تصور کی پوری طرح نفی نہیں ہوتی بلکہ محبت کے اس پہلو کی نفی ہوئی جو بچے کے لیے ضرر رساں تھا۔''

تعمیری پہلو باقی رہ گیا یعنی محبت سے مجبور ہو کر بچے کی تربیت کا مسئلہ:

''ہیگل کے نزدیک تصور کا صالح عنصر کبھی فنا نہیں ہوتا۔ مثلاً بیج سے پودا یا درخت پیدا ہوتا ہے۔ بیج کے ناقص پہلو کی نفی ہو گئی لیکن اس کا صالح عنصر پودے میں موجود ہے۔ اس میں پھل آئے جو ہمارے معدے میں جا کر ہمارا جزو بدن ہو گئے۔ لیکن کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام مراحل طے کرنے میں بیج، پودے اور پھل کی تاخیر بھی ہمارا جزو بدن ہوتی۔ یہ تاخیر پودے کا غیر فانی عنصر ہے۔ یہ غیر فانی عنصر بدلتے ہوئے تصورات میں باقی رہتا ہے اپنی متصوفانہ زبان میں ہیگل اس مفہوم کو یوں ادا کرتا ہے۔ ''روح کائنات کے حافظے میں سب کچھ محفوظ رہتا ہے'' یہ عنصر جو ہمیشہ باقی رہتا ہے، دراصل قدر (Value) یا نصب العین ہے۔ تصورات کے ارتقا میں اقدار ہمیشہ باقی رہتے ہیں۔ ان کے لیے فنا نہیں۔''

ہیگل کے اس جدلیاتی نظریے کے تحت یہ حقیقت آشکارا ہے کہ وہ ابدی اور آفاقی قدروں کا قائل ہے لیکن ایسی قدروں کا جو زمانے سے اثر انداز ہو کر متبادل ہوتی رہتی ہیں۔ اضداد کی اسی کشمکش اور ارتقائی عمل کو ہیگل جدلیاتی عمل (Dialectic Process) کہتا ہے۔ مارکس نے اپنے مادی نظریے کی تعمیر ہیگل کے اسی اصول کے تحت کی ہے۔ ہیگل کے مطابق:

''انسان شعور اور اختیار کا نام ہے۔ لیکن یہ دونوں صفات انسان میں بحیثیت نوع شروع ہی سے موجود نہیں ہوتیں۔ قانون ارتقاء جیسے کائنات میں جاری وساری ہے ایسے ہی انسانی فرد اور نوع کی ترقی بھی اسی کا نتیجہ ہے انسان کے شعور اور اختیار کے اسی ارتقا کا ہی نام تاریخ ہے اس لیے تاریخ کے چند اصول ہیں۔ وہی اصلول جو انسانی شعور اور ارادے کے ارتقا کے ہیں۔ ارتقا کے ابتدائی منازل میں جب انسان فطرت کے زیادہ قریب ہوتا ہے تو وہ محض فطری جبلتوں کے تحت زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے مقاصد خالص جبلی خواہشات ہی ہوتی ہیں۔ وہ صرف اپنی ذات سے واقف ہوتا ہے۔ اسے پرف اپنی ذات ہی سے دلچسپی ہوتی ہے۔ یا اصطلاحی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ اسے ''نفس موضوعی'' یا صرف اپنے نفس ہی کا احساس ہوتا ہے لیکن جوں جوں عقل ترقی کرتی جاتی ہے، ہر انسان سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی طرح کے دوسرے انسان بھی موجود ہیں۔ اب اسے اپنے مقاصد کے علاوہ دوسروں کے مقاصد کی طرف بھی توجہ دینا پڑتی ہے اور اس طرح اس کی آزادی محدود ہو جاتی ہے۔ گویا نفس موضوعی (یعنی میں) جو پہلے آزاد تھا اب نفس معروضی یعنی جماعت کے تحت آ جاتا ہے۔ نفس موضوعی یا فرد کے مقاصد نفس معروضی یا جماعت کے مقصد کے مقابلے میں قربان کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن نفس موضوعی کے نفس معروضی کے تحت آ جانے کے بعد بھی نفس موضوعی یعنی فرد کی فطری جبلتیں یا خواہشات قائم رہتی ہیں۔ البتہ صورتیں بدل جاتی ہیں۔ مثلاً فرد کی جنسی خواہشیں باقی رہتی ہیں۔ لیکن جماعتی زندگی میں وہ شادی بیاہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جذبہ انتقام نفس موضوعی میں موجود ہوتا ہے۔ نفس معروضی میں آ کر قانونی سزا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔''

ہیگل جمہوریت کے خلاف ہے۔ وہ صحیح تربیت یافتہ اور تاریخی شعور سے آراستہ جذبہ ایثار و قربانی سے سرشار انسان کو حکومت کرنے کا حقدار سمجھتا ہے۔

''ہیگل کے نزدیک جمہوری حکومت بہترین طرز حکومت نہیں کیونکہ جمہوریت میں مملکت اور جماعت کے مقاصد یا تصور کلی کو فرد، کنبہ یا قوم پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ تصور کلی کو تصور جزوی فرد پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ شاہی حکومت معیاری طرز حکومت ہے کیونکہ بادشاہ کی شخصیت میں تصور کلی یا جماعتی تصور پوری طرح جلوہ فرما ہوتا ہے۔ بادشاہ مملکت کی انسانی صورت ہے۔ ہیگل کے نزدیک لوئی چہاردہم کا یہ قول صحیح ہے کہ ''میں مملکت ہوں۔''

اقبال اور نقاد

اقبال سے کون متاثر نہیں صحیح کہا گیا ہے کہ ایسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اس سے پہلے کہ ہم اقبال کے مرد مومن کو تفصیل سے لکھیں ایک نظر ان سکالرز کے مضامین پر ڈالنا بھی فائدہ مند رہے گا جو بہترین نقاد اور تجزیہ نگار تھے۔ جو دنیا کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہوں نے اقبال کو گہرائی تک سمجھا اور پرکھا، آئیں دیکھتے ہیں کہ یہ کیا کہتے ہیں:

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ:

علامہ اقبال کے فکر وفن پر لکھنے والوں میں سے اکثر اس حقیقت کو چھپا جاتے ہیں کہ کلام اقبال کا 6/10 حصہ فرنگ اور تہذیب فرنگ پر حکیمانہ نقد ونظر پر مشتمل ہے، وجہ شاید یہ ہے کہ ہم غلام تھے اور غلامی کے زمانے میں جس کی روایات و باقیات اب تک موجود ہیں ہم مسحور بھی ہوئے اور مرعوب بھی۔ اس لیے ہم میں سے اکثر جب تہذیب فرنگ پر کچھ لکھنے لگتے ہیں تو اس کی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں حالانکہ ہر تہذیب یا نظام فکر میں کچھ کمزوریاں ہوا کرتی ہیں، میں خود بھی ڈرنے والوں میں شامل رہا لیکن جب میں نے مغرب پر خود اہل مغرب کی ناقدانہ تحریریں پڑھیں اور بعض مصنفوں کی یہ پکار بھی سنی کہ (It is time to remind West) تو میں نے اقبال کی تنقید پر دوسری نظر ڈالنی شروع کی اور محسوس کیا کہ مغرب کے خلاف ان کے اعتراضات محض جذباتی نہیں ان میں فکری حقیقت بھی ہے، تاہم مجموعی طور سے وہ محض ناقد نہیں معترف بھی ہیں اور ان کی تنقید اور اعتراف دونوں کی ایک معنویت ہے جسے سمجھنا ضروری ہے۔''

ڈاکٹر این میری شمل 21 اپریل 1961 کے خصوصی ''اقبال ڈے'' کے شمارے میں لکھتی ہیں:

SHARP CRITICISM

"But all those deep Western Influences did not blind Iqbal's eye to the dangers of a complete surrender to Western civillisation. On the contrary, his work is filled with sharp criticism of Western thought, and, more than that, Western politics. We must confess the some of his political views are one sided, and belong to a passed historical situation. For Iqbal, the West is, in its present situation, the personification of intellectualism, without hte spark of Divine love, and therefore dangerous, Satanic. East knows the Divine Jove but is submerged in sweet dreams, and is not awae of the dangers of Western infiltration. It is inclined to an imitation of the outward form of Western life without understanding. Its inner meaning. The outbursts of the poet againt modern Turkey and Iran must be understood from this point of view. He himself acknowledged gratefully the megthodical work of Western thinkers, and the education the had received there. But the fact that the West "cruclfles the spirit of Christ every day" by unsocial behaviour and colonisatory methods this fact, expressed in the Javidnama by the spirit of Tolstoy, has caused the bitterest attacks of the poet philosopher."

اس آرٹیکل سے ایسے تمام خیالات اور باتوں کی نفی ہو جاتی ہے جس سے اقبال کو مغرب سے

ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، علامہ اقبال کو صرف متکلم سمجھا کرتے تھے آخر کار ایک طویل عرصہ کے بعد یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ علامہ اقبال شاعر، مفکر اور فلسفی تھے۔ جس کا ثبوت ان کے بھتیجے ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے اپنی کتاب ''میرا چچا'' میں کی ہے۔ زیر نظر ڈاکٹر سلیم کی کتاب میں سے ایک حصہ دیا جا رہا ہے جو کہ ان کے چچا خلیفہ عبدالحکیم کی وفات کے بعد شائع ہوئی اس کے ساتھ ہی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' میں سے خلیفہ عبدالحکیم کے ہاتھوں لکھا ایک تعریفی مضمون بھی دیا جا رہا ہے۔

یاد رہے کہ یہ مضمون 1958ء میں لکھا اور چھاپا گیا:

''لوگ اقبال میں فکری تضاد تلاش کرتے ہیں میں خود انہیں لوگوں میں شامل ہوں جو نہ صرف یہ تضاد محسوس کرتے ہیں بلکہ اقبال فکر سے کلیۃً اتفاق بھی نہیں رکھتے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہی تضاد اور اسی قسم کی متضاد باتیں خود چچا حکیم میں بھی تھیں۔ میں جب تک نابالغ تھا طالب علم تھا اور زیادہ تر علمی باتیں سن سکتا تھا سنا نہیں سکتا تھا آراء سن سکتا تھا۔ رائے دے نہیں سکتا تھا۔ محفلوں میں شریک ہو سکتا تھا خود محفل نہیں لگا سکتا تھا مضامین میں پڑھ سکتا تھا، لکھ نہیں سکتا، ان دنوں میں نے چچا حکیم کو یہی کہتے سنا کہ اقبال ایک قادر الکلام شاعر ہے فلسفی نہیں۔ بلکہ مفکر بھی نہیں۔ ہاں ایک قسم کا متکلم ہے لیکن اس نے شعر کو ذریعہ اظہار بنا کر شاعری میں تو مقام پیدا کر لیا لیکن اس کے نظریات عجز بیان اور ژولیدگی کی نذر ہو گئے کیونکہ فلسفہ ایک وضاحت طلب مضمون ہے اور شعر وضاحت کا دشمن اور وضاحت شعر کا دشمن ہے، انہیں دنوں میں نے چچا حکیم کو یہ بھی کہتے سنا کہ اقبال کے فلسفیانہ افکار اس کے اپنے نہیں ہیں۔ خودی کا فلسفہ نٹشے اور لائبنز کا ہے۔ زمان و مکان کا تصور برگسان کا ہے۔ مرد مومن کا نظریہ نٹشے کا مافوق البشر کے تصور سے مستعار ہے اور عشق کا نظریہ جلال الدین رومی کا ہے۔ لیکن بعد کے زمانوں میں نے حکیم چچا کو بین بین کا راستہ اختیار کرتے دیکھا اور سنا یعنی مذکورہ باتیں اس انداز میں کہنے لگے کہ اقبال کی تعریف کا پہلو نمایاں ہوتا اور اس کے متضاد خیالات نظریات کی الجھی ہوئی دوریوں کو سلجھاتے ہوئے یہ کہہ جاتے کہ یہ دوریاں الجھی ہوئی نہیں ہیں۔ پھر پاکستان بنا اور چچا حکیم نے ثقافت اسلامیہ کے ادارے کی بنیاد رکھی تو ان کو اقبال کا دفاع کرنے والوں میں شامل پایا اور یہی نہیں بلکہ انہیں اقبال کے فلسفیانہ افکار کی تشریح اور اس کے فکری تضاد کو سلجھانے کے لئے فکر اقبال کے نام سے کتاب لکھتے بھی دیکھا اور جب کتاب چھپی تو انہیں بہت خوش و خرم بھی پایا کہ ان کی محنت ٹھکانے لگی۔''

The Golory of Iqbal which has made him join the rank of the Immortals' lies in the fact that he is a 'Poet of Life' and is jbroad and variegated as Life itself. His mind is not closed to any impression; the windows of his sould are open on all side. He has compared himself to a diamond of many facts. If I call him a Poet of Life one would naturally ask what is life. The simplest answer would be that Life is a goad-seking activity. From amoba to man life seeks not only t preserve itself in its status quo but to enrich and expand and perpetuste itself.

اسی طرح جیسا کہ سب ڈاکٹر این میری شمل کے نام اور ان کی خدمات جو اقبالیات کے حوالے سے ہیں، بخوبی جانتے ہیں، آپ نے اپریل 1961ء میں جب آپ پروفیسر تھیں علامہ محمد اقبال کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا:

It happens only a few times in a century, and perhaps even less, that a great personality either from East or from West tries to combine the most characteristic features of both Eastern and Western cultures. One of these out standing personalities in out centruy is Iqbal, the spiritual father of Pakistan, a man whose work has interested Western scholars more than that of nay other contemporary oriental thinker. As R.A. Nicholson said, in him "East and West met though it would be too much to say that they were united."

یہی نہیں اور بھی بہت نقاد اور سکالرز اقبال سے متاثر ہیں اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ آپ کی شخصیت اور سوچ تھی ہی متاثر کن۔ آیئے اب علامہ اقبال کے تصور مرد مومن پر ایک گہری نظر ڈالیں تا کہ ہم بھی اقبال کے افکار سے عمل کی دنیا میں نئی جہتیں تلاش کر سکیں اور سچے مرد مومن بن سکیں۔

بقول اقبال

جوانوں کے سوز جگر بخش دے
میرا عشق میری نظر بخش دے

اقبال کا مرد مومن تعارف

اقبال اپنے نصب العینی انسان کو کئی ناموں سے یاد کرتے ہیں جیسے 'مرد حر'، مرد قلندر، مرد بزرگ اور مرد مومن کی اصطلاحیں ان کی نثری اور شعری تحریروں میں ملتی ہیں۔ ''جاوید نامہ'' کا ''زندہ رود'' بھی اسی زمرے میں شامل ہے لیکن یہ سارے کے سارے نام ایک ہی تصوراتی پیکر سے وابستہ ہیں اور وہ مثالی پیکر ''مرد مومن'' ہی کا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر چند مستند ناقدین کی آراء درج کرتا ہوں۔

''بندہ مومن'' یا ''مرد حر'' ایک ہی فرد کے دو نام ہیں۔ فقیر اور عشق کے امتزاج سے جو ہیئت ترکیبی بنتی ہے وہی بندہ مومن ہے۔''

''اقبال کے مطابق زمین پر حکومت الٰہیہ سے مراد کم و بیش ایسی جمہوریت ہے جو تا حد امکان کمیاب اور چیدہ اشخاص پر مشتمل ہوگی۔ ایک مرد دانا کی حکومت گدھوں کی کابینہ کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔ ''مرد کامل''، ''مرد بزرگ''، ''مرد مومن'' یا مثالی انسان اور ''مرد دانشمند'' سب کے سب نام فلسفہ اقبال کے ایک ہی شخص سے وابستہ ہیں جو صاحب خودی ہے۔

اب چند ایسی رائیں پیش کی جاتی ہیں جن میں بظاہر التباس اور تضاد موجود ہے لیکن بباطن نقاط نظر میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔

انسان کامل کے لیے اقبال نے نظم اور نثر میں بہت سی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ خلیفۃ اللہ فی الارض، مرد تمام، مرد مومن، درویش، فقیر، قلندر، ان سب اصطلاحات ممکن ہے کہ معنوی طور پر بہت ہی ذرا سا فرق ہو مگر ان سب سے انسان کامل ہی مراد ہے اور اس کی خصوصیات ان سب میں موجود ہیں۔ قلندر کی اصطلاح اقبال نے فارسی زبان سے چنی ہے۔''

میرے خیال میں بحیثیت مجموعی یوسف حسین کا یہ خیال صحیح ہے کہ قلندر کی اصطلاح میں ایک رومانی پرتو کی جھلک ہے۔ قلندر انسان کامل کے رومانی پہلو کی نمود ہے۔ ''مرد مومن'' کی اصطلاح قرآنی اور اسلامی ہے ''مرد مومن'' کی فراست قرآنی ہے لیکن یہ فراست انسان کامل کے عام تخیل کا جزو بن گئی ہے۔''

اقبال کا مرد حر یا قلندر وجود کی آخری منزل نہیں۔ خودی یا وجود کی اعلیٰ ترین منزل مرد کامل یا انسان کامل کا مقام ہے۔''

''اقبال کا انسان کامل یا مرد حر مرد مومن لا ء کے ساتھ الا کا بھی قائل ہے۔''

''اقبال کا مرد کامل'' یا ''مرد فقیر'' ایک صاحب خودی ہے۔

ڈاکٹر عزیز احمد کا خیال کہ تمام اصطلاحوں سے مراد مرد کامل ہی ہے اپنی جگہ پر بجا ہی لیکن خود اقبال نے اکثر و بیشتر ''مرد مومن'' ہی کے پیکر میں اپنے تصورات متحجر کیے ہیں اور تکمیل کی آخری صورت ''مرد مومن'' ہی کو تصور کرتے ہیں۔ اس لیے میرے خیال میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مرد تمام، درویش، فقیر، قلندر، مرد آزاد، مرد حق، مرد حکم، نائب حق، انسان کامل، ان سب سے مراد ''مرد مومن'' ہی ہے۔ کیونکہ اس کی فراست قرآنی ہے اور اقبال اس کی سند قرآن کریم ہی سے حاصل کرتے ہیں البتہ مرد قلندر، مرد مومن کی تکمیل ذات کا ایک مرحلہ ہے منزل نہیں۔ جس کی تصدیق اشفاق حسین کے بیان سے ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بھی جہاں کہیں متعلقہ موضوع پر گفتگو کی ہے وہاں ''مرد مومن'' یا مرد کامل کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کردار شریعت کا رہین منت ہے اس لیے بھی اسے ''مرد مومن'' کی قدیم اصطلاح ہی سے موسوم کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ مرد مومن، مرد مسلمان اور انسان کامل کی اصطلاحوں سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا ابو الکلام آزاد نے بعض احادیث کی تشریح کرتے ہوئے ایمان کے تین درجوں کی جو تشریح و توضیح کی ہے وہ نہایت دلچسپ اور بصیرت فروز ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جو تین درجے ایمان کے بتلائے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

''تم میں سے جب کوئی شخص برائی سے روکے تو چاہئے کہ اپنے ہاتھ سے کام لے کر اسے دور کر دے، اگر اس کی طاقت نہ پائے تو دل سے اور یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے۔

''یہ جو مقام دعوت و عزیمت ہے وہی مومن کو اور مرد مسلمان کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف پرانی فرسودہ دنیاؤں کی مذمت کرتا ہے بلکہ نئی دنیاؤں کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں جو مصیبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں وہ بخندہ پیشانی برداشت کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب اقبال مومن کہتے ہیں تو ایمان کا سب سے بلند درجہ ان کے پیش نظر ہوتا ہے یعنی مقام دعوت و عزیمت، اور یہ مقام ان ہی کو حاصل ہوتا ہے جنہیں رسول پاک سے بے پناہ عقیدت ہوتی ہے کیونکہ اس کے بغیر تسخیر کائنات کا فریضہ ادا کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تو مومن اور مسلمان وہ انسان کامل ہے جو ایمان کے افضل ترین مقام پر فائز ہے، صاحب علم و عمل ہے۔ وارث ذکر و فکر ہے۔ اس کی بصیرت کی بنا رسول پاک کا اسوۂ حسنہ ہے اور اس کی فراست کی بنیاد رسول پاک کے اعمال و افکار و احادیث پر استوار ہے۔'' مرد مومن اور مرد مسلمان کا جو رشتہ رسول پاک سے ہے اسی کو ملحوظ رکھ کر اقبال جب انسان کامل کے لیے ان علامتوں کا ذکر کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ عقیدت میں ان کے الفاظ سرشار ہیں۔ دراصل مومن و مسلمان کی تعریف و توصیت کرتے وقت ان کے سامنے وہ معیار انسانیت ہوتا ہے جسے تاریخ اور عقیدت سید مکی و مدنی العربی کے نام سے یاد کرتی ہے۔''

قاضی عدیل عباسی نے اپنی کتاب ''اقبال کا فلسفہ حیات اور شاعری'' میں اس ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قابل غور ہیں۔ کیونکہ ان کے بیانات سے اصطلاحوں کے الجھاوے تقریباً کھل جاتے ہیں وہ مرد کامل اور مرد مومن سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرد کامل عقیدہ توحید الٰہی سے محبت سرمدی رکھتا ہے وہ خدا مست ہے اور اپنی انفرادی جماعتی خودی کو مکمل کرنے کے لیے قوانین و اخلاق عالیہ کا پابند ہوتا ہے تا کہ شر کا گزر نہ ہو اور اس آبدار موتی پر آلودگی معصیت کی کوئی لکیر نہ ہو۔ مرد کامل چونکہ عقل سے تسخیر فطرت کرنے کے بعد نفس کی آلودگی میں مبتلا ہو کر اپنی کاملیت اور اکملیت کو نہ صرف یہ کہ عروج پر نہیں پہنچا سکتا بلکہ ممکن ہے کہ وہ جنس گراں مایہ کو بالکل کھو کر اہلیسیت کا شکار ہو جائے اس لیے اس کو تسخیر فطرت کے ساتھ ساتھ تسخیر نفس کی فکر بھی دامن گیر ہوتی پس وہ خالق فطرت کے دیے ہوئے قوانین کے حصار میں اپنے کو محفوظ کر لیتا ہے اور اپنی پختگی اور بے راہ روی سے بچنے کے لیے نیابت الٰہی کو معیار حق، اسوۂ حسنہ ٹھہراتا ہے اور اس طرح وہ اس کی اتباع میں لگ جاتا ہے کہ جس نے ''روزگار تازہ آئین'' پیدا کیا، جو رحمت اللعالمین تھا اور جس نے خالق کائنات کے دیئے ہوئے فرائین کو اس طرح مکمل و مدون کر کے دے دیا ہے کہ تیرہ سو برس گزرنے کے بعد کبھی اس میں کوئی تحریف نہیں ہوتی اور نہ اس کے ایک نقطہ میں کوئی فرق آیا۔ حاصل کلام یہ کہ مرد کامل ''مرد مومن'' ہی ہو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اب تک کی بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اقبال نے اپنے نصب العینی انسان کے لیے جتنی بھی اصطلاحیں استعمال کی ہیں ان تمام اصطلاحوں سے ان کی غرض ''مرد مومن'' یا انسان کامل کی صفات کو ہی اجاگر کرنا ہے۔ مرد مومن وہی ہے جو مرد کامل ہے کیونکہ مرد مومن بہر حال مرد کامل ہی ہوتا ہے اب تک کہ اسلامی روایات اور تاریخی پس منظر میں اقبال کو جو نام بھی اپنے ہیرو کے شایان شان معلوم ہوتا ہے اسے اسی نام سے پکارتے ہیں۔ بعض اصطلاحیں ''مرد مومن'' کی آن بان کو واضح کرتی ہیں تو بعض اس کے مزاج کے کسی مخصوص گوشے کی عکاس ہیں۔ بعض میں اس کا ہنگامی تیور نظر آتا ہے تو بعض اس کی زندگی کے کسی مخصوص مرحلے کے غماز ہیں۔ جیسے فقیری مومن کی شان ہے، قلندری اس کا انداز زیست ہے، آزادی اس کا پیدائشی حق ہے، نیابت اس کا مقدر ہے، اکملیت اس کا مقصد ہے، بزرگی اس کی شان ہے۔ جامعیت اور غایت کے اعتبار سے میں نے اور اصطلاحات کی بہ نسبت ''مرد مومن'' کی اصطلاح کو ہی زیادہ جامع و مانع تصور کیا ہے اور خود اقبال بھی اپنے ہیرو کو کمال کی آخری منزل پر ''مرد مومن'' ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہاں تفصیل مانع ہے (اس لیے گریز چاہوں گا کیونکہ) پھر یہ ضمنی گفتگو تو محض اس لیے زیر بحث آ گئی تھی کہ قارئین کو مغالطہ نہ ہو ورنہ اقبال کی استعمال کردہ اصطلاحوں میں سے کسی نام سے ''مرد مومن'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

حکیم خود آگاہ اور مرد مومن:

سقراط کا حکیم خود آگاہ ایک ایسا فقیر بے نوا ہے جو عقل کی راہ سے خدا کے قریب پہنچنے کے لیے کوشاں ضرور ہے۔ لیکن اس کے مقدر میں حضوری نہیں ہے، یہ خبر تو رکھتا ہے لیکن نظر کے باب میں کمزور ہے، اس میں مرد مومن کی سی جرات ابھرتی ضرور ہے لیکن معاشرے کی قلب ماہیت کے لیے اس کے پاس کوئی ٹھوس دستور العمل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس توحید خالص کی کوئی ایسی روایت نہیں ہے۔ جس کی بنا پر اس میں باطل سے برسر پیکار ہونے کی صلاحیت پیدا ہو اور ذوق تصادم کا جذبہ شدت اختیار کر سکے۔ اس لیے یہ اپنی قوم کا معتوب ہونے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان کو رام کرنا مشکل ہے لیکن ایک خلش، صداقت کی سچی تڑپ اس کے اندر موجود ہے۔ یہ پوری آب و تاب کے ساتھ اس کی رگ و پے میں بجلی کی طرح کوندتی ہے۔ لیکن یہ لہریں جتنی بھی تیز ہوں اس کا کردار انہیں جذب کر کے کسی مخصوص منزل تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اس لیے ایک گونگے اور متجسس انسان کی طرح خود کو دار و رسن کے حوالے کر دیتا ہے اس میں مرد مومن ہونے کی سکت ہے لیکن اسے منزل کا کوئی واضح شعور نہیں اس لیے یہ ششش و پنج میں گرفتار ہے اور مرد مومن کی صفات کاملہ سے محروم۔

مختار مقنن اور مرد مومن:

میکیا ویلی (Machiavelli) کا مختار مقنن (Omnipotent Lagislator) محض ہوس اقتدار کا پیکر ہے۔ یہ اپنی خودی کی تشکیل کا کوئی واضح نصب العین پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مرد مومن کی طرح اس کے پاس قوت، فراست، جسمانی اور روحانی عظمت اور تزکیہ کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں ہے اور نہ اس کے سامنے حصول اقتدار کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا مقصد ہے جس کی بنا پر یہ خود کو سود مند ثابت کر سکے۔ یہ محض بے عنان آرزوؤں کی تجسیم ہے، اس کی شخصیت کا عملی پہلو شر سے ہم آہنگ ہے کیونکہ حصول اقتدار اور جہاں بانی کے نغمے میں یہ تمام انسانوں کی زندگی سے کھیل جانے پر

کے چکر میں ہے لیکن اقبال کا مردِ مومن محض اپنی ذات کی خاطر کچھ بھی کرنے کو آمادہ نہیں وہ سب کچھ خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے۔ البتہ اس اصول میں اس کی شخصی بقا اور فقر ادبیت کا راز بھی مضمر ہے۔ اس صلے میں وہ خدا کا قرب اور اس کی نیابت حاصل کرتا ہے۔ نتیجے کے طور پر اس کی قلندری اور درویشی شاہنشی اور فقیری کی صفات اسے لافانی بنا دیتی ہیں۔ مردِ مومن کی طاقت فراست کے تابع ہے۔ یہ فراست اجتماعی بہبود سے ہم آہنگ ہے۔ یہ کسی کا حق چھیننے کے درپے نہیں بلکہ کمزوروں، غریبوں اور بے کسوں کے چھینے ہوئے حقوق کی بازیابی کا ذمہ دار ہے۔ یہ اپنے خونِ جگر سے معاشرے کی آبیاری کرتا ہے جب کہ مختارِ مطلق معاشرے کا لہو نچوڑ کر اپنی تن پروری میں مصروف ہے۔ مختارِ مطلق اپنی مختاری کی خاطر کروڑوں افراد کو غلام بنانا چاہتا ہے، جب کہ مردِ مومن ساری دنیا کے انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نجات دلا کر آزادی کی لذتوں سے ہمکنار کرنا چاہتا ہے۔ مختارِ مطلق خود پرست ہے اور مردِ مومن خودنگر خدا پرست، اول الذکر وطن پرست تو آخر الذکر رنگ، نسل اور وطن کے بتوں کو توڑ کر عالمگیر اخوت ومساوات کا حامل ہے۔

کارلائل کا ہیرو اور مردِ مومن:

کارلائل کا ہیرو بھی مختارِ مطلق کا چربہ ہے۔ فرق یہی ہے کہ اپنی بداعمالیوں کے لیے یہ تاریخی شعور کا سہارا لیتا ہے اور تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اس پر مکمل بھروسہ رکھتا ہے، تاریخ کے مطالعے سے عروج وزوال کے نتائج اخذ کر کے دنیا کو قیصریت کی بندگی پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے حافظے میں یہ بات ہرگز نہیں کہ تاریخ کے اوراق چند مٹھی بھر بلند قامت لوگوں کے امین ہیں لیکن اس کے پس پشت خلقِ خدا کا ایک جم غفیر ہے۔ پوری انسانی برادری پر کسی تنہا انسان کا اپنے من مانے آئین کی روشنی میں مطلق العنان حکومت کرنا ظلم اور جبر کے مترادف ہے۔ کارلائل ملوکیت کا پیامبر اور حامی ہے لیکن مردِ مومن کا نعرہ لاملوک لگاتا ہے اور خدا کی دھرتی پر نہ کسی تنہا انسان کی حکومت کو گوارا کرتا ہے اور نہ جمہور کی بلکہ وہ خلافتِ الٰہیہ کا علمبردار ہے وہ ایک ایسے دستور العمل کو نافذ کرتا ہے جس میں ایک ضابطۂ حیات موجود ہے۔ اس طرح ہیرو اپنی تمام ابلیسی قوتوں کے باوجود مردِ مومن کا ہم پلہ نہیں ہے۔

فاؤسٹ اور مردِ مومن:

گیٹے (Geethe) کا فاؤسٹ تشکیک وتذبذب کا شکار ہے، اسے زندگی سے صرف لگاؤ ہی نہیں ہے بلکہ والہانہ حد تک عشق ہے بقول جولیس چیکس روئی (Jules Chaix Ruy) فاؤسٹ کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کے بدترین دشمن ابلیس کے پھیلائے ہوئے خوف وہراس اور وسوسوں کے ساتھ شدید جنگ کی جائے۔ میفوسٹفلس (Mephistophils) کا پیکر اسی تشکیک کا مظہر ہے جو ابتداء سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں عقائد کا موضوعِ سخن ہے۔ دراصل یہ انسان کا اپنا دل ہی تو ہے جو مریضانہ حرکتوں سے شکوک وشبہات کی موسوم دنیا کی تخلیق کرتا رہتا ہے کیا ہم محض تائید ایزدی کی بنا پر نجات حاصل کر سکتے ہیں، یا اس کے حصول کے لیے ہمیں عملِ پیہم سے کام لینا ہوگا یا یہی تاریکی ہمارا مقدور ہے۔ گیٹے اس سوال کا جواب دیتے وقت لوتھر اور ایراسمس دونوں کے بین بین ایک نئی راہ نکالتا ہے وہ یہ کہ اگر عملِ پیہم کی بڑی اہمیت ہے تو عقیدے کی بھی کم اہمیت نہیں ہے کیونکہ اس سے جذبۂ عمل کو سہارا ملتا ہے، انسان کا مطالعہ یہ ہے کہ وہ کیا ہے؟ لیکن اگر کوئی اس پر بھروسہ کرتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ جہد البقا کے وسیلے سے خود کو متعارف کرتا ہے اور یہی جہد مسلسل ذریعۂ نجات بھی ہے۔ اسی جذبۂ عمل سے سرشار ہو کر اس سلسلے کو مزید دراز کرنے کے لیے وہ اپنی روح کو شیطان کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے، زندگی لیتا ہے مگر روح بیچ دیتا ہے۔ پہلے پہل ان تصورات میں فاؤسٹ عملِ پیہم کے ذریعے حیات کی تشکیل کرنے کے بعد ہی نجات کی بات سوچتا ہے اسے حیات سے اس لیے عشق ہے کہ وہ عمل سے عبارت ہے اور عمل اس لیے مفید ہے کہ اس سے حیات کے تیرہ وتاریک گوشوں تک روشنی پہنچتی ہے۔ فاؤسٹ عمل سے سرچ لائٹ کا کام لیتا ہے۔ لیکن مردِ مومن کی طرح اس باب میں کوئی واضح نقطہ نظر نہیں رکھتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا خدا تثلیث کی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ مردِ مومن تو توحیدِ خالص کی ضربِ کاری سے "لا" کی ایک ہی لاٹھی سے خوف وہراس اور وسواس کے تمام بت توڑ ڈالتا ہے اور ان بتوں کی جگہ قلب میں خدا کی نور الانوار ہستی کو جذب کر لیتا ہے جس سے وہ سرچ لائٹ (Search Light) کا کام لیتا ہے اور سارے حقائق اس پر منکشف ہوتے ہیں۔

فاؤسٹ جذبۂ عملِ پیہم اور تجسس کے ساتھ ساتھ ایک عقیدے کا بھی قائل ہے اور یہی تینوں صفات اسے مردِ مومن سے مماثل کرتی ہیں لیکن یہ مماثلت اس لیے دیرپا نہیں ہوتی کہ مردِ مومن ایک ایسا مست قلندر ہے جسے دیکھ کر ابلیس لرزتا ہے اور اپنے پیشے کا لطف حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اسے بھی ورغلانے کے لیے ایک ایسا حریف چاہیے جو کچی مٹی کا نہ بنا ہو بلکہ مردِ آہن ہو۔ شیطان کو جب مردِ مومن جیسا حریف ملتا ہے تو اس پر یہ حقیقت وا ہو جاتی ہے کہ سیدہ ہذا کو بہکانے میں سوائے خود کو لہولہان کر لینے کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مردِ مومن شیطان سے مقابلے کے لیے توحیدِ خالص کے حربے کے ساتھ عشقِ رسول کا جذبہ بھی رکھتا ہے جو جذبہ اس کے لیے شمعِ ہدایت بن جاتا ہے اور رسولؐ کے تصور سے شیطان دور بھاگتا ہے۔

بہرکیف فاؤسٹ کا اندازِ نظر بعد الطبیعی سے زیادہ نفسیاتی (Philosophy) ہے اور جذبۂ عمل اور حیات کا یہ عاشق نبی کئی صفات کی وجہ سے مردِ مومن کا ہمسفر معلوم ہوتا ہے دونوں میں واضح فرق توحید ورسالت پر ایمان وایقان کا ہے اور یہ فرق دونوں کی راہ اور منزل جدا جدا کر دیتا ہے۔

اُتھرت برگیہ اور فوق ذہن:

فاؤسٹ کے برعکس اروندو گھوش کا "فوق ذہن" (Supermind) دل کی بجائے ذہن کو اپنی آماجگاہ بناتا ہے اور قدیم یونانی مفکروں کی طرح اپنی ہندوستانی روایات کے ساتھ عقل کے ذریعے عرفان حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کا فوق ذہن "ہمادست" کے ویدانتی جال میں پھنس جاتا ہے اور شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ بہرکیف "فوق ذہن" ویدانتی فکر کے ترکِ عمل کی تعلیم کے پرخچے اڑا دیتا ہے اور ترکِ عمل کے تصور کو ختم کر کے عمل کی تلقین ہی نہیں کرتا بلکہ فعال زندگی کی تلاش ہی اس کا مقصد ہی اس کا مقصد ہے۔ اس کے یہاں عبادت کا مفہوم بے عمل اور کنارہ کشی نہیں ہے بلکہ وہ قربِ الٰہی سے اقبال کے مردِ مومن کی طرح اپنی خودی کو استوار کرنے میں سرگرم ہے، فوق ذہن بھی ابدی بقا اور تخلیقی فعلیت (Creative Activity) کا قائل ہے۔ اس کی شاہکار نظم سانہ تری سے چند اشعار کا مفہوم پیشِ خدمت ہے

یک بہ یک ایک سحر بدوش قوت اسیر والم ہو جاتی ہے جو
زیرِ نقاب الوہیت کے لازوال عزم کو متحرک کرتی ہے۔
عبادت ایک حکیمانہ عمل، ایک نیک خیال جو انسان کو
ماورائی قوت سے منسلک کرتی ہے تب معجزہ معمول
بن جاتا ہے۔
ایک عظیم عمل دھارے کا رخ بدل دیتا ہے
ایک مجرد خیال، قادرِ مطلق بن جاتا ہے۔

"ایک مجرد خیال قادرِ مطلق بن جاتا ہے" اروند کے "فوق ذہن" کی گرہیں یہاں کھل جاتی ہیں، بہرحال فوق ذہن جسے اروند "یوگی" بھی کہتا ہے۔ یہ ریاضت اور ضبطِ نفس کے ذریعہ دیدارِ حق کا طالب ہے اور مردِ مومن بھی لیکن دونوں کا ذہنی پس منظر جداگانہ ہے۔ مردِ مومن اسلامی عقائد اور روایات کا امین ہے، تو یوگی ویدانت کی نئی تشریح ونتیجہ۔ اس لیے دونوں کا مجموعی مزاج ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ البتہ یہ یوگی ہمارے عجمی صوفی سے بہت قریب ہے۔ خصوصاً ہمہ دست کا قائل صوفی اسے اپنے سے بہت زیادہ متمائز نہیں پائے گا۔ لیکن اقبال کا مردِ مومن اسلام کے تیکھے نقوش کا حامل

بھاگوت گیتا کا نصب العین انسان یا استھت پرگیہ اپنے ہم عصر نقاطوں سے متصادم ہے۔ ان سے پوری شدت کے ساتھ ٹکراتا ہے لیکن اس کے سامنے بھی مکتی کی تختی آویزاں ہے اور اپنے فرائض منصبی کو پورا کرتے وقت بڑی خود ضبطی اور نفس کشی سے کام لیتا ہے آواگون کے لامتناہی تسلسل سے نجات پانے کی غرض سے نیک کام کرتا ہے وہ عمل صالح کا اس لیے طرفدار ہے کہ اسے دوبارہ پیدا ہونے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ وہ روحانی ارتقاء میں محض اس وجہ سے مصروف ہے کہ وہ جیون مکت ہو جائے۔ بہر حال اس کی مکتی کے پس پشت عمل اور خیر وشر کا ایک معیار ہے۔ وہ ظلم اور نا انصافی کے خلاف جنگ کرنا عین انصاف سمجھتا ہے اور اس باب میں خود کو مایا کے پھندوں سے نکالنے کا متمنی ہے، روح اور جسم میں وہ بعد تصور کرتا ہے۔ لیکن روح کی ابدیت کا قائل ہے۔ بھلے ہی اس کی ارتقا کے مرحلے وہ عمل تناسخ کے ذریعے ہی کیوں نہ طے کرے۔

زندگی کو بے آرزو کر کے ہی فنا کا مقام حاصل کرنا اس کا مقصد ہے وہ مرد مومن کی طرح ''سوز وساز و درد وداغ وجستجو'' کا قائل نہیں بلکہ بے علائق ہونا اس کی اکملیت کی دلیل ہے:

''یوگی اپنے گیان کی روشنی میں عمل پیرا ہوتا ہے اور دل سے دونوں عالم کے خیال کو ترک کر کے اپنی روح کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے اور اس کی آتما پر اتما سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ وہ شیریں بیان اور نیک گفتار ہوتا ہے۔ اس کے اندر نہ تو کسی کا خوف ہوتا ہے اور نہ وہ کسی سے غصہ ہوتا ہے، نہ اسے دنیا سے محبت ہوتی ہے اور نہ وہ دنیا کے جھگڑوں سے بیزار ہوتا ہے نہ تو اسے کسی سے لگاؤ ہوتا ہے اور نہ کسی کے تئیں اسے نفرت ہی ہوتی ہے اور جو ہر صورت سے بے آرزو ہو جاتا ہے، اسے ہی استھت پرگیہ کہتے ہیں۔''

''یعنی وہ ایک بے غرض مرد آزاد ہے جس کی ذات جذبات سے عاری ہے نیک وبد اور رنج وراحت سے بلند وبالا ہے نہ تو اسے خویش اقارب کی محبت اپنے دام میں گرفتار کر سکتی ہے اور نہ ہی اس میں نفسیاتی لذات کی رغبت ہوتی ہے۔ مساعد اور نا مساعد حالات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ نہ کسی کی تعریف میں مطلب انسان ہوتا ہے اور نہ کسی کی غیبت سے اپنی زبان آلودہ کرتا ہے وہ سارے جہان اور تمام نفسانی جذبات سے بے تعلق ہوتا ہے، اسے ہمیشہ یہی دھیان رہتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب خدا کی مرضی سے ہی ہو رہا ہے اس لیے وہ محض اپنا کام کرتا ہے اور نتائج سے بے نیاز رہتا ہے۔''

مختصر یہ کہ اپنی خصوصیات کی روشنی میں استھت پرگیہ بھی ایک مطمئن فقیر اور صوفی ہے جو اس دنیا سے کنارہ کش ہونے کی شدید رغبت رکھتا ہے تمام علائق سے قطع تعلق کر کے محض خدا سے لو لگاتا ہے۔ دنیا کے ہنگاموں سے اسے کوئی مطلب نہیں رہ سکتا، انہیں ہنگاموں میں تو اسے زندگی کا راز سمجھ میں آتا ہے اور تصادم و پیکار کی اس دنیا میں شریک ہو کر وہ اپنی خودی کو پختہ کرتا ہے، خدا کی راہ میں مزاحم قوتوں کو پسپا کرنے کے لیے تلوار بھی اٹھاتا ہے اور راتوں کو اپنے آنسوؤں سے مصلیٰ بھی تر کرتا ہے۔ اس کے لیے نماز بھی عبادت ہے اور یتیم کی دلجوئی بھی عبادت و وظیفہ زوجیت بھی عبادت کے طور پر ادا کرتا ہے اور خلوت بھی اسی جذبے سے اختیار کرتا ہے۔ عمل پیہم کی اسی سعی میں وہ خود کو خدا سے قریب تر کر لیتا ہے، وہ کسی رشتے کو توڑتا نہیں یہ اور بات ہے کہ خدا کے نام پر انہیں چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ارتقائے تخلیق کا قائل ہے اسے عمل تناسخ کی فکر نہیں ستاتی وہ نجات سے زیادہ حیات اور حیات سے بڑھ کر دیدار تن کا آرزو مند ہے۔ وہ موت کو موت تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ زندگی کا ہی ایک مرحلہ تصور کرتا ہے۔ اس لیے جیون مکت کا تصور بھی اس کے عقیدے سے بعید ہے۔ وہ تو مرنے کے بعد بھی ارتقاء کی منزلوں سے گزرتا ہے۔ اس لیے جتیا محض اس لیے ہے کہ کہیں مر نہ جائے۔ مجموعی طور پر استھت پرگیہ کا مزاج سلبی ہے اور مرد مومن کا ایجابی ایک حیات سے گریز کی طرف مائل ہے تو دوسرا حیات کو نعمت تصور کرتا ہے۔ نعمت اس لیے کہ اس عرصے میں وہ اپنی زندگی کو پختہ تر کر لیتا ہے یہاں تک کہ لازوال بن جائے۔

''فوق البشر'' جیلی اور رومی کا ''انسان کامل'' اور ''مرد حق'' اور ''مرد مومن''

ہبوط آدم اور انسانی صفات کی تعین میں اقبال نے مولانا عبدالکریم جیلی کے ''انسان کامل'' سے خال خال اثرات قبول کیے ہیں۔ عبدالکریم جیلی تخلیق آدم اور ابلیس کے باب میں رقمطراز ہیں۔

''حق تعالیٰ نے اسے کہا تھا کہ اے عزازیل! میرے سوا کسی کی پرستش نہ کرنا۔ پھر جب آدم کو پیدا کیا اور ملائکہ کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کریں تو ابلیس پر یہ عمل مشتبہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر آدم کو سجدہ کروں گا تو غیر خدا کا عابد بنوں گا۔ یہ نہ جانا کہ جس نے امر الٰہی کے بموجب سجدہ کیا۔ خواہ وہ سجدہ غیر کے لیے ہو، وہ سجدہ خدا ہی کے لیے ہوتا ہے۔ اس خیال سے وہ سجدے! اسی تلبیس کے ممکنہ کی وجہ سے اس کا نام ابلیس پڑ گیا۔ پھر جب اس سے حق تعالیٰ نے کہا کہ تجھے کون سی چیز اس شخص کو سجدہ کرنے سے مانع رہی جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا خدا تعالیٰ کے قول کے جواب میں ابلیس بولی کہ ''میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے۔ ابلیس کا یہ جواب اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دربار الٰہی کے آداب سے سب سے زیادہ واقف تھا اور سوال کے مناسب جواب کو خوب جانتا تھا۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ نے اس سے مانع کا سبب نہیں پوچھا اگر ایسا ہو تو سوال کی صورت یہ ہوتی کہ تو اس کو سجدہ کرنے سے کیوں رکا رہا جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا لیکن خدا تعالیٰ کو مانع کی ماہیت مطلوب تھی۔''

اقبال نے بھی آدم کے اس فراق سے سوز وساز اور درد وداغ کا تصور قائم کیا اور شعور و آگہی اور آدم کی مختاری کا خیر مقدم کیا۔ شیطان کے انکار سے اختیار کا پہلو نکالا اور جیلی کے تصورات کو مزید روشن کر دیا اور تقدیر کے روایتی مفہوم کو قطعاً بدل دیا۔ اس کے علاوہ ابلیس اقبال کے یہاں ایک رومانی کردار کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ اور بڑا دیدہ زیب ہے۔ اس موضوع پر ابھی گفتگو مقصود نہیں ہے ورنہ اقبال کا تصور ابلیس قطعاً منفرد اور دلچسپ ہے۔

عبدالکریم جیلی نے انسانی وجود سے متعلقہ صفات کا تجزیہ یوں کیا ہے۔

''جان کی عظمت آگ ہے، علم پانی ہے، قوی ہوا ہیں، حکمت مٹی ہے، یہ چار عناصر ہیں جن سے ہمارا جوہر یکتا تیار ہوا ہے۔ اس جوہر کے دو عرض ہیں ایک ازل دوسرا ابد اور اس کے دو وصف ہیں، ایک قدم دوسری حدوث، اور اس کے دو اسم ہیں۔ ایک رب دوسرا عبد اور اس کے دو رخ ہیں۔ ایک ظاہر اور وہ دنیا ہے، دوسرا باطن ہے اور وہ آخرت ہے، ایک وجوب اور دوسرا امکان اور اس کے دو اعتبار ہیں، ایک وجوب اور دوسرا امکان اور اس کے دو اعتبار ہیں، پہلا اعتبار یہ ہے کہ اپنے حق میں موجود اور غیر کے حق میں مفقود ہو۔ اس کے لیے دو معرفتیں ہیں پہلی معرفت یہ کہ اول مرتبہ میں اس کی وجوبت اور دوسرے مرتبہ میں اس کی سلبیت ہو دوسری معرفت اس کے برعکس ہے۔

''جیلی کے نزدیک'' ''اسم'' کا جو مطلب ہے اس کی خود اقبال نے بڑی اچھی طرح وضاحت کی ہے اسم مسمّی کو ہماری فہم میں جما دیتا ہے، ذہن میں اس کی تصویر کھینچ دیتا ہے، تخیل میں اس کو مستحضر کرتا ہے۔ اسم ایک آئینہ ہے جو ہستی مطلق کے تمام اسرار کو منکشف کر دیتا ہے یہ ایک روشنی ہے جس کے ذریعے خدا اپنے آپ کو دیکھتا ہے''

''اسم کی بنا پر اقبال نے جیلی کے ان مباحث کا خلاصہ سمجھایا ہے جو اس نے ہستی خالص ہونے کے اپنی مطلقیت کو چھوڑنے کے بعد تین منازل سے گزرتی ہے۔ (1) احدیت (2) غیریت (3) ذاتیت۔ پہلی منزل میں تمام اغراض وعلائق کا فقدان ہوتا ہے پھر بھی اس کو واحدی کہتے ہیں دوسری منزل میں ہستی خالص تمام مظاہر سے آزاد رہتی ہے اور تیسری منزل انفصال ذات باری ہے یہ تیسری منزل اسم اللہ کا دائرہ ہے۔ یہاں ہستی خالص کی ظلمت کو منور کیا جاتا ہے فطرت اس کے سامنے آ جاتی ہے ہستی مطلق ذی شعور ہو جاتی ہے۔

ارتقاء مطلق کے تین منازل کے مقابل میں انسان کامل کے روحانی تادیب کے بھی تین منازل ہیں لیکن انسان کامل کے عمل ارتقا کو معکوس ہونا چاہیے کیونکہ اس کا عمل ارتقا ترقی کی طرف ہے اور ہستی مطلق تو دراصل تنزل کی طرف آتی ہے اپنی روحانی ترقی کی پہلی منزل میں وہ اسم پر استغراق

میں قدم رکھتا ہے۔تیسری منزل میں وہ جوہر کے دائرے میں داخل ہوجاتا ہے یہاں پہنچ کر وہ انسان کامل بنتا ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں اقبال کے یہاں تربیت خودی کے جو مراحل ہیں ان میں جیلی کے فیض سے انکار کرنا حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے۔عزیز احمد نے ''اقبال نئی تشکیل'' میں دبی زبان سے یہ کہا کہ ''اقبال نے تربیت خودی کے تین مراحل، اطاعت ضبط نفس، نیابت الٰہی غالباً یہیں سے مستعار لیے ہیں۔'' حالانکہ غالباً سے زیادہ یہی گمان غالب ہے کیونکہ اقبال اپنے تحقیقی مقالے۔ کے سلسلے میں اس تصور سے پوری طرح آشنا ہو چکے تھے۔نیز تیسری منزل نیابت الٰہی کے متعلق خود عبدالکریم جیلی نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھنے کے بعد بات اور صاف ہوجاتی ہے۔ وہ کامل انسانیت یا نیابت الٰہی کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''پھر جان کہ اللہ تعالیٰ نے اس اسم کو انسان کے لیے ایک آئینہ بنایا ہے پھر جب اپنے منہ کو اس آئینہ میں دیکھا تو اس پر اس بات کی حقیقت کھل گئی کہ ''کان اللہ ولم یکن معہ'' بس اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی اور اس پر ظاہر ہوگیا کہ اس کی شنوائی اللہ کی شنوائی ہے اور اس کی آنکھ اللہ کی آنکھ ہے اور اس کا کلام اللہ کلام ہے اور اس کی حیات اللہ کی حیات اور اس کا علم اللہ کا علم اور اس کی ارادت اللہ کی ارادت اللہ کی ارادت اور اس کی قدرت اللہ کی قدرت:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا و کارساز
خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
نقطہ پرکار حق، مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
(اقبال)

متذکرہ بالا اقتباس اور اقبال کے مذکورہ بالا اشعار کو غور سے پڑھیے آپ خود اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ اشعار فکر جیلی سے اکتساب فیض کے غماز ہیں البتہ جیلی کے تصورات خالصتاً فلسفیانہ ہیں۔اور الجھے ہوئے ہیں جسے اقبال نے شعری لباس عطا کر کے اس کی تاثیر میں اضافہ کر دیا ہے۔جیلی کے انسان کامل کی اکملیت کی تیسری منزل میں فقیر اور قلندر کی شان بھی جلوہ ریز ہے۔جیلی کا مندرجہ ذیل بیان غور طلب ہے:

''جس کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے، اللہ اس شخص کی طرف سے اس شخص کو جواب دیتا ہے، اس کو پکارتا ہے، جب وہ غضب میں آتا ہے تو خدا بھی غضب میں آتا ہے اور جب وہ راضی ہوتا ہے تو خدا بھی راضی ہوتا ہے۔''

البتہ یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے وہ یہ کہ عبدالکریم جیلی نے مرد کامل کی جو خصوصیات گنوائی ہیں وہ سب کی سب رسول اکرمؐ کی صفات سے وابستہ ہیں اور اس کا وہ کھلا اعتراف اس طرح کرتا ہے:

''انسان کامل وہ قطب ہے جس پر اول سے آخر تک وجود کے فلک گردش کرتے ہیں اور جب سے وجود کی ابتدا ہوئی اس وقت سے لے کر ابد الاباد تک ایک ہی شے ہے اس کا اصلی نام محمدؐ ہے پھر ہر زمانے میں اس کا ایک نام ہے۔''

اقبال کا مرد مومن جیلی کے اس نظریے میں تھوڑی سی ترمیم کرتا ہے وہ یہ کہ وہ براہ راست ان صفات کا مدعی نہیں ہے بلکہ رسول اکرمؐ سے اسے عشق اسی بنا پر ہے کہ ان میں یہ صفات موجود ہیں اس لیے وہ رسول اکرم کی اطاعت کر کے عشق الٰہی اور عشق رسول میں تپ کر قرب کے بعد ان صفات کو اپنی ذات میں جذب کرتا ہے۔وہ رسولؐ کی عظمت کا اس درجہ قائل ہے کہ رسولؐ کی کوئی چیز اپنی لازوال محبت اور بے پناہ عشق کا ہدیہ پیش کیے بغیر براہ راست نہیں لینا البتہ اس کی شریعت کی مکمل اتباع کے بعد خود کو وارث قرار دیتا ہے اور وراثت کے باب میں بالواسطہ تمام صفات اس میں جذب ہوجاتی ہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے جیلی کے انسان کامل اور اقبال کے ''مرد مومن'' کے فکری ارتباط کا پتہ چلتا ہے لیکن اقبال کا تصور مرد مومن تمام جہتوں سے مکمل ہے۔وہ قرآن کریم اور شریعت محمدیہؐ کا ایک فلسفیانہ عملی پیکر ہے اور اقبال نے اسے سنوارنے میں اپنے ذہن کا سارا زور صرف کر دیا ہے اور عقائد کے اعتبار سے جب کبھی وہ بے عنان ہونا چاہتا ہے تو فوراً شریعت سے اس کی تادیب کر دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جیلی کا اسلوب بے حد فرسودہ اور پیچ در پیچ ہے اس سے اقبال تک محض اشارے پہنچ سکتے ہیں اور وہ اشارے بھی حد درجہ گنجلک بہر کیف ''مرد مومن'' جیلی کے انسان کامل سے اب تک جن مفکروں کا ذکر آیا ہے ان میں نسبتاً سب سے زیادہ متاثر ہے۔جیلی پر تنقید کرتے ہوئے اقبال نے جو کچھ لکھا ہے میں اس سے اپنے طور پر سو فیصدی متفق ہوں۔اقبال لکھتے ہیں:

''روحانی ارتقاء کی اس بلندی پر انسان کامل کس طرح پہنچتا ہے اس کو ہمارے مصنف نے بیان نہیں کیا لیکن وہ کہتا ہے کہ ہر منزل میں اس کو ایک خاص تجربہ ہوتا ہے اور اس میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ نہیں ہے۔اس تجربے کے آلے کو قلب سے تعبیر کرتا ہے۔''

عبدالکریم جیلی اور اقبال کے تصورات کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے عزیز احمد صاحب اپنے تاثرات ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''میرے خیال میں اقبال کے انسان کامل کا راستہ جیلی سے بھی بڑی حد تک مختلف ہے۔پھر بھی اقبال کے انسان کامل اور جیلی کے انسان کامل میں بعض مشترک قدریں ہیں۔مثلاً حیات، علم، اردہ، جمال فطرت، عظمت وجلال اقبال کے نزدیک بھی انسان کامل کا ظہور تسلسل فطرت کے لیے ضروری ہے۔جیلی کے متعلق وہ (اقبال) لکھتے ہیں۔

''الجیلی کا یہ خیال ہے کہ انسان کامل کائنات کا محافظ ہے لہذا تسلسل فطرت کے لیے انسان کامل کا ظہور ایک لازمی شرط ہے یہ ذہن نشین کر لینا آسان ہے کہ ہستی مطلق جو اپنی مطلقیت کو چھوڑ چکی تھی پھر انسان کامل میں واپس آجاتی ہے اور بغیر انسان کامل کے اس کے لیے ایسا کرنا ناممکن تھا۔''

اب آیئے اخیر میں مولانا روم کے نصب العینی انسان نطشے کے ''مافوق البشر'' اور اقبال کے ''مرد مومن'' کا ہر جہتی تقابلی مطالعہ کریں۔اقبال نے مولانا روم کو اپنا مرشد تصور کیا ہے اور اکثر وبیشتر ناقدین کا خیال ہے کہ مولانا روم کی بہ نسبت اقبال نطشے سے زیادہ متاثر ہیں۔بعض انتہا پسند تو اقبال کے مرد مومن کی تمام خصوصیات پر نطشے کے ''فوق البشر'' کی گہری چھاپ ہی نہیں دیکھتے بلکہ اسے مستعار قرار دیتے ہیں۔یہاں میری غرض ناقدین سے اختلاف یا اتفاق کرنے سے مختلف ہے میرا مقصود یہ ہے کہ یہ سہ جہتی تقابلی مطالعہ اس انداز میں کیا جائے کہ صداقت سامنے آسکے۔ایک دوسرا طبقہ ایسا بھی ہے جو فکری دنیا میں کسب وفیوض کو قطعی حرام تصور کر کے اقبال کے مرد مومن پر کسی خارجی اثر کو باور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔فکر وفن کی دنیا میں اکتساب روا ہے۔البتہ اس اکتساب کو جوں کا توں پیش کر دینا کورانہ تقلید ہے۔لیکن تخلیقی مراحل میں کسی سے فیض حاصل کرنا کوئی معیوب بات نہیں اور خصوصاً ایک نہج پر سوچنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے سے کسب فیض کرتے ہیں اور کبھی کبھی اتفاق مشابہت اور ہم آہنگی بھی پیدا ہوجاتی ہے وہ یوں کہ اگر دو بینا انسان اگر دن کے وقت سورج دیکھیں تو روشنی کا اعتراف دونوں ہی کریں گے۔انداز بیان میں فرق ہوسکتا ہے لیکن اعتراف میں ہم آہنگی اور یکسانیت عین فطری ہے ٹھیک اس کے برعکس دو اندھے انسان سامنے حائل غار کا پتہ ٹٹول کر ہی لگائیں گے اگر کوئی عقلمند آدمی یہ منظر دیکھ کر اپنا یہ الہامی تجزیہ پیش کرے کہ دوسرا اندھے نے پہلے کی تقلید کی ہے تو اس کا یہ تجزیہ یقیناً غلط ہوگا کیونکہ ٹٹول کر چلنا اندھوں کی فطرت ثانیہ ہے۔فلسفے کی دنیا بھی سمندر سے موتی چننے کے مترادف ہے اس لیے اتفاقات اور غیر ارادی نکتہ اتصال سے انحراف حقیقت سے اغماض ہے

کی پیش کش میں انفرادیت کی شان قطعی طور پر نمایاں ہو چراغ سے چراغ جلتے ہیں اور روشنی کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے۔

مولانا روم، اقبال اور نطشے تینوں اپنے عہد کے باغی ہیں اور عصری رجحانات سے بیزار نطشے سلطانی جمہور اور اشتراکیت کے تصور سے اس لیے مانوس ہے کہ وہ عوام کی صلاحیت اور ان کی سوجھ بوجھ پر قطعی بھروسہ نہیں کرتا۔ اس کو اس بات پر اصرار ہے کہ عوام مکمل کمل اندیش نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں ان میں اتنی بھی صلاحیت نہیں ہوتی کہ زشت وخوب اور نیک وبد کے درمیان خط امتیاز کھینچ سکیں۔ اس لیے وہ اعلیٰ شریف انسانوں کی تلاش میں ہے اور محض ایسے ہی تربیت یافتہ انسانوں کے ہاتھ ہی عنان حکومت دینا چاہتا ہے عوام ناکارے ہیں اس لیے انہیں دوسروں کی رہنمائی میں چلنا چاہیے۔ رومی کے زمانے میں یہ عقیدہ تمام اسلامی ممالک میں پھیلا ہوا تھا کہ انسان مجبور محض ہے اور یہ خدا کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی ہے اس میں اختیار کا وصف نہیں ہے۔ اس لیے تن بہ تقدیر سارا عالم اسلام مشیت ایزدی کا منتظر تھا کہ وہ ان کی تقدیر بدل دے۔ امام رازیؒ جیسے جید عالم نے بھی "تفسیر کبیر" میں بار بار جبر یہ عقیدے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور جب اس سے بھی آسودگی نہیں ہوئی تو اس موضوع پر باضابطہ کتاب تصنیف کر کے مدلل طور پر جبر کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کا لازمی ردعمل بے عملی اور پر افراد وقوم کی مرگ مفاجات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن مولانا روم کی شاری سے "مرد عارف" کا جو تصور ابھرتا ہے وہ اس نظریے کی تردید کرتا ہے اور قرآن سے استنباط کرتے ہوئے یہ بتلاتا ہے کہ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی جسے خدا اپنے کو بدل دینے کی فکر نہ ہو۔ اس تصور کے تحت مرد عارف میں جذبہ عشق اور جذبہ اختیار سرایت کر سکا اور تسخیر جہات کا شوق دامنگیر ہوا۔ اس نے جبر سے اختیار کا پہلو نکالا اور بے عملی کو سراپا عمل کی اساس پر پرکھ کر دیکھا، آج بظاہر یہ بات بے حد سادہ اور سہل معلوم ہوتی ہے لیکن جس زمانے میں ساری دنیا کے خلاف مولانا نے صدائے احتجاج بلند کیا اس وقت ان کا یہ اقدام مجاہدانہ اور یہ نقطہ نظر مجتہدانہ حیثیت رکھتا تھا۔ مولانا نے جس طرز فکر پر ضرب کاری لگائی وہ بھلے ہی اس زمانے میں کچھ سست رفتار ہوئی ہیں لیکن اقبال کے سامنے اس سے بڑی بدتر منظر تھا۔ تمام عالم اسلام فکری نقطہ نظر سے اسی دید تصور کو عین اسلامی تخیل اور شرعی حکم تصور کیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے مہدی موعود کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ اپنی عملی صلاحیت ختم ہو جانے پر کوئی نہ کوئی ایسا رومانی پیکر چاہیے جہاں انسان مستقبل کی فکر کو پناہ دے سکے۔ سیاسی اعتبار سے سارا عالم اسلام غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ عملی اعتبار سے مسلمان ہونے کے معنی نوع انسانی کا نگہبان ہونے کے نہیں تھے بلکہ نماز، روزہ، اور چلہ، کرامات اور تعویذ تک ان کا اسلام محدود تھا۔ ابن عربی کے فلسفہ وحدت الوجود کے تحت فنائیت کا تصور بھی سارے عالم اسلام میں رائج تھا تفصیل کے لیے "اقبال کا مرد مومن" کے عنوان سے مقالے کا پانچواں باب ملاحظہ ہو۔

ایسی صورت میں قوم اور انسانیت کا ایک سچا دردمند انسان یقیناً چونک اٹھے گا اور اقبال کے ساتھ یورپ سے واپسی کے بعد ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے بھی اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ عالم اسلام کی بالخصوص اور ایشیاء کی غلامی بالعموم محض ان کے منفی رجحانات اور سلبی نظریہ حیات کی وجہ سے۔ اس لیے اس تشخیص کے بعد انہوں نے انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے آزاد کرانے کے لیے ایک مثبت نظریہ حیات کی بنیاد ڈالی۔ یہ نظریہ حیات خالصتاً قرآنی تھا البتہ پیشکش کا انداز اپنے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ اقبال کے سامنے اس کے سوا چارہ کار بھی نہ تھا کیونکہ قوموں کی بیداری کے لیے ایسی تعلیمات ضروری ہیں جس کا کم وبیش شعور انہیں پہلے سے حال ہو۔ پھر ان امور کا اعادہ بھی لازم ہے جن کا تعلق ان کے عقائد سے ہوتا کہ عقائد کی راہ سے انہیں نیا عزم اور حوصلہ مل سکے۔ اقبال نے جو روجہ اپنایا وہ حالات کے پس منظر میں نطشے اور رومی دونوں سے مماثل تھا، نطشے بھی جرمن قوم کی قلب ماہیت کرنا چاہتا تھا اور افراد کی قوت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا، رومی بھی غلط عقائد کے طلسم کو توڑنا چاہتے تھے۔ مگر اقبال غلط عقیدے کو محض منہدم کرنے ہی پر قانع نہ تھے بلکہ اس کے انہدام کے بعد انہیں ایک ایسا متبادل فلسفہ حیات بھی دینا تھا جس پر عمل پیرا ہو کر انسان حیات اور اس کے ممکنات سے آگاہ ہو سکے چونکہ تینوں کی طبیعت میں بلا کی رجائیت ہے، تینوں انسانوں کی عظمت اور سربلندی کے قائل ہیں، تینوں انسان کی تلاش میں ہیں اس لیے ان تینوں میں مماثلت عین فطری ہے۔ اقبال کے سامنے ایک آزمودہ دستور حیات تھا جسے دنیا اسلام کے نام سے جانتی ہے اور جو رومی کی پیش کردہ شاہرہ بھی تھی اس کے علاوہ اقبال کے مطالعے کی وسعت اور ہمہ گیری بھی ظاہر ہے۔ لہذا نطشے کے "فوق البشر" کی توانائی کا احساس اور اس کا پندار بھی ان کی نظروں کے سامنے تھا انہوں نے قرآنی تعلیمات کو اپنی انفرادیت، ذہنی وسعت اور روحانی بالیدگی کے ساتھ بالکل نئے انداز میں پیش کیا، پیشکش اور طرز اظہار اور "مرد مومن" کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں انہوں نے محض رومی اور نطشے سے ٹریٹمنٹ (Treatment) کے باب میں استفادہ کیا نہ کہ اپنے فکری مواد یا فلسفے میں۔ فلسفہ تو ان کے سامنے تھا ہی۔ قرآن اور سنت کی نئی تشریح وتاویل میں انہیں رومی کے طرز اظہار اور انداز نظر سے فائدہ پہنچا اور "مرد مومن" کی پیکر تراشی میں انہیں نطشے کی پیکر تراشی کا انداز پسند آیا۔ ورنہ اقبال کا فلسفہ حیات نہ تو ملحد نطشے کا فلسفہ ہے اور نہ صوفی رومی کا، ان کا نظریہ حیات ان دونوں سے زیادہ مستحکم اور مکمل ہے اور اس پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ موجود ہے۔ فکری اعتبار سے وہ نطشے کی بہ نسبت مولانا روم سے زیادہ قریب ہیں کیونکہ دونوں کے منبع اور ماخذ میں یکسانیت ہے۔ دونوں نے اپنی اپنی شخصیت کے اضافے کے ساتھ اپنا نظریہ حیات پیش کیا ہے اور عصری بعد سے قطع نظر دونوں کی غرض وغایت ایک ہے۔

اقبال کے اکثر ناقدین اس موڑ پر غلط فہمیوں کا شکار ہوئے انہوں نے اقبال کے "مرد مومن" کو نطشے کے "فوق البشر" کا اس لیے ہمسر سمجھا ہے کہ اقبال نے متعدد مقامات پر "فوق البشر" کی شخصیت کے ارتقائی مراحل کی خصوصیات سے "مرد مومن" کی تعمیر وتشکیل میں کام لیا ہے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ نطشے کی پیکر تراشی کا انداز اور "فوق البشر" کے پندار سے اقبال نے استفادہ کیا ہے لیکن اس استفادے کی حیثیت فکری نہیں، بلکہ تشریحی، تجزیاتی اور فنی ہے کیونکہ نطشے کی دہریت اقبال کے "مرد مومن" کے ایمان کامل سے ٹکراتی ہے۔ نطشے کا "فوق البشر" ایک بے راہ قوت ہے، نطشے قوت محض کو خیر تصور کرتا ہے۔ نتیجے کے طور پر اس کا "فوق البشر" محض "بھوتوں سے مصافحہ کرتے کرتے" ہلاکت کے غار میں گر جاتا ہے۔ وہ تمام قدروں کو متبادل کرنا چاہتا ہے۔ نیکی اور خدا ترسی سے اسے کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ یہ سب تصورات اس کے نزدیک غلامانہ ہیں۔ اسے کمزور انسانوں سے نفرت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "خدا مر گیا" اور خود اپنے تراشیدہ بت "فوق البشر" کا خدا کا بار سونپ دیتا ہے "فوق البشر" کے سامنے حیات کا کوئی لائحہ عمل نہیں ہے۔ وہ ملوکیت کا درس دیتا ہے اور جمہور کو گردن زدنی سمجھتا ہے۔ لہذا سفر حیات کی محض ایک ہی منزل طے کرتا ہے وہ یہ کہ "قدروں کو مٹادو" لیکن اس کے بعد آئندہ کے لیے کوئی واضح خاکہ پیش کرنے سے قاصر ہے یعنی تعمیر کے لیے عمارتوں کا انہدام لازمی ہے۔ لیکن بلا وجہ کسی عمارت کا انہدام کر دینا پاگل پن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ نطشے ایک عظیم ترین انسان کا خواب ضرور دیکھتا ہے لیکن فرد کے ساتھ معاشرے کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے "فوق البشر" کا ذہن کسی نصب العین کی خلاقی سے عاری ہے۔ وہ فرد اور افراد کے رشتے پر بھی بہت ہی دھندلی روشنی ڈالتا ہے اور اس کی شیطانی خودی اور حد سے تجاوز خود پرستی معاشرے کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ وہ روح سے زیادہ جسم اور عقل سلیم سے زیادہ قوت محض پر بھروسہ کرتا ہے اور کائنات کی یہ تشریح کرتا ہے کہ اس کی بقا "عزم للقوۃ" میں پوشیدہ ہے جو اس پیکار میں آگے نکل جاتا ہے وہ زندہ ہے اور کائنات کی ہر شے اس پیکار میں مصروف ہے۔ "فوق البشر" یقیناً ایک بدمست اور پاگل ہاتھی کی مانند ہے جو اس کارگہ شیشہ گراں میں گھس کر اپنی سونڈ خلا میں گھماتا ہے اور جو چیز بھی میسر آتی ہے اسے چور چور کر دیتا ہے اس کے لاشعور میں مریضانہ جھنجھلاہٹ ہے۔ اس کا قلب نفرت کی آماجگاہ ہے اس کا ذہن جنون سے لبریز ہے اور اس کے جسم میں طاقت کی برقی لہریں خوفناک دھاروں کی طرح رواں دواں ہیں۔ اس کے پاؤں

جہات کا غلط تصور اس کی قوت کو کسی اصول کے تابع نہیں ہونے دیتا، بے اصولی ہی اس کا اصول ہے۔ ''مردِ مومن'' کے پیکر خاکی میں ''فوق البشر'' کی ساری توانائی ہے مگر اس کی یہ توانائی محض اس لیے ہے کہ اس سے نوعِ انسان کے کمزور افراد کی محافظت کی جا سکے اور ظالموں اور بد اخلاقوں کی سرکوبی کی جا سکے۔ ''مردِ مومن'' کی قوت خدا کے تابع ہے۔ خدا کی خوشی اور رضامندی ہی اس کے استعمال کرنے اور نہ کرنے کا معیار ہے وہ خیر کا حامی ہے اس لیے شر سے ٹکراتا ہے اور ''فوق البشر'' کے انداز میں ہی ٹکراتا ہے لیکن اس کی جنگ انسانوں کو اس کی انسانیت سے ہمکنار کرنے کے لیے ہے۔ وہ خون اس لیے بہاتا ہے کہ ناحق خون کرنے والے قاتلوں کی جماعت قتل کا حوصلہ نہ کرے۔ وہ قاتل کو تختۂ دار پر اس لیے لٹکا دیتا ہے کہ مزید انسانوں کا قتل نہ ہو سکے۔ اس کا ہر فعل انسانیت کی صلاح و فلاح کیلئے ہے۔ یہ بھی نئے آدم اور نئی دنیا کی تلاش میں ہے قدروں کو متبادل کرنا چاہتا ہے لیکن انسانیت کے عروف و ارتقاء کی راہ میں مزاحم منفیانہ قدر حیات ہی کے انہدام پر اکتفا کرتا ہے۔ ''مردِ مومن'' کی قوت اس کی شخصیت کا ایک عنصر ہے اور ''فوق البشر'' قوت محض کا نام ہے۔ ''فوق البشر'' کے تصور کا عملی نمونہ ہٹلر کی شکل میں سامنے آیا۔ اسی کی پیدائش کے بعد ساری دنیا لرزہ بر اندام ہوگئی اور ''فوق البشر'' کا خواب دیکھنے والوں نے اپنے نظریات میں تبدیلی لا کر اسپنگلر تک آتے آتے ''فوق البشر'' کی اتنی تادیب کر دی کہ یہ کردار سسک سسک کر محض ایک نفسیاتی مریض کی شکل میں زندہ رہ سکا۔ ''مردِ مومن'' ایک اسلامی تصور ہے۔ خود ''فوق البشر'' رسول اکرمؐ کی ذات اقدس اور لامحدود شخصیت کا قاتل ہے۔ تاریخ اسلام نے عظیم انسانوں کی ایٹرک جماعت پیدا کر دی۔ کیا حضرت فاروق اعظم کی قوت و جبروت اور وسعت نظر اور خود اعتمادی اور خدا پرستی کی کوئی مثال تاریخ عالم کے سیاسی اوراق میں موجود ہے؟ کیا خالد جانباز کا ثانی ان کے پاس ہے۔ کیا حیدر کرار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بازوؤں کے زور اور فقیرانہ انداز کا کوئی مرد قلندر دنیا کی کسی قوم میں موجود ہے؟ نہیں اور اگر ہے تو صرف اس کا وجود مذہبی کہانیوں افسانوں میں ہے۔ یہ لوگ حقیقی دنیا کے تاریخی انسان ہیں جن کے سایوں سے جبر و ظلم، شر و فساد، فتنہ و انتشار خود سری اور کود پرستی کے تصورات فنا ہو جاتے تھے جو بچائے خود قلندر تھے اور بادشاہوں سے خراج لیا کرتے تھے، جو یتیموں کے والی اور غریبوں کے ہمدرد تھے، جن کا بازو کمزوروں، بیکسوں کا سہارا تھا۔ جن کی بصیرت میں ناداں انسانوں کا حق تھا اور جو محض خدا کی مرضی کے تابع تھے، جن کی ساری قوت قرآن کریم کی آیات میں عقید تھی۔ جہاں انسانیت کی فوز و فلاح کے لیے خدا نے جنگ کی اجازت دی وہیں جنگ کی اور جہاں خدا نے منع فرمایا وہاں جنگ کو حرام سمجھا اور ساری دنیا کے لیے رحمت اور شر پسندوں کے لیے سراپا زحمت بن کر ان عظیم بندگان خدا نے زندگی گزاری، حکومت کی اور مسند خلافت پر بیٹھ کر وہی پیوند لگے طبوں زیب تن کیے اپنے اونٹ اپنے ہاتھوں سے چرائے اور اپنی محنت سے کمائے ہوئے رزق حلال سے اپنے بچوں کی پرورش کی۔ اقبال کا ''مردِ مومن'' اسی تاریخی پس منظر سے ابھتا ہے اور صدیوں کی مسافت طے کر کے تخلیقی ارتقاء کے مراحل سے گزرتا ہوا اپنے عصری تقاضوں اور عصری رجحانات کی روشنی میں نمو پذیر ہے۔ یہ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے بہت بلند ہے یہ خدا کا بندہ ہے تو ''فوق البشر'' اپنی ہوس کا غلام، یہ خدا کے آئین کو محض ''سود و بہبود ہمہ'' کے اصول پر دنیا میں نافذ کرتا ہے تو وہ اپنی خدائی تسلیم کرانے کے درپے ہے۔ یہ کمزور طبقے کو مائل بہ عروج کرتا ہے تو وہ کمزوروں کا ازلی و ابدی دشمن ہے۔ یہ روحانی بلندی اور قوت سے سرشار ہے تو وہ محض اس کی قوت کا ایک تہائی ہے یعنی محض جسمانی قوت دونوں میں مجموعی طور پر بد المشرقین ہے اور دونوں دو مختلف قطبین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اب آیئے نٹشے کی طرف رجوع کریں وہ کون سی بنیادیں ہیں جن کی بنا پر ''مردِ مومن'' کو ''فوق البشر'' تصور کر لیا جاتا ہے۔ جمہوریت کے خلاف اقبال اور نٹشے دونوں ہیں لیکن اقبال اسلامی جمہوریت کے قائل ہیں۔ نٹشے کہتا ہے کہ جمہوریت اور اشتراکیت میں عوام اور غلام قوموں کی ایک سازش ہے اور اس طریقہ حیات میں اعلیٰ درجے کے افراد پیدا نہیں ہو سکتے۔ اقبال بھی جمہوری نظام کو سرمایہ داروں کا پھندا تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جمہوری پیکر میں بھی وہی پرانا ''دیو استبداد رقصاں'' ہے اور اسے ایسی طرز حکومت قرار دیئے ہیں جہاں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ جمہوری مساوات پر مضحکہ خیز انداز میں ضرب لگاتے ہیں۔

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

خلیفہ عبدالحکیم نے ''ردی نٹشے اور اقبال'' کے عنوان سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی بنیاد وسیع مطالعے پر ہے۔ اور انہوں نے تشابہات کو جستہ جستہ بیان کیا ہے۔ چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

''پیام مشرق'' میں نٹشے کا اثر اس قدر نمایاں نہیں جتنا کہ ''اسرار خودی'' میں ہے تاہم جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک اقبال نٹشے کی تعلیم کے بعض پہلوؤں کو صحیح اور قابل تبلیغ سمجھتا ہے۔ مذہبی وجدان کا عام رخ ذات الٰہی کی طرف رہتا ہے اور مشرق و مغرب کا اسلامی اور غیر اسلامی تصوف بھی خدا شناسی اور خدا رسی کو اپنا مطمح نظر قرار دیتا ہے لیکن خدا سے پہلے آدمی کی تلاش کرنا جو اقبال کی شاعری کا امتیازی عنصر ہے نٹشے اور اقبال میں ایک قدر مشترک ہے۔ اسلامی تصوف اسی انداز تخیل سے نا آشنا نہیں تھا۔ عبدالکریم جیلی کی مشہور تصنیف ''الانسان اور کامل'' میں اس قسم کا مابعد الطبیعی فلسفہ متصوفانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ مولانا روم کی مثنوی اور دیوان میں بہت سے اشعار اس موضوع کے ملتے ہیں اور قرآن کریم مسخر کائنات آدم بھی ایسے ہی افکار کا سرچشمہ ہے۔ مرد لیام سے مسلمانوں میں یہ انداز فکر تقریباً پیدا ہو گیا تھا کہ یک بیک اقبال نے اس زور سے اعلان کیا کہ وہ اس کی زبان سے ایک نو زائیدہ اور جدید نظریہ حیات معلوم ہوتا ہے۔ زمانہ حال میں نٹشے نے علو آدم پر اس قدر اپنی نگاہیں جمائیں کہ وہ خدا سے بالکل بیگانہ ہو گیا۔ نٹشے نہ خدا پرست ہے نہ دہر پرست، وہ آدم پرست ہے۔ لیکن اس کا آدم وہ آدم نہیں جو اس کے سامنے وجود ہے اس کا آدم ابھی تک کتم عدم میں ہے۔ وہ اسے عرض وجود میں لانا ارتقائے حیات کا اعلیٰ ترین مقصد سمجھتا ہے نصب العینی آدم کی تلاش نٹشے اور اقبال کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یہی شیخ، دیو جانس ہیں جن کا فلسفہ قصے کے پیرائے میں مولانا روم نے ان اشعار میں لکھا ہے جو اقبال کو اس قدر پسند تھے کہ انہیں اپنی کتاب کے سرورق پر درج کیا ہے۔''

دی شیخ با چراغ ہمی گشت کرد شہر
کز دام و دو علوم و انسانم آرزست
از ہمرہان دست عناصر ولم گرفت
شیر خدا و رستم و ستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

''اس امر میں اقبال کے خیالات ایک طرف اسلامی مفکرین خصوصاً جلال الدین رومی سے ملے ہوئے ہیں اور دوسری طرف نٹشے سے مگر فرق یہ ہے کہ رومی اور اقبال کے یہاں خدا ابھی موجود ہے اور نٹشے کے نزدیک خود اسی کے الفاظ میں ''خدا کا انتقال ہو چکا ہے اور جب تک انسان اس مردے کو پوجتا رہے گا وہ اپنی حقیقت سے نا آشنا رہے گا اور ارتقاء میں آگے کی طرف قدم نہیں اٹھا سکے گا۔ اقبال کے لیے ناممکن تھا کہ نٹشے کی طرح خدا کا منکر ہو جائے لیکن اقبال جا بجا خدا کی ہستی پر ایک چوٹ کر جاتا ہے۔''

نوائے عشق را ساز است آدم
کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید ایں خوبتر ساخت
مگر با ایزد انباز است آدم

خدائی اہتمام خشک و تر ہے
خداوند خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی استغفراللہ
یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

اس مضمون کے ہم معنی اشعار دونوں کے یہاں موجود ہیں۔ رومی کہتے ہیں ۔

بزیر کنگرہ کبر یاش مرد انند
فرشتہ صید و پیمبر شکار دیزداں گیر

اسی مضمون کو اقبال نے اس طرح ادا کیا ہے ۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

تقدیر کے روایتی مفہوم کے متعلق رومی نطشے اور اقبال تینوں ایک طرح سے سوچتے ہیں لیکن رومی اور اقبال ایک دوسرے سے قریب ہیں پھر بھی رومی اور اقبال جوش غلو میں کبھی کبھی نطشے سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

چو از دست تو کار نادر آید
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

رومی اور نطشے کا فرق اقبال کی نظر میں

اقبال خود رومی اور نطشے کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں آئیں ان کی Note Book Stray Reflections میں سے پڑھتے ہیں۔

Nietzsche and Jalal-ud-din Rumi

Comparisons, they say, are odious. I want, however, to draw your attention to a literary comparison which is exceedingly instructive and cannot be regarded as odious. Nicizsche and Maulana Jalal-ud-Din Rumi stand at the opposite poles of thought but in the history of literature and thought it is the points of contact and departure which consitute centres of special interest. In spite of the enormous intellectual distance that lies between them these two great poet philosophers seem to be in perfect agreement with regard to the practical bearing of their thought on life. Nietzsche saw the decadence of the human type around him, disclosed the subtle forces that had been working fot it, and finally attempted to adumbrate the type of life adequate to the task of our planet. "Not how man is preserved, but how man is surpassed." was the keynote of Nietzche's thought. The superb Rumi born to the Muslim world at a time when evervating modes of life and thought and an outwardly beautiful but inwardly devitalising literature had almost completely sucked up the blood of Muslim Asia and paved the way for an easy victory for the Tartar was not less keenly alive than Nietzsche to the poverty of life, incompetence, inadequacy and decay of the body social of which he formed a part and percel. See with what unerring insight he describes the corroding disease of his society and suggests the ideal type of Muslim manhood.

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دو ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان سست عناصر ولم گرفت
شیر خدا و ستم و ستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

"اسی انداز کے مضامین رومی اور نطشے دونوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ ایک مرتبہ اس مضمون پر اقبال سے گفتگو ہوئی، میں نے عرض کیا کہ مثنوی مولانا روم میں ایک عجیب وغریب مصرعہ ہے کہ وہ کوشش بیہودہ بہ از خفتگی" یہ سن کر اقبال کا چہرہ روشن ہو گیا اور اس کی خوب داد دی۔"

"پیام مشرق" میں ایک اور نظم نطشے پر ہے جس کے نیچے اقبال نے ایک فٹ نوٹ بھی دیا ہے جو مفصلہ ذیل ہے :

"نطشے نے مسیحی اخلاق پر ایک زبردست حملہ کیا ہے اس کا دماغ اس لیے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے، گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں" قلب او مومن دماغش کافر است" نبی کریمؐ نے اس قسم کا جملہ امیہ ابن ابی الصلت عرب شاعر کی نسبت فرمایا تھا آمن لسانہ وکفر قلبہ تے :

نظم

گر نوا خواہی زپیش او گریز
در نے کلکش غریو تندراست
نیشتر اندر دل مغرب فشرد
دستش از خون چلیپا احمراست
آں کہ ہر طرح حرم بت خانہ ساخت
قلصب او مومن دما عشق کا فراست
خویش را اور نار آں نمرود سوخت
زاں کہ بستان خلیل از آزر است

"اس کی آواز ایک کڑکا ہے اور ایک گرج ہے، شیریں نوا کے طالب کو اس سے گریز کرنا چاہیے اس کی حریر قلم تلوار کی جھنکار ہے۔ عیسائیت کے خون سے اس کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنا بت خانہ اسلام کی بنیادوں پر قائم کیا۔ اس کا دل مومن ہے اور دماغ کافر تو اس نمرود کی آگ

بوستان بن جائے گی۔''

خلیفہ کے طویل مضمون سے محض چند اقتباسات اس لیے لیے گئے ہیں کہ اقبال پر نطشے کے اثرات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اقبال پر نطشے کے اثرات ہیں۔ لیکن ان معنوں میں قطعی اچ نہیں ہے کہ اقبال کی فکر نطشے کی کہیں سے رہین منت ہے بلکہ اقبال نے تو اس کے خیالات کو جہاں بھی اپنایا ہے فوراً حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے واقعے کی طرح کلمہ پڑھا کر کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ اس نے نطشے کے یہاں سے محض لوہا لیا کر لیے ہیں۔ اس کی نامسلمان خودی اقبال کے یہاں آ کر معرفت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ خود اقبال کا یہ کہنا ہے کہ:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو بتلاتا مقام کبریا کیا ہو

مذکورہ بالا دعوے کی دلالت کرتا ہے۔ اقبال نطشے کے جہنم زار سے حضرت ابراہیم کے انداز میں چند دہکتے ہوئے انگارے تو ضرور اٹھاتے ہیں لیکن اس سے ان کا دامن نہیں جلتا بلکہ وہی انگارے شگفتہ و شاداب پھول بن جاتے ہیں مگر جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنے دامن میں نمرود کا سارا آتشیں الاؤ نہ سمیٹ لیا تھا اسی طرح اقبال بھی چند شعلہ بداماں انگاروں کو چن لیتے ہیں اور بقیہ سارے الاؤ کو راکھ کا ڈھیر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اقبال کے نظریہ خودی کے پہلے مرحلے میں نطشے کا اثر معلوم ہوتا ہے باقی وہ مراحل اسلام سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اگر پہلے مرحلے کی توجیہہ بھی ''لا'' کے ساتھ کی جائے تو یہ بھی اسلام کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے ''اسرار خودی'' کی حکایت بعنوان ''دریں معنی کہ مسئلہ نفی خودی اختراعات اقوام مغلوبہ بہ بنی نوع انسان است کہ بایں طریق مخفی اخلاق اقوام غالبہ را خفیف می سازند'' میں اگرچہ اصطلاحات نطشے سے ماخوذ ہیں لیکن اقبال کے اس قول سے قوتوں کے مصرف میں بعد المشرقین ہے۔ اقبال کے ''مرد مومن'' کی قوت تسخیر جہات کی غرض سے ہے نہ کہ ظلم و استبداد کے لیے۔ اس حقیقت کی مزید وضاحت اقبال کے اس قول سے ہو جاتی ہے جسے ''روزگار فقیر'' میں ممتاز حسین کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے:

''خدا جب کسی قوم اور فرد کو حکومت سونپتا ہے تو انہیں موقع دیتا ہے کہ اپنی سیرت میں ایک خاص قسم کے تدبر، عدل اور اخلاق کے اوصاف پیدا کریں چونکہ مروت، علو ہمت، فراخدلی، مردم شناسی اور فیض و بخشش کی اعلیٰ خصوصیات کے بغیر ایک شخص صحیح طور پر حکمران بن ہی نہیں سکتا اس لیے یہ ظاہر ہوا کہ خدا نے حاکمیت میں تعمیر کردار اور تربیت سیرت کے جو مواقع رکھے ہیں وہ محکومیت میں نہیں ہیں:

حاکمانہ اور محکومانہ اخلاق یا فلسفہ شیری یا کوفندی کی مثالیں اگرچہ اقبال نے نطشے سے مستعار لی ہیں مگر ان کو فلسفے کی اصطلاحوں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ سیاست سے یہ اصطلاحیں تعلق نہیں رکھتیں نطشے کے یہاں حاکم اور محکوم کے لیے دو مختلف ضابطہ اخلاق ہیں لیکن اقبال اسے محض ایک تاریخی واقعہ کہتے ہیں اور حصول قوت ان کے یہاں اس لیے ضروری ہے کہ ظلم و استیلا رکے رجحانات کا مقابلہ کیا جائے۔ اس کے برعکس نطشے کا مفہوم یہ ہے کہ:

''نوع انسانی کی ترقی کا کام اب تک ہمیشہ طبقہ امرا یا اشرافیہ نے انجام دیا ہے اور یہی طبقہ ہمیشہ یہ کام انجام دیتا رہے گا اس طبقے کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ کمتر انسانوں کو غلاموں کے طور پر اپنے کام کے لیے استعمال کریں۔''

دونوں کے نظریہ قوت میں کس قدر تضاد ہے اس کا اندازہ مندرجہ بالا تحریروں سے ہو گیا ہو گا البتہ ''فوق البشر'' کا پندار ''مرد مومن'' میں سود و بہبود ہمہ'' کی غرض سے خدا اور عقل کے تابع رہ کر موجود ہے اور افراط اور قوام کے تحفظ کے لیے قرآن اس کی اجازت دیتا ہے کہ خدا کی راہ میں حائل قوتوں اور سرکشی کرنے والوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔

حکایت الماس و زغال سخت کوشی کی وضاحت کے لیے نطشے ہی سے ماخوذ ہے لیکن ''اسرار خودی'' کے دور میں بھی اقبال نے اس کی توجیہہ پیش کی ہے اور یہ بات واضح لفظوں میں بیان کر دی ہے کہ اگر حق کے لیے جنگ ہو تو جائز ہے جبکہ نطشے کا ''فوق البشر'' جنگ برائے جنگ کو اس لیے ضروری سمجھتا ہے کہ دوسری قومیں حائف رہیں۔

میں اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر عزیز احمد کی رائے نقل کرتا ہوں کو ان کی اشتراکیت پسندی نے انہیں اقبال کے رجحان کو اشتراکیت کی طرف مائل سمجھا ہے لیکن عزیز احمد نے جس اعتماد کے ساتھ اقبال کا مطالعہ کیا ہے، وہ اعتماد اقبال کے موافق اور مخالف ناقدین میں سوائے خلیفہ عبدالحکیم کے کسیا اور کو نہیں حاصل ہے، ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی رائیں صاحب ہیں لیکن طرز اظہار میں ایک طرح کا الجھاؤ ہے بہر کیف:

''اقبال پر نطشے کا اثر بہت جزوی ہے اور خیر کا معیار اقبال کے یہاں اتنا مستحکم ہے کہ قوت اگر اس معیار کو توڑنا چاہے تو اقبال اسے کبھی جائز نہیں قرار دے سکتے اور ان کی اشتراکی انسان پرستی یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ ایک انسان ایک انسان کو اپنے مفاد پر قربان کرے۔

''اسرار خودی'' کے دور میں اقبال پر نطشے کے کچھ اثرات ایسے ہیں جن کو ماخوذات کہا جا سکتا ہے۔''

مذکورہ بالا بیان میں ''اشتراکی انسان پرستی'' کو ''اسلامی اخوت'' میں تبدیل کرنے کے بعد مجھے عزیز احمد سے اتفاق ہے۔ ''ماخوذات'' کا بہت ہی مناسب لفظ ان اثرات کی وضاحت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ عارف رومی اور اقبال کے ''مرد مومن'' میں بھی مشابہت ہے۔ ان دونوں کی فکری ہم آہنگی کا مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم رقمطراز ہیں:

''عارف رومی اور علامہ اقبال میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں، دونوں اسلامی شاعر ہیں۔ دونوں کی شاعری حکیمانہ ہے۔ دونوں معقولات کے سمندر کے تیراک ہونے کے باوجود وجدانات کو معقولات پر مرجح سمجھتے ہیں۔ دونوں خودی کی نفی کے بجائے خودی کی تقویت چاہتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک حقیقی خودی اور حقیقی بے خودی میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ایک کے بغیر دوسری مہمل اور بے نتیجہ ہے۔ دونوں کا تخیل تقدیر کے متعلق عام مسئلہ سے الگ ہے۔ دونوں کا خیال ہے کہ تقدیر میں جزئی طور پر اعمال افراد پہلے ہی سے خدا کی طرف سے معین اور مقرر نہیں، بلکہ تقدیر آئین حیات کا نام ہے دونوں ارتقائی مفکر ہیں۔ نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات ادنیٰ سے اعلیٰ منازل کی طرف عروج کر رہے ہیں۔ انسان کے عروج کی کوئی حد نہیں، قوت آرزو اور جہد صالح سے کئی نئی کائناتیں انسان پر نہ صرف منکشف ہو سکتی ہیں، بلکہ خلق ہو سکتی ہیں۔ دونوں قرآن کریم کے آدم کو نوع انسان کے معراج کا ایک نصب العینی تخیل سمجھتے ہیں۔ دونوں کے یہاں بقا مشروط ہے سعی بقا پر دونوں اپنے کروہ افکار سے کما حقہ واقف ہیں اور متضاد عناصر کو ایک بلند تر وحدت فکر کی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ اس ازلی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے اقبال اپنے آپ کو عارف رومی کا مرید سمجھتا ہے یہ مرید معمولی تقلیدی مرید نہیں کمال عقیدت کے ساتھ پیر کے رنگ میں رنگا ہوا مرید ہے لیکن آزاد حقیقت یہ ہے کہ عارف رومی کا صحیح خلیفہ چھ سو برس کے بعد پیدا ہوا۔ جب تک دنیا میں مثنوی پڑھنے والے اور اس سے روحوں میں سوز و گداز پیدا کرنے والے رہیں گے، تب تک اقبال کا کلام بھی اس کے ساتھ پڑھا جائے گا اور روحانی لذت اور زندگی پیدا کرتا رہے گا۔

''مذکورہ بالا تفصیل کی اجمال یہ ہے کہ چونکہ اسلام کے مسائل کی تفسیر و تاویل میں مولانا روم اور اقبال میں ہم آہنگی موجود ہے اور مولانا روم کے انداز نظر سے اقبال بے حد متاثر ہیں اس لیے انہیں اپنا پیر تسلیم کرتے ہیں انہوں نے خود بھی مثنوی کے بارے میں کہا ہے کہ ''ہست قرآں در زبان پہلوی'' لیکن فاضل تنقید نگار کا یہ کہنا مناسب نہیں کہ مثنوی کے ساتھ اقبال کا کلام بھی روح میں سوز و گداز پیدا کرنے کے لیے پڑھا جائے گا۔ اب حقیقت اس کے برعکس ہے اب رومی کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اسے

کا وجود ہے اس وقت تک ضرور زندہ رہے گا اور اس کے کلام سے استفادہ کیا جائے گا اور اس کے ساتھ پڑھنے والوں کو رومی کی ابتدائی کوششوں کی بھی یاد آئے گی۔ اس حقیقت کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے کہ اقبال اور رومی کے درمیان چھ سو برس کا بعد زمانی ہے چھ سو برس بعد کے بدلے ہوئے حالات میں اقبال نے عصری علوم اور افکار کی روشنی میں اسلامی تخیل کی از سر نو تشکیل کی ہے اور یہ تشکیل اپنے آپ میں مولانا کے جستہ جستہ فیضان سے کہیں زیادہ مستحکم ہے اس لیے استاد پر شاگرد کی علمی فضیلت مقدم ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم غالباً نفسیاتی طور پر نطشے سے مرعوب ہیں، یا اقبال کو اسلام کی حدود تنگ سمجھ کر اس کے حصار میں صریحات لانے سے گریزاں ہیں اس لیے اس بات میں انہوں نے کول مول انداز میں بحث کی ہے اور اقبال کی فکر پر نطشے کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے جتنے حوالہ جات نقل کیے ہیں اس کی حیثیت ''ماخوذات'' سے زیادہ نہیں ہے لیکن ان ماخوذات کو وہ اقبال کی پوری فکر میں ڈھونڈتے ہیں اور ایک جگہ اپنے مطالعہ کو مستند ثابت کرنے کے لیے لکھتے ہیں:

''اقبال نطشے سے متاثر تھے، علاوہ اس داخلی شہادت کے جو ''اسرار خودی'' سے بکثرت اور بوضاحت مل سکتی ہے مجھ کو اس بارے میں شخصی طور پر بھی کچھ معلومات حاصل ہیں۔''

لیکن انہوں نے اپنی شخصی معلومات کو اپنے ہی تک محدود رکھا ہے حالانکہ اقبال پر نطشے کے اثر سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن یہ اثر نتیجے پر جا کر قطعی دوسری چیز ہو جاتا ہے۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ اقبال پر نطشے کے جو اثرات ہیں وہ زیادہ تر نطشے کے اسلوب اور اس کے تجزیے کے مخصوص دلکش انداز سے وابستہ ہیں۔ نطشے کا پرزور اور پرجوش انداز بیان اقبال کو متاثر کرتا ہے اور اسی لیے بعض دفعہ اس کی معلومات اور علامتوں سے اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے نطشے کے مجموعی فلسفہ حیات اور ''فوق البشر'' کے مزاج سے ''مرد مومن'' قطعی الگ ہے، دونوں کا مزاج جداگانہ ہے۔ ''مرد مومن'' قرآن کا نصب العینی آدم ہے اور ''فوق البشر'' الحاد کا پیکر جسم اور قد و قامت کی بنا پر ہم کسی دو آدمی کو ایک جیسا نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کی سیرت اور شخصیت کے مجموعی وقار کو مقابلے کے وقت مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ محض ''مرد مومن'' کی قوت پسندی اسے ''فوق البشر'' کے قریب نہیں لے جا سکتی۔

اس بات میں خود ڈاکٹر اقبال نے نکلسن کے نام ایک خط میں جو بیان دیا ہے وہ بہت معنی خیز ہے:

مائی ڈیئر نکلسن!

شفیع کے نام آپ نے جو خط لکھا ہے اس سے یہ معلوم کر کے مجھے بہت مسرت ہوئی کہ اسرار خودی کا ترجمہ انگلستان میں بہت مقبول اور مورد التفات ہو رہا ہے۔ لیکن بعض انگریز ناقدین کو میرے اور نطشے کے بعض خیالات میں ظاہری مماثلت دیکھ کر عجب قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ آئتھیسم کے تبصرہ نگار نے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بڑی حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہے مگر یہ بات نادانستہ طور پر ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر میری اردو نظموں کی صحیح تاریخ ہائے اشاعت اس کے پیش نظر ہوتیں تو یقیناً میری دماغی زندگی کے ارتقاء سے اس کی رائے بالکل مختلف ہوتی۔ علاوہ بریں اس نے میرے نظریہ ''انسان کامل'' نطشے کے نظریہ ''فوق البشر'' سے مخلوط کر دیا ہے اور اپنی غلط فہمی کی بنا پر دونوں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے، میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل ''انسان کامل'' کے متصوفانہ عقیدہ پر ایک مضمون لکھا تھا اور وہ یہ زمانہ ہے جبکہ نطشے کی بھنک بھی میرے کان میں نہیں پڑی تھی اور نہ اس کی تصانیف میری نظر سے گزری تھیں۔ یہ مضمون اسی زمانے میں رسالہ ''انڈین انٹی کیوری'' میں شائع ہوا تھا اور جب 1908ء میں میں نے فلسفہ عجم پر مقالہ لکھا تو اس مضمون کو اس میں متضمن کر دیا۔''

ڈاکٹر سید عبداللہ / مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ

اقبال کا مرد یقین

بائنڈگر کے مرد یقین سے مقابلہ و موازنہ

بائنڈگر اور بعض دوسرے وجودیوں (Existentialists) نے اپنی تحریروں میں ایک فرد بالیقین (Authentic Individual) کا تصور پیش کیا ہے جس کے سرسری معنی وہ فرد ہے جسے اپنے وجود یا اپنی ذات کا قطعی شعور ہو اور وہ بعض دوسرے وجودیوں کی طرح وجود کو بحث اور لامعنی نہ سمجھتا ہو۔

بائنڈگر کا یہ تصور، ایک کنارے سے اقبال کے مرد مومن (عبد) یا فرد خود آشنا سے ملتا ہے، اگرچہ موخر الذکر کے جملہ تصورت کی عمارت ایمان پر قائم ہے، اور مغرب کا آدمی اس تصدیق

1۔ یہ مضمون کل پاکستان فلسفہ کانگریس 1982ء کی ایک نشست کے خطبہ صدارت کے طور پر لکھا اور پڑھا گیا۔

میں نے ''آتھینٹک فرد'' کے لیے کئی وجوہ سے ''صاحب یقین فرد'' کو ترجیح دی ہے۔ تفصیل حواشی میں آئی ہے۔ ہمارے ادبوں میں فرد کے خصوصی شعور و اعتماد کے لیے کئی اور الفاظ بھی آئے ہیں۔ صاحب ایمان، مرد (مومن) حق اور صاحب تصدیق تو عام ہیں لیکن ایک اور جہت سے سعدی کے یہاں صاحب دل اور صائب تبریزی کے یہاں مرد روشن دل، یا مرد روشن ضمیر بھی استعمال ہوا ہے۔ میرے نزدیک انسان کامل ہمارے موجودہ مقصد کے لیے موزوں لفظ نہیں۔ جوہر سے بھی خائف ہے اور اسے قبول کرنے سے جھجکنا ہے تاہم کچھ کچھ قریب آتا جاتا ہے۔

اقبال کے تصور عبد (مرد مومن) کی گفتگو سے پہلے مغربی آتھینٹک فرد کی ذرا سی تشریح مناسب ہوگی اور اس کے بعد بعض حکمائے اسلام کی رائے بھی وضاحت کے لیے پیش ہوگی۔ مغربی فکر میں ''آتھینٹک فرد'' (Authentic Individual) یا صاحب یقین شخص کا سوال اس وقت اٹھا جب مغربی مابعد الطبیعات، طبیعات سے شکست کھا گئی، جب سائنس زدگی کے زیر اثر مادی خارجیت اور خالص خواست کو غلبہ حاصل ہو گیا تو باطن کی دنیا اور خود ذات کے حقیقی ہونے کے بارے میں شک کیا گیا کہ یہ نفس الامر میں ہے بھی یا نہیں۔ بلاشبہ نفسیات نے داخلی پہلو کی جستجو کی اور لاشعور کی گہرائیوں میں اترنے کی دعوید ار ہوئی مگر اس کے نتائج اور فیصلوں نے انسان کو اپنے بارے میں اور بھی متشکک بنا دیا۔ یہاں تک کہ کارخانہ عالم کی لغویت (Absurdity) بلکہ عدمیت (Nothingness) کا خیال عام ہو گیا ہے جس سے خود بیزاری، ہر شے سے غیریت (Alienation) اور کرب تنہائی جیسے میلانات (امراض) ابھر آئے۔

ان میلانات کا بڑا حصہ دراصل، انسان کی سالمیت (Wholeness) سے افکار کا نتیجہ تھا، یعنی اس بات کا انکار کہ انسانی مادی، خارجی اور حسی احوال کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اور اس ''بہت کچھ'' میں عقیدہ اور یقین بھی ایک ایسی داخلی حالت ہے جو خارجی اور حسی احوال میں ایک ربط پیدا کر کے وجود کو بامعنی اور بامقصد بنانے میں بڑا حصہ لیتی ہے۔

اسی داخلی حالت (یعنی عقیدے اور یقین) کی نفی کی وجہ سے مغربی معاشرے کے فرد کے باطن میں ایک خلا اور کھوکھلا پن پیدا ہوا، جس نے علوم کی بے پایاں وسعت اور زندگی کی ساری گھن گرج کے باوجود، فرد کو باہر سے سجا ہوا اور اندر سے خالی بنا دیا:

از پروں چوں گور کافر پر حلل
اندروں قہر خدائے عز و جل

یہی وہ فرد ہے جسے اصطلاح عام میں Non Authentic Individual کہا جا سکتا ہے۔ یہ فرد حواس کا غلام، بے یقینا اور لامقصد ہے۔

جب مغرب میں خارجیت اور حواسیت کے خوفناک نتائج سے آگاہی بڑھی تو بعض اہل فکر نے ان میلانات و رجحانات کے سامنے بند باندھنے کی ٹھانی تا کہ فرد کا اپنی ذات میں یقین بحال ہو سکے اسے اپنی زندگی بامعنی و بامقصد معلوم ہو اور وہ اس حالت سے بہرہ ور ہو جائے جسے سکون قلب اور وثوق ذات کہتے ہیں۔

اس سلسلے میں وجودیت (Existentialism) کی سوچ بھی ایک رخ کی نمائندگی کرتی ہے جسے بعض اہل فکر نے مجموعہ اضداد کہا ہے۔ اس لحاظ سے، کہ ایک طرف تو اس کے مفکر زندگی کو لایعنی اور لغو اور انسان کو Outsider اور Stranger کہہ کر اسے یتیم اور لاوارث (Tragically Orphaned) کا خطاب دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف انہیں کسی ایسے فارمولے کی جستجو بھی ہے جو زندگی کو بامقصد بنا سکے اور انسان کا اپنے بارے میں اعتماد بحال ہو جائے۔

وجودیوں کے دو دبستان ہیں؟ ایک میں البرٹ کامیو، ژاں پال سارتر جیسے لوگ شامل ہیں، جو خدا کی ہستی کو نہیں مانتے اور دوسرے میں کوک کارد، گیبریل مارسل، مارٹن بیوبر اور کارل یسپر جیسے لوگ ہیں جو خدا کے قائل ہیں، مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کے باخدا اور بے خدا دونوں گروہ تشکیکی ہیں، تاہم زندگی کو بامقصد بنانے کی آرزو دونوں رکھتے ہیں۔ مگر دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے کی وجہ سے وہ کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچے اور ابھی تک Authentic Individual (صاحب یقین اور خودی آشنا فرد کی جستجو) کے چکر میں ہیں (یعنی Authentic existence of the individual کے لیے تڑپ رہے ہیں)

دراصل یہ سب باتیں غرور نفس، کثرت دولت، انتہا پسندانہ سائنس زندگی اور ایمان کے فقدان کا نتیجہ ہیں۔ جب تک اندر کا شیطان رام نہیں ہوتا یقین کا چہرہ دیکھنا محال ہے۔ وجودیوں پر غالب کا یہ مصرع صادق آتا ہے۔

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

اصل قصہ ایمان کی بحالی کا ہے، مگر وہ ادھر نہیں آتے۔ ان وجودیوں میں آنا مانو (Unamanu) زندگی میں مقصد کو ذریعہ تسکین مانتا ہے اور قدرے بہتر مارٹن بیوار (Buber) ہے جس کا فلسفہ I & thou یا ڈائیلاگ (ماوسن یا سن وتو یا مکالمہ ومخاطبہ) کسی قدر انسان کی سالمیت کی طرف ایک مثبت قدم ہے اور اسی سالمیت کے اندر سے ایک پگڈنڈی ایمان کی طرف بھی نکلتی ہے، اگرچہ ٹیڑھ میڑھ اس میں بھی ہے۔ یہ مسلک دراصل کھیٹھ مادہ پرستوں، وجودیوں اور احیائے مذہب کے داستان کے درمیان کہیں واقع ہے۔

یہ معلوم ہے کہ احیائے مذہب (خصوصاً عیسائیت کے تعلق میں) ایک تو اناتحریک یورپ میں کچھ سوشیالوجی کے راستے سے اور قدرے نفسیات کے توسط سے آئی ہے جو انسان کے یقین و ایمان کی بحالی کے لیے کوشاں ہے۔ اس گروہ میں پال ٹلش (Paul Tillich) تالکاٹ پارسن (Talcott Parson) وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ فکر کی بند گلیوں میں اچھل کود کرتے رہتے ہیں۔ کہیں انسانیت نوازی (Humanism) کی جذباتی اپیل سے اور کہیں معاشرتی علوم سے استفادہ کر کے یقین، امید اور ایمان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن اصل شے تو نفس کی پہچان اور اس کے طاغوتی حصے کا مقابلہ ہے۔ وہ ابھی ابھی کر سامنے نہیں آئی۔

یقین و ایمان کی یہ تحریک کہاں تک کامیاب ہوئی، اس پر کوئی قطعی رائے دینا مشکل ہے۔ دراصل سارا قصور اس تصور کا ہے جو اہل مغرب نے خدا، کائنات اور انسان کی جدائی کے بارے میں قائم کر رکھا ہے اور وہ دماغوں میں راسخ ہے۔ مغربی اس تکون (مثلث) میں ربط پیدا کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوئے اور اس ربط کے بغیر اطمینان اور اعتماد کی بحالی ممکن ہی نہیں۔ اصل علاج کلیت اور سالمیت میں اعتماد ہے جس میں یہ تکون اور حواس اور قلب و وجدان سب جمع ہو جاتے ہیں۔ اقبال کے بقول۔

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

لیکن مغرب کا بگڑا ہوا مزاج ادھر نہیں آتا اور تفہیر کے نظریے کی یک طرفہ تعبیر کی وجہ سے جدت برائے جدت اور ہر حال 'پیش قدمی' کے خیال کی وجہ سے ایک ثابت شدہ غلطی کا علاج بھی ایک دوسری غلطی سے کرتا رہتا ہے۔ وہ ناک کی سیدھ چلتا ہے اور کھڈ پر پہنچ کر بھی نہیں رکتا۔ اسے معلوم ہے کہ نفس طاغوتی اسے خراب کر رہا ہے مگر اپنی لذت دوستی وجدت پسندی کی وجہ سے وہ اپنے نفس سے آنکھیں چار کرنے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس کا پیغمبر ڈاکٹر فاؤسٹس ہے اور اس کے ذہنی پیر واوڈی پس اور الیکٹرا ہیں۔

یہاں پہنچ کر میں اقبال کے تصور عبد سے پہلے اس موضوع کے تعلق میں اسلامی فکر کی طرف کچھ اشارے کرنا چاہتا ہوں یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلم قوم کی سوچ میں دیگر کچھ خامیاں ہوں گی لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ اس کی فکریات میں یہ کبھی نہیں جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ اس فکر میں انسان کو نہ صرف صاحب یقین وتصدیق مانا گیا ہے بلکہ اسے نائب حق کا شرف بھی حاصل ہے۔ قرآنی تصور، خدا، کائنات اور انسان کی تکون میں گہرا عقیدہ پیدا کرتا ہے۔ انسان کے لیے ایمان کو اساسی حیثیت دے کر اعمال صالحہ اور تصور آخرت وجزا وسزا کو اس کے ساتھ مربوط کر کے صاحب یقین و تصدیق افراد پیدا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان وہ سنگ بنیاد ہے جس پر تصدیق قلبی اور عمل بالجوارح کی ایک مکمل عمارت تیار ہو سکتی ہے۔

اس عقیدے کی لہر مسلمانوں کے افکار میں ہر جگہ دوڑتی نظر آتی ہے۔ اس میں اہل دین تو علم برداروں کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن صوفیہ اور حکماء تک بھی کسی نہ کسی رنگ میں انسان کو ذمہ داری اور نیابت حق کے اعزاز سے مشرف مانتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ شیخ اکبر ابن عربی کی فکریات کی غلط اور ادھوری تعبیر سے بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس سے انسان کے احساس ذمہ داری اور ذوق یقین کو نقصان پہنچا ہے، لیکن ابن عربی کو زیادہ ہمدردانہ پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ شیخ کے یہاں بھی انسان کی حیثیت ذمے دارانہ اور مستقل ہے۔ شیخ نے مراتب وجود کی جو ترتیب قائم کی ہے، نزولی صعودی اور دوری ہونے کے باوجود شرف انسانی کے لحاظ سے وہ ارتقائی اور اتکمالی ہی ہے، اور جب کہ حقیقت محمدیہ کو نور اعلیٰ (تجلی) کا مرکز خاص یا مرکز اول قرار دیا ہے اور حقیقت انسانیہ کو اسی نکتے کے اردگرد لپیٹ دیا گیا ہے تو یہ بھی رتبہ انسان کا ایک بلند مقام ہے اور اس سارے سلسلے میں ایمان اور روحانی تجربہ، یقین افزائی کرتا رہتا ہے اور دعا اس کے لیے قربت الٰہی اور یہ قربت اعلیٰ اس کے لیے اطمینان وسکون کا وسیلہ بنتی ہے۔ (دیکھیے علامہ اقبال کا انگریزی خطبہ "حقیقت دعا"

شیخ اکبر کے تصور کا اثر اپنے زمانے سے آج تک برابر قائم ہے۔ چنانچہ اس کی شعاعیں عبدالکریم الجیلی، محمود شبستری، رومی، جامی اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید تک میں پائی جاتی ہیں اور ایک مختلف رنگ میں شیخ مجدد سرہندی، میرزا بیدل اور ان سے کچھ مختلف خواجہ میر درد آتے ہیں۔ یہ سب عظما انسان کو خلاصہ کائنات مان کر اسے صاحب امانت (نائب حق) قرار دیتے ہیں اور نائب حق کا منصب پختہ اور گہرے یقین کے بغیر سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

انسان کے متعلق علامہ اقبال کا تصور اصولی طور سے قرآنی ہے۔ انہوں نے یہ تصور خودی کے نظریے سے مربوط کر کے پیش کیا ہے، اس میں صاحب ایمان انسان کو نائب حق اور مرد مومن سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اور قرآنی الفاظ میں عبد (جمع عباد) کہا گیا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اقبال کے نزدیک عبد اور عبدہ میں فرق ہے۔ عبد سے عام صاحب ایمان انسان اور عبدہ سے حضور سرور کائنات کی ذات مبارک مراد ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ لازمی ہے کہ اقبال کے یہاں انسان کامل کا جو تصور ہے وہ ابن عربی کے تصور انسان الکامل اور نطشے کے فوق البشر سے ماخوذ ہے، جیسا کہ انہوں نے خود تشریح فرمائی ہے۔ یہ کارلائل کے ہیرو سے بھی مختلف ہے اور یہ Chrismatic Person سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس میں عبدہ بتول اقبال چیزے دیگر مگر محض عبد بھی یقین وایمان کی توانائی سے اوپر اٹھتا اور اطاعت اور ضبط نفس کے ذریعے نائب حق کے منصب پر فائز ہو کر ستاروں سے بھی آگے بڑھ جانے کی آرزو رکھتا ہے۔

خودی'' اور'' رموز بے خودی'' میں موجود ہے اور بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے یہاں انسان خدا کا مطلوب ہے۔ زبور عجم کا یہ مصرع اس کی تائید میں ہے:

ما از کدای گم شدہ ایم او جستجو است

اور یہ بھی کہ:

خدا ہم در تلاش آدمی ہست

مرشد رومی تو ''انسانم آرزوست'' کہتے کہتے ممکن ہے کامیاب ہو گئے ہوں۔ لیکن اقبال کا انسان لاہوت کی جانب گرم پرواز ہے۔ وہ اس شاہین کو دام میں لانا چاہتا ہے جو سدرۃ المنتہیٰ اور اعلیٰ علیین سے بھی آگے لامتناعی کی فضا میں کہیں ہے جس کا نشان نہیں پایا جا سکتا لیکن اقبال کہتے ہیں:

یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

انسان کے مقامات بلند کا یہ اعتراف اس کے بار امانت، ذوق وشوق عشق اور ایمان ویقین کی وجہ سے ہے جو یومنون بالغیب کے مصداق، یقین کے مقناطیس سے ان حقائق پر بھی آہنی گرفت رکھتا ہے جو ہنوز مرئی ومحسوس نہیں مگر اس کا قلب گواہی دیتا ہے کہ یہ سب سچ ہے، یہ سب سچ ہے، عبدہ کائنات اور خدا تینوں حقیقت ہیں اور عبدہ (بقول ابن عربی) فردیت بصورت اعلیٰ کے مقام پر متمکن ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ افراد صاحب یقین واعتماد تبھی بن سکتے ہیں جب انہیں اپنے منصب کا گہرا شعور ہو وہ تعلق باللہ کی گہری تصدیق قلبی رکھتے ہوں اور مقدس تکون (خدا، کائنات اور انسان) کے باہمی ربط کو ناگزیر سمجھ کر زندگی کو تفریق وتجزی (یعنی جزء جزء دیکھنے) کے بجائے اسے سالم اور کل کے طور پر دیکھتے ہوں۔ وہ یومنون بالغیب ہوں اور دنیا کو اس کے تابع، بامقصد اور بامعنی بناتے ہوں۔ وہ خود کو مکلف اور ذمہ دار مانتے اور کائنات کو خدا کی کتاب سمجھ کر عقبیٰ وآخرت میں اعتقاد رکھتے ہوں اور خدا کی حکمتوں کے عملی شارح اور اوصاف خداوندی کا عملی نمونہ بن جائیں۔ اس منزل کی طرف رہنمائی عقل محض نہیں کر سکتی اس کے لیے ذوق وروحانی تجربہ ایمان درکار ہے جو تصدیق کے بعد ذکر وفکر سے جلا پاتا ہے۔ قرآن مجید کی رہنمائی یہی ہے اور یہ آیات اس کی گواہی دیتی ہیں۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف اللیل والنہار لایت لاولی الباب O الذین یذکرون اللہ قیماً وقعوداً وعلی جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحنک فقنا عذاب النار O

(آل عمران 3 (190-191)

ترجمہ:

''بیشک آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے (اور کہتے) ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ (عبث) نہیں پیدا کیا تو پاک ہے، تو (قیامت کے دن) ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو''

درحقیقت انہی عناصر سے ایک ''آتھینٹک فرد'' کی ساخت ہوتی ہے مگر اس کے لیے چشم باطن کا ہونا ضروری ہے۔

اور اب اسی آیت پر اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

انسان کا تصور قبل از اسلام

انسان کا تصور قبل از اسلام

اسلام کے قبل جتنے بھی داعیان حق مبعوث ہوئے ان کو ان کے پیرووں نے بتوں کی صف میں شامل کر دیا اور ان کی اصلی تعلیمات کو مسخ کر کے خود ان ہی کو خدا تسلیم کر لیا اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ اپنی ہر آرزو کو الگ الگ خداؤں کے نام سے پوجا اتنا ہی نہیں اپنے ہاتھوں لاتعداد صنم تراشے اور پھر انہیں تراشیدہ پتھروں سے مرادیں مانگیں۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسول ﷺ کی بعثت سے قبل ساری دنیا اپنی عظمت اور انسان کی برگزیدگی کو فراموش کر کے، انسانوں، پتھروں مہیب اور دلکش نظاروں کی پرستش میں محو تھی۔ انسان کی بے ضابطہ زندگی قتل وغارت گری، زناکاری، عیاشی، ظلم، بے انصافی صغیری اور بے جہتی کا شکار تھی۔

''دنیا کے کسی پیشوائے دین کی زندگی کو لے لو۔ تم دیکھو گے کہ اس ذات پر سب سے زیادہ ظلم خود اس کے معتقدین ہی نے کیا ہے۔ انہوں نے اس پر اپنے تخیلات واوہام کے اتنے پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کی شکل وصورت دیکھنا بالکل محال ہو گیا۔ صرف یہی نہیں کہ ان کی اصلی تعلیم کیا تھی؟ بلکہ ہم ان سے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ خود اصل میں کیا تھے؟ ان کی پیدائش میں اعجوبگی، ان کی زندگی کی ہر ہر بات میں اعجوبگی۔ غرض ابتداء سے لے کر انتہا تک وہ ایک افسانہ ہی افسانہ نظر آتے ہیں اور انہیں اس شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ یا تو وہ خود خدا تھے یا خدا کے بیٹے، یا خدا ان میں حلول کر گیا تھا یا کم از کم وہ خدائی میں کسی حد تک شریک وسہیم تھے۔ مثال کے طور پر گوتم بدھ کو دیکھو۔ بدھ مذہب کے نہایت گہرے مطالعہ سے صرف اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس اولوالعزم انسان نے برہمنیت کے بہت سے نقائص کی اصلاح کی تھی اور خصوصیت کے ساتھ ان بے شمار ہستیوں کی خدائی کا بطلان کیا تھا جن کو اس عہد کے لوگوں نے خدا بنا لیا تھا مگر ان کے انتقال کی پوری ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ ویسالی کی کونسل میں ان کے پیرووں نے ان کی تمام تعلیمات کو بدل ڈالا۔ ایک طرف بودھ کے نام سے اپنے مذہب کے ایسے عقائد مقرر کئے جن میں سرے سے خدائی کا وجود ہی نہ تھا اور دوسری طرف بودھ کو عقل کل، مدار کائنات اور ایک ایسی ہستی قرار دے دیا جو ہر عہد میں دنیا کی اصلاح کے لئے ایک بدھ بن کر آیا کرتی ہے۔ یہی سلوک شری رام کے ساتھ ہوا۔ رامائن کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رام چندر جی محض ایک انسان تھے اور عدل وشجاعت، فیاضی اور زہد وتقویٰ سے متصف ہونے کے باوجود ان میں الوہیت کا شائبہ تک نہ تھا لیکن بشریت اور ان اعلیٰ صفات کا اجتماع ایک ایسا معمہ ثابت ہوا کہ اہل ہند کی عقل اس کو حل نہ کر سکی اور رام چندر جی کی وفات کو ایک زمانہ گزرنے کے بعد یہ عقیدہ تسلیم کر لیا گیا کہ ان کے اندر وشنو نے حلول کیا تھا شری کرشن اس معاملہ میں ان دونوں سے زیادہ مظلوم ہیں۔ بھگوت گیتا تحریف وتنسیخ کے کئی مرحلوں سے نکل کر جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے اس کے عمیق مطالعہ سے کم از کم اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی ایک موحد تھے اور انہوں نے ہستی باری تعالیٰ کے ہمہ گیر، قادر مطلق اور شدید القویٰ ہونے کا وعظ کہا تھا، لیکن مہابھارت، وشنو پران بھاگوت پران وغیرہ کی کتابیں اور خود گیتا ان کو اس طرح پیش کرتی ہے کہ ایک طرف وہ وشنو کے جسمانی مظہر خالق موجودات اور مدبر کائنات نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان سے ایسی کمزوریاں منسوب کی جاتی ہیں کہ انہیں خدا تو خدا پاکیزہ واخلاق کا انسان بھی تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بھاگوت پران کرشن جی کو اس شکل میں پیش کرتی ہے کہ وہ نہانے میں گوپیوں کے کپڑے چھپا لیتے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنے کئی جسم پیدا کر لیتے ہیں اور جب سوک رشی سے راجہ پرکشت پوچھتا ہے کہ خدا تو اوتار کی شکل میں اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ سچا دھرم پھیلائے، پھر یہ کیسا خدا ہے کہ دھرم کے تمام اصولوں کے خلاف دوسروں کی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے؟ تو رشی کو یہ اعتراض رفع کرنے کے لئے اس حیلہ کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے کہ خود دیوتا بھی بعض اوقات نیکی کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں مگر ان کے گناہ ان کی ذات پر اس طرح اثر نہیں کرتے جس طرح آگ تمام چیزوں کو جلانے کے باوجود مورد الزام نہیں ہو سکتی۔ کسی سلیم العقل آدمی کو ایک لمحہ کے لئے بھی شری کرشن جیسے بلند پایہ معلوم دین کے متعلق یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہوگا اور نہ وہ یہ مان سکتا ہے کہ ان کی اخلاقی

والسلام پر کیا گیا ہے۔حضرت عیسیٰ ویسے ہی ایک انسان تھے جیسے انسان ہوا کرتے ہیں، بشریت کی تمام خصوصیتیں ان میں بھی اسی طرح موجود تھیں جس طرح ہر انسان میں ہوتی ہیں۔فرق صرف اتنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت ونبوت اور اعجاز کی قوتیں عطا فرما کر ایک بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کے لئے مامور فرمایا تھا لیکن اول تو ان کی قوم نے ان کو جھٹلایا اور پورے تین سال بھی ان کے وجود مسعود کو برداشت نہ کرسکی یہاں تک کہ عین عالم شباب میں انہیں قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور جب ان کے بعد ان کی عظمت کی قائل ہوئی تو اس قدر حد سے تجاوز کرگئی کہ ان کو خدا کا بیٹا بلکہ عین خدا بنادیا اور یہ عقیدہ..... ان کی طرف منسوب کیا کہ خدا مسیح کی شکل میں صلیب پر چڑھ کر انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے، کیوں کہ انسان فطرتاً گنہگار تھا اور خود اپنے عمل سے اپنے لئے نجات حاصل نہیں کرسکتا تھا.....ان مختلف قوموں نے اپنے پیشواؤں اور اپنے ہادیوں کی شخصیتوں پر جتنے بہتان اور افترا کے پردے چڑھا لئے ہیں، ان کی اصل وجہ یہ ہے کہ اول تو اکثر بزرگوں نے اپنے پیچھے کوئی ایسی کتاب ہی نہیں چھوڑی ہے جس میں ان کی تعلیمات اور خود ان کی شخصیت کے متعلق تمام ضروری باتوں کو بوضاحت بیان کردیا ہو اور اگر کسی نے کوئی کتاب چھوڑی بھی ہے تو اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا اس لئے تھوڑا زمانہ گزرنے کے بعد اس میں تحریف وتحریم ہوگئی، اصل اور جعل میں امتیاز کرنا محال ہوگیا۔''

اسلامی تصور مرد مومن

اسلام کی بنیادی تعلیمات بڑی سادہ اور سہل ہیں اور بظاہر مسلمان ہونا حد درجہ آسان ہے۔ اگر کوئی خدا کی وحدت، محمد مصطفےٰ (اور کُل انبیائے ماسبق) کی رسالت اور قیامت کو مانتا ہے۔فرشتوں کے وجود پر یقین رکھتا ہے تو بس وہ اصطلاحاً مسلمان ہے۔لیکن صحیح معنوں میں ان سادہ اور گہری حقیقتوں کا عرفان بہت آسان نہیں ہے۔جب مومن اپنی زبان سے کلمہ طیبہ پڑھتا ہے۔

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

تو وہ تین باتوں کا اعلان کرتا ہے(۱) کوئی خدا نہیں ہے (۲) ایک خدا کے سوال (۳) محمد صلعم خدا کے نبی ہیں۔

جب وہ یہ کہتا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے تو اس سے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ خدائے واحد کے سوا کسی بھی طاقت وقوت کے سامنے وہ سجدہ ریز ہونے کو تیار نہیں۔وہ محض ایک قادر مطلق کو جانتا ہے جو اس کائنات کا مالک حقیقی ہے، وہی قوت کا سرچشمہ ہے باقی تمام تصور خدا باطل ہے۔بُت شکنی کا یہ اعلان بڑا ہی صبر آزما ہے کیونکہ یہ دنیا دار الامتحان ہے دنیا میں ہر دعوے کے لئے امتحان دینا شرط ہے۔ جب اپنی زبان سے کوئی یہ کہے کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں عین اسی وقت امتحان شروع ہوجاتا ہے۔کبھی سونے چاندی کا بُت کبھی بظاہر عظیم اور بباطن ویران اور غیر آباد شخصیتوں کا جبر، کبھی شہ زور انسانوں کی سرزنش، کبھی حاکم وقت کا دباؤ، کبھی مصائب کے پہاڑ، تو کبھی وسوسوں کی ایک لامتناہی دنیا، کبھی افلاس کا بھیانک چہرہ، تو کبھی فطرت کے بے رحم ہاتھ اس کی گردن کو دبوچ لینا چاہتے ہیں۔اس موڑ پر جس انسان نے محض زبان سے یہ اقرار کیا ہوتا ہے وہ خود کو خود ساختہ خداؤں کے حوالے کرکے اپنی عظمت کا اعلان واپس لے لیتے ہیں اور جو قلب ونظر کی گہرائیوں سے اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے وہ اپنے امتحان میں سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے حتیٰ کہ جانِ عزیز کو بھی داؤں پر لگا دیتا ہے کیوں کہ اسے اس امر کا یقین کامل ہے کہ خدائے حقیقی اس کے ساتھ ہے اور جب وہ اس امتحان میں پورا اترتا ہے۔اپنے دل کے تمام بت کدوں کو مسمار کرکے محض ایک خدائے واحد کو قلب میں جذب کرلیتا ہے تو باقی تمام خدا نما ہستیاں خود بخود غائب ہوجاتی ہیں اور اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرتا۔وہ بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے کی جسارت کا اہل ہوجاتا ہے اور جب خدائے واحد کو دل وجان سے اپنا لیتا ہے تو ماسوا کی تمام قوتوں سے انکار کردیتا ہے اس موڑ پر رضائے الٰہی کے سوا اس کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔اس کا ہر فعل خدائے واحد کی رضامندی کا تابع ہوتا ہے۔رضائے الٰہی یہ ہے کہ انسان دنیا میں خدا کا نائب ہے، خلیفہ ہے، ساری کائنات اس کے زیر نگیں ہے بشرطیکہ وہ خدا کے سوا کسی دوسری قوت کے سامنے سر نہ جھکائے اور ہمیشہ اس بات کا خیال رکھے کہ ساری دنیا کی تمام چیزیں صرف اس کے لئے ہیں مگر اس کا مالک حقیقی بھی ایک ہے مالک حقیقی جو کچھ چاہتا ہے اس کی ہر چاہت پر لبیک کہنا ہی اس کا فریضہ ہے۔اس طرح وہ اپنی عزیز سے عزیز ترین چیز کو بھی رضائے الٰہی کے سامنے حقیر ترین تصور کرتا ہے خدا جن چیزوں سے اسے روکتا ہے وہ ان کاموں سے اس لئے باز آتا ہے کہ اسے اس کا یقین ہے کہ وہ چیزیں عینی طور اس کے لئے مضر ہیں اور جن چیزوں کا حکم دیتا ہے وہ اس لئے کرتا ہے کہ یقیناً یہ چیزیں اس کے لئے مفید ہیں کیوں کہ خدا عالم الغیب ہے اور جب وہ خدا سے اس قدر پیار کرنے لگتا ہے تو پھر اسے اس کا قرب حاصل ہوجاتا ہے اور جب اسے قرب حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اس قلندر کو چھیڑنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔کیوں کہ اس کی قوت تسخیر نمو پذیر ہوکر اتنی کامل ہوجاتی ہے کہ اس کی ذات کا محاسبہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

پروفیسر محمد منور اپنی کتاب ''برہانِ اقبال'' میں علامہ اقبال۔مردِ یقین کے عنوان سے کچھ ایسی ایمان ویقین کی نوعیت کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پروفیسر محمد منور

کتاب: برہانِ اقبال

علامہ اقبال۔مردِ یقین

قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

''ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف فان اصابہ خیر، اطمئن بہ وان اصابتہ فتنۃ انقلب علی وجہہ، خسر الدنیا والاخرۃ ذالک ہوالخسران المبین ○''۔

(سورہ ۲۲، آیت ۱۱)

(لوگوں میں وہ شخص بھی تو ہے جو اللہ کی بندگی کا دم بھرتا ہے مگر عین کنارے پر رہتا ہے۔اگر بھلائی اور خیر میسر ہے تو وہ اللہ کے ضمن میں مطمئن ہے اور اگر آزمائش سے دوچار ہوا تو روگردانی اختیار کرلی۔اس نے دنیا بھی گنوائی اور آخرت بھی یہی وہ خسارہ ہے جسے صریح خسارہ کہتے ہیں)

حق یہ ہے کہ بنو آدم کی اکثریت کو اپنے نظریات وعقائد سے لگاؤ تو ہوتا ہے مگر وہ لگاؤ یقین کی صورت بالعموم اختیار نہیں کرسکتا۔قرآن کریم کی محولہ بالا آیت کریمہ میں خالق نوع انسان نے انسانی نفسیات کی ایک ننھی سی تصویر پیش کی ہے جو واضح کرتی ہے کہ وہ آدمی صحیح معنوں میں صاحب ایمان نہیں ہے جو مرد امتحاں نہیں۔جو زبانی کلامی کسی اصول اور نظریئے کا ساتھ دیتا ہے مگر اس کا دل قائم نہیں ہوتا۔جب تک سب خیریت کا سماں رہے وہ حاضر، وہ صاحب اصول، وہ صاحب ایثار، لیکن جونہی اس اصول اور نظریئے کی پاسبانی کے معاملے میں آزمائش وامتحان سے واسطہ پڑا وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ایسا شخص کہیں کا بھی نہیں رہتا۔نہ بندوں کے اعتماد کے لائق نہ دنیا میں بھی عزت پائے اور نہ اللہ کی رحمت کے قابل کہ اگلے جہاں میں نوازا جائے۔اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہوسکتا ہے۔بقول حضرت علامہ:

زباں سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

حضرت امام احمد حنبل سے مروی ہے کہ ایک بدو نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ''آپؐ نے فلاں کو نوازا اور مجھے محروم رکھا''۔آپؐ نے جواب میں فرمایا ''وہ شخص مرد مومن ہے''۔بدو نے کہا ''میں بھی تو مومن ہوں''، آپ نے ارشاد فرمایا۔''بھئی تم تو محض مسلم ہو کیا یہ ٹھیک نہیں؟''

اس سے واضح ہوا کہ اقرار زبانی اور شے ہے اور تصدیق قلبی اور۔قرآن پاک میں آتا ہے:

''قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم''

''یہ..... صحرانشیں (بدو) کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ (اے رسولؐ) کہہ دیجئے کہ تم لوگ ایمان ہیں لائے۔ البتہ تم یہ کہو کہ ہم اسلام لائے، اس لئے کہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہوا ہی نہیں۔''

پتہ چلا کہ از روئے قرآن اسلام اور ایمان دو درجے ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کے بقول ''ان الایمان غیر الاسلام'' یعنی ایمان اور شے ہے اور اسلام اور، اوپر درج کردہ آیت قرآنی کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا معنی ٹھہر انظر یئے اور اصول کا تسلیم کر لینا، اور ایمان کا مطلب ہوا نظریہ و اصول کا دل میں اتر جانا۔ کسی امر کا زبانی تسلیم کر لینا، مان لینا اور بات ہے اور اس پر پختہ اعتماد ہونا بالکل دوسرا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شے دل میں اترتی ہے وہی فکر و عمل کو متاثر کرتی ہے وہی شخصیت کو متغیر کرتی ہے۔ اگر معاملہ قرار زبانی سے آگے نہ بڑھے تو گویا جو کچھ زبان نے کہا یا مانا وہ صرف معلوم کا ایک حصہ اور جزو بن کر رہ گیا، یعنی اس سے علم میں اضافہ ہو گیا اور بس۔ اس اضافے سے طرز عمل متاثر نہیں ہوتا، زندگی اور کائنات کے بارے میں نقطہ نظر نہیں بدلتا، اعمال کو پختہ عقائد بدلتے ہیں۔ حضرت علامہ کہتے ہیں۔

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الہ الا
لغت غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی

یعنی توحید کو زبانی مان لینا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اس کا مطلب سمجھ ہی میں نہیں آتا، گویا کلمہ طیبہ کسی غیر زبان کا لفظ ہے۔ عجم تو ایک طرف رہے، اگر دل گواہی نہ دے تو لا الہ الا اللہ کا مفہوم خود عربوں پر بھی واضح نہیں ہوتا خواہ یہ کلمہ انہی کی مادری زبان کے حروف سے متشکل ہوا ہو۔

اسلام کا تصور

جب انسانیت ارتقا کے مراحل طے کرتی ہوئی اس لائق ہو چکی کہ وہ آفاق گیر پیمانے پر ایک انداز میں حقائق کا مشاہدہ کر سکے اور رہتی دنیا تک ایک نظام حیات کی احتیاج محسوس کر سکے تب خالق کائنات نے آخری نبی کو مکمل دستور حیات کے ساتھ مبعوث فرمایا اور اس کے بعد ختم نبوت کا اعلان کر دیا۔ اس اعتبار سے بھی داعی اسلام کا مرتبہ تمام انبیا کے درمیان افضل ترین ہے کیونکہ ان کی دعوت میں حد درجہ عمومیت موجود ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس وقت انسانیت آفاقی سطح پر اس تعلیم کو قبول کرنے کی اہل ہو چکی تھی۔ اس کا سب سے دلچسپ ثبوت یہ ہے کہ فطرت قرآن کے نزول کے قبل تک قرآنی تعلیمات کو قبول کرنے اور اسے عمومیت بخشنے کے لئے فضا ہموار کرنے میں مصروف نظر آتی ہے۔ ساری دنیا کی تمام قومیں رفتہ رفتہ اپنے انبیا کی اصلی تعلیمات کو فراموش کر چکی ہیں اب ان کے قلب و جگر میں الوہی پیغام کی روشنی باقی نہیں، کہیں کہیں بعض کرنیں نظر بھی آتی ہیں تو وہ اتنی ترچھی ہیں کہ زندگی کی سلامت روی میں معاون ثابت نہیں ہو سکتیں۔ صدیوں سے حیات کی پُر پیچ ڈگر پر چلتی ہوئی انسانیت اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اندھیرے غاروں میں گر چکی ہے۔ انسان اپنی عظمت کو بھول چکا ہے۔ اس کی جبلت میں خدا پرستی کے جذبات اب بھی ویسے ہی موجزن ہیں اس لئے تلاشِ خدا میں وہ ہر طاقت قوت کو پوجنے پر آمادہ ہے۔ وہ اپنے سے برتر انسانوں کی پوجا کو روا رکھتا ہے۔ بے ضابطہ حیات کی وجہ سے عالمگیر پیمانہ پر انسانوں کا اخلاق اتنا گر چکا ہے کہ فطری طور پر اس کی تعمیر نو کی احتیاج درپیش ہے۔ ساری دنیا کا انسان اس موڑ پر اپنی کھوئی ہوئی انسانیت کے حصول کا محتاج نظر آتا ہے۔ میرے اس دعوے کی تصدیق کے لئے متعلقہ عہد کی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ الغرض تمام نوع بشری اپنے ہی جیسے انسان کی پوجا میں مصروف ہے یا پھر اپنے ہی ہاتھوں تراشے ہوئے پتھروں کے صنم کے سامنے سربسجود ہے۔ انسانی عظمت چکنا چور ہو چکی ہے۔ جس انسان کو خدا نے اس دھرتی پر اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے وہ جنوں بھوتوں اور جابر بادشاہوں کو خدا تسلیم کئے بیٹھا ہے، اپنی گزشتہ کہانی اس کے حافظے میں قطعی موجود نہیں، وہ دیومالائی انسانوں کے درمیان گھرا ہوا مجبور اور مقہور انسان نظر آتا ہے۔ اس کی حالت اتنی دردناک ہے کہ اسے اپنا مقام و مرتبہ بھی یاد نہیں، وہ حیات کے ہر موڑ پر سہارے کے لئے ایک خدا چاہتا ہے لیکن جتنے زیادہ خداؤں کے سامنے اسے جھکنا پڑتا ہے۔ اس کی شخصیت اسی تناسب سے ریزہ ریزہ ہوتی جاتی ہے اور اخیر میں زندگی کو لعنت سمجھ کر وہ اس سے گریز کرنا چاہتا ہے کہ اسی اثناء میں اس کے کانوں میں عرب سے ایک آواز سنائی پڑتی ہے جو اس کے اندر نئی روح پھونک دیتی ہے اور اس کے ذات کے اندر کی تمام خوابیدہ صلاحیتیں ایک ہی آواز پر بیدار ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پھر سے مجتمع کر لیتا ہے اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھ جاتا ہے۔ دعوتِ اسلام کی عمومیت کے متعلق مولانا مودودی رقمطراز ہیں۔

عمومیت

''داعی اسلام کی یہ عظیم الشان خدمات کسی ایک قوم یا ایک ملک کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام نوع بشری کے لئے عام ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں صاف کہا گیا ہے کہ:۔

''اے نبی ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔'' (قرآن: ۳۴-۲۸)

یہ خصوصیت نبی کریم کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ آپ سے قبل جتنے انبیا اور بانیانِ مذاہب دنیا میں آئے، ان سب کا پیغام محض ایک قوم کے لئے مخصوص تھا اور ان میں سے کسی نے خود بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کا پیغام تمام عالم انسانیت کے لئے ہے۔ مسیحیت کو حضرت عیسیٰ کے بعد عالمگیر مذہب قرار دیا گیا، ورنہ خود حضرت مسیح نے اپنی زندگی میں ہمیشہ یہی کہا کہ میں اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ یہودیت خود اپنے اعتراف کے مطابق بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہے اور توریت میں کہیں غیر اسرائیلی دنیا کو خطاب نہیں کیا گیا ہے، غیر کتابی مذاہب میں بودھ مت کو تین صدی بعد اشوک نے عالمگیر مذہب بنانے کی کوشش کی، ورنہ خود اس مذہب کی محرف کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ بودھ کا مشن محض ہند کے برہمنی مذہب کی اصلاح تک محدود تھا، اسی طرح دنیا کے دوسرے ادیان و ملل میں بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ ان کی دعوت صرف ایک قوم یا ملک کے لئے مخصوص رہی ہے لیکن یہ شرف تنہا داعی اسلام کو حاصل ہے کہ اول دن سے اعلان کیا کہ:

''یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمعیا'' (۷:۲۱)

''اے لوگو! میں تم سب کے اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ داعی اسلام کا مشن تمام دنیا کے لئے عام کیوں ہے؟ ایک مستقل دفتر چاہتا ہے اور یہاں پر مفصل بحث کی گنجائش نہیں ہے، فی الحال صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ داعیان اسلام نے جب تمام ادیانِ سابقہ اور ان کی کتابوں کو فی الاصل تسلیم کر لیا اور انہیں سے کسی کو بھی اپنی اصلی صورت میں جھوٹا نہیں ٹھہرایا تو اس کے ساتھ ہی آپ نے ان تمام خوبیوں کو جو دنیا کے کسی مذہب میں موجود ہیں مع مشتی زاید اسلام میں جمع کر لیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تقابلِ ادیان کا کوئی متعلم انکار نہیں کر سکتا پس جب اسلام میں ہر مذہب کا بہترین تعلیمی حصہ موجود ہے اس کے علاوہ وہ خوبیاں بھی موجود ہیں جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہیں تو لامحالہ یہ لازم آیا کہ اسلام کے آجانے کے بعد نوع بشری کسی دوسرے مذہب کی محتاج نہیں ہے۔

داعی اسلام کی اخلاقی خصوصیات

اس سلسلے میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا اقتباس پیش خدمت ہے:۔

''آخری سوال جو قرآن سے پوچھنا یہ ہے کہ اس کا لانے والا ذاتی طور پر کس قسم کے اخلاق کا انسان تھا؟ اس سوال کے جواب میں قرآن مجید نے دوسری کتابوں کی طرح اپنے لانے والے کی تعریف کے پُل نہیں باندھے ہیں بلکہ محض دوسرے مباحث کے ضمن میں آنحضرت کی صرف چند اخلاقی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس اشارہ سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وجود

(۱) وہ بتاتا ہے کہ اس کالانے والا ایک ایسا راسخ العزم مستقیم الارادہ اور اللہ پر ہر حال میں بھروسہ رکھنے والا انسان تھا کہ جس وقت اس کی ساری قوم اسے مٹانے پر آمادہ ہوگئی اور وہ صرف ایک مددگار کے ساتھ ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تو ایسی سخت مصیبت میں بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے عزم پر قائم رہا:۔

"جب کافروں نے اس کو نکال دیا جب کہ وہ غار میں صرف ایک آدمی کے ساتھ تھا تو وہ اپنے ساتھی سے کہتا تھا کہ رنج وفکر نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے (ق ۹:۶)

(۲) وہ بتاتا ہے کہ اس کالانے والا ایک نہایت فراخ حوصلہ اور فیاض انسان تھا جس نے اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی بخشش کی دعامانگی اور آخر اللہ تعالیٰ کو اسے یہ اپنا قطعی فیصلہ سنا دینا پڑا کہ وہ ان لوگوں کو نہیں بخشے گا۔" چاہے تم ان کے لئے مغفرت مانگو چاہے نہ مانگو اگر تم ستر بار بھی ان کے مغفرت مانگو گے تو اللہ ان کو نہ بخشے گا۔"

(۳) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کا مزاج نہایت نرم تھا، وہ کبھی کسی کے ساتھ درشتی سے پیش نہیں آتا تھا اور اسی لئے دنیا اس کی گرویدہ ہوگئی تھی۔

"اللہ کی رحمت سے تم ان کے ساتھ نرم ہو، ورنہ اگر تم سخت کلام، بخث دل ہوتے تو وہ تمہارے اردگرد سے منتشر ہوجاتے۔" (ق ۴:۱۷)

(۴) وہ بتاتا ہے کہ اس کالانے والا اپنی اُمت کو راہِ راست پر لانے کی سچی تڑپ دل میں رکھتا تھا اور ان کی گمراہی پر اصرار کرنے سے اس کی روح کو صدمہ پہونچتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ انہیں کے غم میں گھلا جاتا تھا۔

"اے نبی اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو کیا تو اپنی جان کو ہلاک کردے گا۔"

(۵) وہ بتاتا ہے کہ اسے کے لانے والے کو اپنی اُمت سے بے حد محبت تھی۔ وہ ان کی بھلائی کا چاہنے والا تھا۔ ان کی مصیبت اور تکلیف سے کڑھتا تھا اور ان کے حق میں سراپا رحمت ہی رحمت تھا۔

"تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے جسے تمہاری تکلیف ومصیبت شاق گزرتی ہے جسے تمہاری فلاح وبہبود کی حرص دامن گیر رہتی ہے اور جو ایمان داروں کے ساتھ مہربان اور رحیم ہے۔" (ق ۹۔۱۶)

(۶) وہ بتاتا ہے کہ اس کالانے والا راتوں کو سونے کی بجائے گھنٹوں اللہ کی عبادت کیا کرتا اور خدا کی یاد میں کھڑا رہتا تھا۔

"اے نبی تمہارا رب جانتا ہے کہ تم رات کے دو تہائی اور کبھی ایک نصف اور کبھی ایک تہائی حصہ تک کھڑے رہتے ہو۔ (ق ۷۳:۲)

(۷) وہ بتاتا ہے کہ اس کالانے والا صرف اپنی ہی قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کے لئے اللہ کی طرف سے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔

"اے نبی ہم نے تم کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" (ق ۲۱۔۷)

(۸) وہ بتاتا ہے کہ اس کالانے والا ایک سچا انسان تھا نہ کبھی اپنی زندگی میں راہِ حق سے بھٹکا نہ فاسد خیالات سے متاثر ہوا اور نہ ایک لفظ خواہش نفس کی پیروی میں بھی کبھی زبان سے نکالا۔

"لوگو! تمہارا صاحب نہ کبھی سیدھی راہ سے بھٹکا اور نہ صحیح خیالات سے بہکا اور نہ وہ خواہش نفس سے بولتا ہے۔" (ق ۵۳۔۱:)

(۹) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کی ذات تمام عالم کے لئے قابلِ تقلید نمونہ تھی اور اس کی زندگی کمالِ اخلاق کا صحیح معیار تھی:۔

"تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے۔" (ق ۳۳۔۲:)

قرآن مجید کا تتبع کرنے والے صاحب قرآن کی بعض اور خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے لیکن اس مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

رسول اللہ کے اخلاق حسنہ کا یہ مختصر سا قرآنی خاکہ محض اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ ہمارے رسول مقبول صلعم نے تا حیات اپنے متعلق کوئی ایسا کلمہ نہ کہا جس سے ان کی شخصیت پر اعجوبگی اور توہم پرستی کا کوئی غلاف چڑھایا جا سکے۔ آپ کی ذات سے معجزے بھی رونما ہوئے ساری حیات محیر العقول کارناموں پر محیط ہے۔ پوری زندگی بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ یہاں تک کہ کفار اور مشرکین آپ کی باتیں سن کر اور آپ کے اقدامات دیکھ کر سکتے میں آگئے۔

"ان لوگوں نے کہا یہ شاعر ہے لیکن بہت جلد محسوس کرلیا یہ شعر خوانی تو نہیں کرتا۔ کہنے لگے یہ کاہن ہے لیکن بہت جلد ان پر واضح ہوگیا کہ کاہنوں کی طرح شعبدہ بازی اس کا شیوہ نہیں، کہہ اٹھے یہ جادوگر ہے لیکن بہت جلد ان پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ اس میں جادو کی تو کوئی بات نہیں، یہ تو انہیں جیسا ایک شخص ہے جو اپنی ذات کے نفع وضرر پر کوئی قدرت نہیں رکھتا، زمین پر اسی طرح چلتا ہے جس طرح دوسرے لوگ چلتے ہیں اپنی روزی اسی طرح کماتا ہے جس طرح دوسرے لوگ کماتے ہیں۔ یہ کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ میں کوئی علم غیب نہیں جانتا بجز اس کے جو خدا خود بتادے آخر لاجواب ہوکر اپنے دل کو تسکین وتسلی دینے کے لئے کہہ اٹھے، یہ دیوانہ ہے لیکن خود ہی سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اس میں جنون اور دیوانگی کی کوئی بات نہیں...... یہ ان تدبیروں اور فکروں میں غرق اور منہمک تھے اور یہ شخص اپنے کام میں لگا تھا اس پر بدستور قرآن نازل ہورہا تھا...... جو اُمی ہونے کے باوجود یہود ونصاریٰ اور مشرکین سے بدلائل واضحہ قاطعہ جدال ہورہا تھا، ان لوگوں کے لئے ایک دردسر بن گیا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ نرمی کے برتاؤ سے رام کرلیں مگر کامیاب نہ ہوسکے، تشدد اور قوت کے بل پر اسے دبانا چاہا مگر ناکام رہے اور خاص بات یہ ہے کہ یہ شخص ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کرکے چیلنج کرتا تھا کہ اگر کر سکیں تو قرآن کا مثل پیش کرکے دکھائیں۔ اس چیلنج کو قبول کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ سعی بسیار کے باوجود وہ قرآن کا مثل پیش کرنے سے قاصر رہے، البتہ عناد اور مخاصمت پر اور زیادہ پختہ ہوگئے اور اس سے بڑے بڑے معجزات وآیات کا مطالبہ کرنے لگے۔

"ہم فرد فاقہ میں اور فلاکت میں مبتلا ہیں، اپنی نبوت کے زور سے ایک ہرا بھرا باغ فوراً تیار کردیجئے جس میں کھجور کے درخت ہوں، انگور ہوں نہری جاری ہوں چشمے بہہ رہے ہوں پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔" اللہ اور ملائکہ کا دیدار کرادیجئے ہم آپ نبی مان لیں گے۔ ہمارے اوپر یہ سقف نیلی رواق گرادیجئے تاکہ ہم سمجھیں واقعی آپ سچے ہیں۔

آسمان پر چڑھتے جایئے اور وہاں سے کتاب الٰہی لے کر تلاوت کرتے ہوئے آیئے۔

اپنے لئے چشم زون میں ایک فلک مرتبت ایوان تعمیر کرکے دکھادیجئے۔

ہمارے اوپر سیم وار کی بارش کرایئے۔

لیکن ان مطالبات کے جواب میں اس شخص کے منہ سے صرف ایک ہی بات نکلتی تھی:۔

"میں ان باتوں میں سے کسی پر قادر نہیں ہوں۔ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں، مجھے امتیاز جو کچھ حاصل ہے وہ یہ کہ اللہ نے رسالت کے لئے مجھے چن لیا ہے اور لوگوں کے پاس بشیرو نذیر بنا کر بھیجا ہے۔"

اس بحث کے بعد ہم پر بخوبی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اور ہر حال میں اپنی بشریت کا اعلان کیا ہے اور خدا کے علاوہ باقی ان تمام خدائی تصورات کو باطل ٹھہرایا ہے جو انسان کو حقارت ذلت اور سیاہ کاری کی تلقین کرتے ہیں جن سے شرک اور بت پرستی کو راہ ملتی ہے۔ رسولؐ نے ان تمام خصوصیات کو جو دیوتاؤں یا فوق البشر ہستیوں سے وابستہ تھیں، باطل ٹھہرایا اور اپنے قول وفعل سے اس حقیقت کی تصدیق کی کہ انسان اس کائنات میں اشرف المخلوقات ہے۔ اس کی عظمتوں کی کوئی انتہا نہیں یہ خدا کا نائب ہے۔ تمام کائنات کو مسخر کرنا اس کا مقصد ہے۔ دنیا کے سارے بُت اور دیوتا خود انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انسان تمام مخلوقات کے درمیان بزرگ وبرتر ہے۔ ساری کائنات اس کے تصرف میں ہے، اس لئے خدا کے سوا کسی غیر خدا کے سامنے سجدہ

کا رلا کر قوت تسخیر کو جہد مسلسل سے جلا بخشتا ہے اور خدائے واحد کا پرستار ہونے کی وجہ سے ہمیشہ خود کو اس کی نگہبانی میں محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے اس قدر راسخ العزم اور راسخ العقیدہ ہے کہ دنیاوی قوتوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اسے بس رضائے الٰہی چاہئے، وہ محض ایک خدا کی رضا و خوشنود حاصل کرنے کے لئے تمام فرضی خداؤں کا بطلان کرتے ہوئے لا الہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ وہ ایک سچے نائب کی طرف اپنے فرائض کو انجام دیتا جاتا ہے۔ راہ میں حائل تمام چٹانوں سے وہ اس لئے بے نیاز رہتا ہے کہ اسے خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

نبی کی بشریت قرآن کی رو سے

''قرآن مجید نے سب سے پہلے جس مسئلہ کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت ہے آپ بعثت سے پہلے صدیوں کے معتقدات نے ایک طے شدہ مسئلہ بنا دیا تھا کہ انسان کبھی اللہ کا رسول اور نائب نہیں بن سکتا۔ دنیا کی اصلاح کے لئے جب ضرورت ہوتی ہے تو خدا انسان کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے یا کسی فرشتہ یا دیوتا کو بھیجتا ہے اور یہ کہ جتنے بزرگ دنیا میں اصلاح کے لئے آئے ہیں وہ سب کے سب فوق البشر ہستی تھے۔ اس عقیدے نے انسان میں اتنی گہری جڑیں پکڑ لی تھیں کہ جب کبھی اللہ کا کوئی نیک بندہ لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے لئے آتا تو سب سے پہلے لوگ حیرت سے پوچھتے تھے کہ یہ کیسا نبی ہے؟ جو ہماری طرح کھاتا، پیتا، سوتا اور چلتا پھرتا ہے؟ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ ہماری طرح تمام عوارض اس کو بھی لاحق ہوتے ہیں، بیمار ہوتا ہے، تکلیف اور راحت میں مبتلا ہوتا ہے اور رنج و مسرت سے متاثر ہوا کرتا ہے؟ اگر اللہ کو ہماری ہدایت مقصود ہوتی تو وہ ہم جیسا کمزور انسان کیوں بھیجتا؟ کیا خدا خود نہیں آ سکتا تھا؟ کیا وہ کسی اور فوق البشر ہستی کو نہیں بھیج سکتا تھا؟ یہ سوالات ہر نبی کی بعثت پر پیدا ہوئے تھے اور جب لوگوں کی عقلیں انہیں حل کرنے سے عاجز ہو جاتی تھیں تو وہ اس کا انکار کر دیا کرتے تھے۔ حضرت نوح جب اپنی قوم کی طرف پیغام لے کر آئے تو کہا گیا:

''یہ شخص اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم ہی جیسا ایک انسان ہے وہ تم پر فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے حالانکہ اگر وہ (خدا) چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا یہ انوکھی بات تو ہم نے اپنے بزرگوں سے کبھی نہیں سنی۔'' (قرآن کریم ۔۲۳:۲۴)

جب حضرت ہود اپنی قوم کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تو ان پر بھی سب سے پہلے یہی اعتراض ہوا۔

''یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک بشر ہے، تم ہی جیسا، وہی چیز کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی چیز پیتا ہے جو تم پیتے ہو، اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو بڑے ٹوٹے میں رہو گے (قرآن کریم ۲۳ ۔۲)

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس صداقت کا پیغام لے کر پہنچے تو ان سے بھی اسی بنا پر جو دو انکار کیا گیا کہ:

''کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں (ق ۲۳:۴۷)

چنانچہ ٹھیک یہی سوال اس وقت بھی اٹھا جب مکہ کے ایک اُمی انسان نے ۴۰ برس خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد دفعتاً اعلان کیا کہ ''یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا (اے لوگو! میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں) لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ ایک شخص جو ہماری طرح پاؤں، آنکھ، ناک اور جسم و جان رکھتا ہے کیوں کر اللہ کا رسول ہو سکتا ہے وہ حیران ہو کر پوچھتے تھے کہ:۔

''یہ کیسا رسول ہے؟ جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اگر اس پر فرشتہ اُترتا تو وہ اس کے ساتھ رہ کر لوگوں کو ڈراتا یا کم از کم اس کے لئے خزانہ اُتارا جاتا یا اس کے پاس باغ ہوتا جس کے پھل وہ کھاتا۔'' (ق: ۲۵ ۔۱)

پس اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اس عقیدے کی بیخ کنی کی اور دلائل کے ساتھ بتایا کہ انسان کی ہدایت کے لئے انسان ہی زیادہ موزوں ہو سکتا ہے کیوں کہ بعثت کا مقصود صرف تعلیم دینا ہی نہیں بلکہ خود عمل کر کے دکھانا ہے اور تقلید و پیروی کے لئے ایک نمونہ پیش کرنا بھی ہے اور اس مقصد کے لئے اگر فرشتہ یا اور کوئی فوق البشر ہستی بھیجی جائے جس میں بشری خصائص اور کمزوریاں موجود نہ ہوں تو انسان کہہ سکتا ہے کہ ہم کی طرح کیوں کر عمل کر سکتے ہیں جبکہ وہ ہماری طرح نفس اور نفسانی خواہشات ہی نہیں رکھتا اور اس کی فطرت میں وہ قوتیں ہی نہیں جو انسان کو گناہ کی طرف راغب کرتی ہیں۔

''ہاں اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے آباد ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے بھی فرشتے ہی اُتارتے'' (ق ۱۷ ۔۱۱)

اس سے پہلے جتنے انبیا اور ہادیان برحق مختلف قوموں پر بھیجے گئے ہیں وہ سب اسی طرح انسان تھے جس طرح محمدؐ ہیں اسی طرح کھاتے اور چلتے پھرتے ہیں جس طرح ہر انسان کھاتا اور چلتا پھرتا ہے۔

''ہم نے تم سے پہلے جن لوگوں کو بھیجا تھا وہ بھی آدمی ہی تھے جن پر ہم نے وحی نازل کی تھی، اس حقیقت کو اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو ہم نے ان انبیا کو ایسے جسم نہیں دیئے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ غیر فانی تھے۔'' (ق: ۲۱ ۔۱)

''اور ہم نے تم سے پہلے جتنے بھی پیغمبر بھیجے ہیں، وہ سب یقیناً کھانا کھاتے تھے اور سڑکوں پر چلتے پھرتے تھے۔'' (ق: ۲۵ ۔۲)

''اور ہم نے تم سے پہلے تمام ایسے ہی رسول بھیجے ہیں جن کے بیوی بچے تھے۔'' (ق ۱۳ ۔۶)

اس کے بعد رسول اللہ کو حکم ہوا کہ تم خود بھی اپنے بشر ہونے کا صاف اعلان کر دو تا کہ تمہارے بعد لوگ تم کو الوہیت سے متصف نہ کرنے لگیں چنانچہ قرآن مجید میں متعدد جگہ یہ آیت آئی ہے کہ:

''اے محمدؐ کہہ دیجئے کہ میں تو محض ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا وہی ایک خدا ہے۔''

(ق: ۱۸ ۔۲)

ان تصریحات نے نہ صرف رسول اللہ ہی کے متعلق حلول اور ابنیت اور عینیت کے تمام فاسد عقائد کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ انبیا سابقین اور بزرگانِ ادیان کی ذات سے بھی اس غلط فہمی کا انتقا کر دیا۔

ارشادات قرآنی

قرآنِ حکیم نے انسان کے متعلق جتنی جامعیت اور وضاحت سے بحث کی ہے اس کے لئے مستقل ایک دفتر چاہئے اس لئے یہاں اپنی سہولت کے مطابق میں آیات اور احکام سے حوالے پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اسلام سے پہلے انسان یا تو ایک مجرم تھا یا پہلے گناہوں کی سزا کے طور پر اسے جینا تھا، یا وہ ہستی کے فریب میں مبتلا نظر آتا ہے یا پیدائشی گناہگار ہونے کی وجہ سے اس میں خیر کی سکت ہی نہیں ہے یا وہ محض بادشاہوں کی اطاعت کے لئے (یونان و روما) پیدا ہوا ہے اور جب کبھی ان بکھیڑوں سے اسے نجات بھی ملی ہے تو حیات کی راہ میں راہب، اسقف، کاہن، پاپا، پنڈت، پروہت، موبد، مغ اور اسی وضع قطع کی بیشمار ہستیاں اپنی پرستش کی طلبگار نظر آتی ہیں خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے نزول کے قبل حیوان تو حیوانوں کی غلامی سے آزاد تھے مگر انسان انسانوں کا ہی غلام نہ تھا وہ حیوانوں کی بھی پرستش میں مصروف تھا۔ قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ انسان خلیفہ الکائنات ہے:۔

''تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا تو زمین میں ایسے شخص کو نائب بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے۔ اور خونریزیاں

جانتے۔" (ق۔۳۰:۲)
(۲) "وہی قادر مطلق ہے جس نے تم کو زمین کا جانشین کیا اور بعض کو بعض پر درجوں میں فوقیت دی تا کہ جو نعمتیں تم کو دی ہیں ان میں تمہاری آزمائش کرے۔" (ق۔۶۶۔۶)
انسان اپنے افعال اور ارادے میں آزاد ہے:۔
(۳) ہم نے امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، انسانوں نے اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ بڑا ظلام وجہول ہے۔ (ق۔۲۷/۲۳)
(۴) انسان برگزیدۂ خدا ہے اور اس کی نگاہ (خدا) میں بہت قیمتی ہے۔" (ق۔۲۔۱۲۲)
(۵) اس کے بعد اس کے (آدم) رب نے اس کو اپنا برگزیدہ بنالیا اور اس کی طرف متوجہ ہوا (نگاہِ کرم کی اور راہِ (حق) دکھائی۔" (قرآن کریم)

انسان اگرچہ کمزور ہے اور اس میں عیوب ونقائص بھی ہیں مگر اس کے باوجود وہ اس دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہے اور یہ اتنا بڑا مرتبہ ہے جو قرآن سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ انسان ایک ذمہ دار ہستی ہے یہ جو کچھ کرتا ہے اس کا اثر یا نتیجہ اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔
(۶) اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے ہی لئے کرو گے اور اگر بدی کرو گے تو اس کا وبال بھی تمہارے ہی اوپر ہو گا۔" (ق۔۷:۱۷)

انسان کے سامنے حق اور کفر کی راہیں موجود ہیں، وہ مختار ہے، جسے چاہے اختیار کر سکتا ہے تا کہ اس سے باز پرس کی جا سکے۔
(۷) "اور آپ (محمدؐ) کہہ دیجئے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے اب جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔" (قرآن کریم)
دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح انسان کی تخلیق بھی اس انداز پر ہوئی ہے کہ وہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتا رہے گا
(۸) "ہم نے تمہارے لئے موت مقدر کر دی ہے اور ہم اس بات سے عاجز نہیں ہیں کہ بدلے میں لے آئیں تمہاری طرح کے لوگ اور اٹھا کھڑا کریں تمہیں وہاں جہاں تم نہیں جانتے۔" (ق۔۵۶۔۵۹۔۶۰)

انسان کے اندر بتدریج ترقی کرنے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔
(۹) "قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے کہ تم اسی طرح سیڑھی پر سیڑھی چڑھتے رہو گے۔" (ق۔۸۴۔۱۹)

انسان کے لئے موت ایک عبوری مرحلہ ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اسے اپنے اعمال کی جزا اور سزا بھگتنی ہے۔
(۱۰) جو لوگ ایمان لا کر نیک کام کریں گے انہیں ایسا اجر ملے گا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔" (ف۔۹۵۔۶)
جو شخص اپنے نفس کو احکام الٰہی کا پابند کرنے میں کامیاب ہو جائے گا یقیناً وہی شخص فلاح پائے گا۔ تزکیہ قلب تزکیہ نفس کا اظہار ہی اعمال کے ذریعے ہوتا ہے جس نے اپنے نفس کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کر لیا ہے اس کے افعال بھی برائیوں سے پاک ہوتے ہیں اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پورا پورا پابند ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اللہ اسے فلاح کی بشارت دیتا ہے۔
(۱۱) "پس خدا نے نفسِ انسانی کو برائی اور بھلائی کے راستے بتا دیئے جس شخص نے اپنے نفس کو برائی سے پاک کر لیا وہ فلاح پا گیا اور جس نے اسے برائیوں کی گندگی میں پوشیدہ کر دیا وہ ناکام ہوگا۔" (ق۔۱۹۔۷تا۱۰)

کلام پاک انسان کو اسی کی عظمت اور بلندی کا احساس دلاتا ہے اور اسے آگاہ کرتا ہے کہ یہ چاند اور سورج اور مناظر فطرت سب کے سب تمہارے معبود نہیں بلکہ خادم ہیں۔ یہ دنیا مومن کے جذبۂ تسخیر کی تسکین کے اسباب فراہم کرتی ہے۔ وہ نیابت کا بھی اہل ہو سکتا ہے جب وہ کائنات کو مسخر کرنے کی خاطر قوتوں کو اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر لگانے کی غرض سے جہد مسلسل کرتا ہے:۔
(۱۲) "کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے ان تمام چیزوں کو جو زمین میں ہیں تمہارا خادم بنا دیا ہے۔" (ق۔۲۲۔۶۵)
(۱۳) "اور اللہ نے دریاؤں کو تمہارا خادم بنا دیا اور سورج اور چاند کو جو مقررہ راستے پر چلتے ہیں تمہارا خادم بنا دیا اور رات اور دن کو تمہارا خادم بنا دیا۔" (ق۔۱۴۔۳۳)
اللہ نے انسانوں کو اپنی روح کی پھونک سے بنایا ہے اس لئے یہ ترقی کر کے اوج ثریا تک پہنچ سکتا ہے۔
(۱۴) پھر اسے ٹھیک ٹھاک بنایا اور اپنی روح میں سے اس میں پھونکی۔" (ق۔۳۲۔۹)
مرد مومن زندگی سے گریز اور فرار کا قائل نہیں ہو سکتا۔ اس میں جفاکشی کی صلاحیتیں بے تحاشا موجود ہوتی ہیں۔ اس میں محنت ومشقت وبرداشت کرنے کی صلاحیت موجود ہے:۔
(۱۵) "بیشک ہم نے انسان کو اس حالت میں پیدا کیا ہے کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کرے گا۔" (قرآن کریم)

خدا نے کسی انسان پر اتنی ذمہ داریاں ہرگز عائد نہیں کی ہیں جو اس کی بساط سے زیادہ ہوں اس نے انسانوں کو ایک اندازے پر بنایا ہے اس لئے ٹھیک اسی مناسبت سے اس پر ذمہ داریاں بھی عائد کی ہیں۔
(۱۶) "اللہ کسی انسان پر ایسا فرض عائد نہیں کرتا جس کی تعمیل اس کے لئے دشوار ہو۔" (ق۔۲۔۲۸۶)
مومن پاک دل وپاک باز ہوتا ہے کیوں کہ اسے اس کا یقین ہے کہ خدا ہمارے ظاہر اور باطن سے بخوبی واقف ہے۔ وہ محض ظاہری اعمال کا ہی احتساب نہیں کرے گا بلکہ وہ ہمارے رگ و ریشے سے بھی واقف ہے اس لئے ہماری نیت اور ہمارے قلوب کا جائزہ لے گا۔
(۱۷) لیکن اللہ مواخذہ کرے گا تم سے (باز پرس کرے گا) ان امور میں جن کا اکتساب تمہارے قلب نے کیا ہے۔" (ق۔۲۔۲۲۵)
مومن کی بزرگی کا معیار ذات، رنگ، نسل، قوم، دولت یا وطن نہیں ہے بلکہ تقویٰ ہے۔
(۱۸) "بلاشک تم میں سب سے زیادہ لائق عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ (ق۔۴۹۔۱۳)

مومن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی، اس کے اخلاق واطوار اور اس کے مزاج کے متعلق ارشادات نبوی سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔
(۱) "تم میں سے کوئی صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنی اولاد، اپنے والد اور تمام لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ رکھتا ہو۔"
(۲) "تین چیزیں جس کے اندر ہوں گی۔ وہ ایمان کی حلاوت پائے گا۔
(۱) ہر چیز سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت (۲) جس بندے سے بھی محبت ہو صرف خدا کے لئے ہو (۳) اور کفر میں جانا اسے ایسا ہی ناپسند ہو جیسے آگ میں ڈالا جانا۔"
(۳) جس نے خدا ہی کے لئے محبت کی اور خدا ہی کے لئے دشمنی کی اور خدا ہی کے لئے دیا اور خدا ہی کے لئے نہیں دیا، اس نے اپنے ایمان کو مکمل کر لیا۔ جو امانتدار نہ ہو اور عہد کی پرواہ نہ کرے وہ مومن نہیں ہے۔"
(۴) سب سے زیادہ کامل ایمان والا وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔"
(۵) "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ مومنوں کو آپس میں اس طرح رحم کرتے ہوئے دیکھو گے جیسے کہ جسم کے کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بیقرار ہو جاتا ہے۔"
(۶) [illegible]

تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم پریشان ہوجاتا ہے۔''

(۷) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار قسم کھا کر فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کون؟ آپ نے فرمایا جس کی تکلیفوں سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں۔''

(۸) وہ مومن نہیں ہے جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اور اس کا پڑوسی بھوک کی حالت میں رات گزارے۔

(۹) مومن کی مثال کھیت کے ان پودوں کی سی ہے جس کو ہوا برابر جھکاتی رہتی ہے، کبھی گرا دیتی ہے، کبھی کھڑا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا معین وقت آجاتا ہے اور کافر کی مثال صنوبر کے مضبوط تناور درخت کی سی ہے جس پر آفت نہیں آتی اور وہ سیدھا کھڑا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک ہی دفعہ جڑ سے اُکھڑ جاتا ہے۔

(۱۰) اگر مومن بالفرض چوہے کے سوراخ میں چلا جائے تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ اذیت دینے والے کو مسلط فرمادیں گے۔''

(۱۱) مومن وہ ہے جس کے اوپر لوگ اپنی جان اور مال کے سلسلہ میں اعتماد کریں اور مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے (اللہ کی اطاعت میں) اور مہاجر وہ ہے جو خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑ دے۔''

(۱۲) مومن کی مثال بظاہر اس گھر کی ہے جو بظاہر ویران ہو مگر جب تم اس میں داخل ہو تو اسے آباد اور پُر رونق پاؤ اور بدکار کی مثال اس بلند و پختہ قبر کی سی ہے جو دیکھنے میں بہت پُرشکوہ ہو مگر اس کے اندر گندگی اور بدبو بھری ہوئی ہو۔''

(۱۳) مومن نہ تو طعنہ زن ہوتا ہے نہ لعنت کرنے والا اور نہ فحش گو اور زبان دراز۔''

(۱۴) سب سے بڑا فکرمند شخص وہ مومن ہے جو دنیا کی فکر رکھے اور آخرت کی بھی۔''

(۱۵) مومن بھولا بھالا اور شریف ہوتا ہے اور کافر مکار اور کمینہ ہوتا ہے۔''

(۱۶) مومن کی شان تو یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو، صاحب ایمان و یقین ہو، اس کے علم کے لئے حلم اور اس کے حلم کے لئے علم باعث زینت ہو، عقلمند ہو لیکن نرم خو اس کی خوش پوشی اور ضبط اس کے فقر و افلاس کی پردہ داری کرے، دولت ہے تو خرچ کرنے میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ شفیق ہو اور خستہ حالوں کے حق میں رحیم و کریم۔

''حقوق کی ادائیگی میں کشادہ دست و فراخدل، انصاف میں سرگرم و ثابت قدم، کسی سے نفرت ہے تو اس کے حق میں اس سے زیادتی نہ ہونے پائے کسی سے محبت ہو تو اس کی مدد میں حدِ شریعت سے تجاوز نہ کرے، نکتہ چینی کرے نہ طنز و اشارے، نہ طعن و تشنیع، نہ لایعنی سے اسے کوئی غرض ہو۔ نہ لہو و لعب سے دلچسپی، چغلخوری نہیں کرتا، جو اس کا حق نہیں اس کے پیچھے نہیں پڑتا، جو اس پر واجب آتا ہے اس کا انکار نہیں کرتا، معذرت میں حد سے نہیں بڑھتا، دوسروں کی مصیبت میں خوش نہیں ہوتا، دوسری کی مصیبت سے اس کو مسرت نہیں ہوتی، مومن کی نماز میں خشوع اور نمازوں کا ذوق ہوتا ہے۔ اس کا کام شفا کا پیام، اس کا صبر تقویٰ، اس کا سکوت سراسر غور و فکر، اس کی نظر سراپا درس عبرت ہے۔ علم کی خاطر علماء کی صحبت اختیار کرتا ہے، خاموش رہتا ہے تو اس لئے کہ گناہوں سے محفوظ رہے، بولتا ہے تو اس لئے کہ کچھ ثواب کمائے اور فائدہ حاصل کرے، نیکی کر کے اسے خوشی ہوتی ہے اس سے غلطی سرزد ہوتی ہے تو استغفار کرتا ہے۔ دل میں کسی سے رنج ہوتا ہے تو معافی تلافی کر لیتا ہے۔ اس سے کوئی جہالت سے پیش آتا ہے تو وہ تحمل اور عقل سے کام لیتا ہے، ظلم کیا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے، کوئی اس کے حق میں ناانصافی کرتا ہے تو وہ انصاف پر قائم رہتا ہے، اللہ کے سوا کسی کی پناہ نہیں مانگتا اور ماسوا اللہ سے مدد نہیں چاہتا، مجمع میں باوقار، تنہائی میں شکرگزار، رزق پر قانع، آرام و عیش کے زمانے میں شاکر، مصیبت اور آزمائش کی گھڑیوں میں صابر، غافلوں میں ذاکر اور ذاکروں میں ہو تو استغفار میں مشغول رہتا ہے۔''

مردِ مومن کی سیرت کا خاکہ

مندرجہ بالا سرسری جائزے سے مردِ مومن کی سیرت کا جو خاکہ تیار ہوتا ہے اس سے اس کے کردار کی چند نمایاں خصوصیات سامنے آتی ہیں، ان خصوصیات پر فرداً فرداً بحث کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔ اس لئے میں تفصیل کی بجائے اس کی اجمالی تحلیل نفسی پر اکتفا کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

صرف مردِ مومن ایک طاقتور، باخبر، صالح اور مصلح انسان ہوتا ہے جو صرف خدائے واحد کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ اسے اپنے مقام و مرتبے اور درجۂ نیابت کا حقیقی عرفان ہوتا ہے اس لئے خواہ شخصیتوں کا بُت ہو یا خیالات کا، دولت کا رعب ہو یا طاقت کا طنطنہ، حسن کی دلفریبیاں ہوں یا علم کی سحر طرازیاں، بیٹے کی محبت ہو یا بیوی موانست، سیاست کا میدان ہو یا تجارت کا معاملہ وہ زندگی کے ہر محاذ پر محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اقدامات کرتا ہے۔ اسے اس راستے میں کوئی طاقت ٹوکتی بھی ہے تو وہ رکتا نہیں جانتا کیوں کہ اس بات سے وہ بخوبی واقف ہے کہ خدا جس کام کا حکم دیتا ہے وہی کام اس کی ذات کے لئے بھی مفید و بہتر ہے۔ صرف خدا کا بتایا ہوا راستہ ہی انسانیت کی بہبود کا راستہ ہے۔ بقیہ تمام راستے اندھیرے غاروں کی طرف جاتے ہیں لہٰذا وہ خدا کے لئے جو کچھ بھی کرتا ہے یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ اسے وہی کرنا چاہئے۔

اسے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ حکم دینے والا، برائی سے روکنے والا اور سچے ایمان والا ہے اور اس کا تعلق اس قادرِ مطلق سے ہے جس نے اسے نیابت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسے زندگی کا سیدھا اور درمیانی راستہ بتلا دیا ہے۔ جہاں خطرات تو لامحدود ہیں لیکن خطرات اور دشواریوں سے نمٹنا اس کا فریضہ ہے۔

فرض و استغنا کی دولت سے مالا مال ہونے کی وجہ سے وہ بھکاریوں کی طرح دنیا والوں کے دروازے نہیں کھٹکھٹاتا بلکہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، جو کچھ طلب کرنا چاہتا ہے اسے اپنے خدا سے کہتا ہے اور طلب کرتا ہے اور وہ ایسی چیزیں ہرگز طلب نہیں کرتا جسے خدا ناپسند کرتا ہے اس لئے وہ وہی طلب کرتا ہے جسے خوشی خوشی قبول کر لیا جاتا ہے۔ جب وہ اپنے نفس پر پوری طرح قابو حاصل کر کے صرف ذاتِ واحد کا تصور کرتا ہے اور اپنی ساری امیدیں اسی سے وابستہ کر کے مصروفِ کار ہو جاتا ہے تو پھر اس کا منشا رضائے الٰہی سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اس موڑ پر اسے جو کچھ ملتا ہے اس کے لئے شکر ادا کرتا ہے اور جو نہیں ملتا اسے اپنے لئے مضر تصور کرتا ہے۔ وہ اپنے محبوب نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرتا ہے۔ عشقِ رسول میں غرق ہوتا ہے۔ اس لئے ایسا کوئی کام کرنا ناپسند کرتا ہے جسے کرنے سے رسول نے منع فرمایا ہے، سنت کی اتباع کے علاوہ ساری دنیا میں وہ کسی کا مقلد نہیں ہوتا بلکہ دنیا اس کی تقلید پر مجبور ہے۔ وہ جانتا ہے کہ چونکہ وہ خدا کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلتا ہے اس لئے کجروؤں کی رہنمائی اور ان سے احتساب کی ذمہ داریاں بھی اس پر عائد ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ملت بیضا کے مزاج کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اس لئے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے کہ اس امت کی جگہ قافلہ کے پیچھے اور شاگردوں اور حاشیہ برداروں کی صف میں ہو اور دوسری اقوام کے سہارے زندہ رہے اور قیادت و رہنمائی، امر و نہی اور ذہنی و فکری آزادی کے بجائے تقلید و نقل، اطاعت و سپر اندازی پر راضی و مطمئن ہو۔ اس کے صحیح موقف کی مثال اس شریف، قوی الارادہ اور آزاد ضمیر شخص سے دی جا سکتی ہے جو ضرورت و احتیاج کے وقت دوسروں سے اپنے ارادہ و اختیار سے وہ چیزیں قبول کرتا ہے جو اس کے حالات کے مطابق ہوں اور اس کی شخصیت اور خود اعتمادی کو مجروح نہ کرتی ہوں، ان چیزوں کو مسترد کر دیتا ہے جو اس کی شخصیت اور حیثیت کے مطابق نہ ہوں یا اس کو کمزور کرتی ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس کو کسی دوسری قوم کے شعائر اور امتیازات حاصل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

یہ قوم زندگی کا ایک خاص متعین مقصد رکھتی ہے، دنیا کے لئے اس پاس ایک مکمل دعوت ہے، اس کی تہذیب و ثقافت، اس کی جد و جہد اور عمل اور اس کی ہر قسم کی سرگرمی اور نشاط، اس کے عقیدے مقاصد اور پیغام کی تابع ہے۔ اس کے نزدیک علم برائے علم اور طاقت برائے طاقت اور اتحاد کی کوئی

مادی اور علمی فتوحات کے اظہار کے لئے ہو) اس کے نزدیک لہو ولعب اور حد سے بڑھی ہوئی انانیت کے سوا کچھ نہیں۔''

مردِ مومن بھی اس امت کا ایک فرد ہے اس لئے امت کا جو مجموعی مزاج ہے وہی مومن کا بھی خاصہ ہے۔ وہ ساری انسانیت کو نیک مقاصد سے روشناس کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے خود اس کا اپنا کردار بہت ٹھوس ہوتا ہے۔ چوری، زنا، غیبت، منافقت، حسد، کینہ، عیب جوئی، اور دیگر امراض خبیثہ سے وہ خود کو پاک رکھتا ہے اور عفو درگزر، حلم، صبر، قناعت، تقویٰ، طہارت اور تزکیہ نفس کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ اوروں کی حاصل کی ہوئی روٹی توڑنا اسے گوارہ نہیں بلکہ وہ تو خود بھوکا رہ کر دوسرے بھوکے انسانوں کا پیٹ بھرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ خود دسترخوان پر بیٹھنے سے پہلے پڑوسی کے چولہے کی خبر لیتا ہے اور ان تمام کاموں میں کسی مکر وفریب کام سے کام نہیں لیتا وہ یہ سب کچھ اپنا فرض سمجھ کر کرتا ہے وہ بے حد بھولا بھالا اور معصوم بچوں کی طرح ہوتا ہے۔ غریبوں، کمزوروں، بیواؤں، یتیموں اور ناداروں کے حق میں وہ ریشم کی طرح نرم ہی نہیں ہوتا بلکہ دوسرے ظالموں سے ان کی حفاظت بھی کرتا ہے، ٹھیک اس کے برعکس جب وہ رزم حق وباطل میں ہوتا ہے تو سیل تند رو کی طرح پہاڑوں کی چٹانوں سے گزر جاتا ہے اور پتھروں کو پیس دیتا ہے۔ انسانوں کے درمیان عدل وانصاف قائم رکھنا اس کے مزاج میں داخل ہے۔

''ضرورت کی حد تک اور انسانیت کے مفاد اور نیک مقاصد کے لئے اسلام زندگی، کائنات اور علم کی راہ میں جدوجہد کو جائز قرار دیتا ہے بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے طاقتور، باخبر، ہوشمند اور صالح ومصلح مومن کی مثال دی ہے جو کائناتی اور مادی طاقتوں کو مسخر بھی کرتا ہے اور اسباب ووسائل کا ذخیرہ بھی جمع کرتا ہے اور اپنی فتوحات اور مہمات کا دائرہ بھی وسیع کرتا رہتا ہے لیکن اپنی طاقت سلطنت اور قیادت کے شباب میں بھی اور ظاہری اسباب کے تصرف کے بعد بھی اپنے رب پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے، اپنے ضعف کا معترف ہے انسانیت اور کمزور قوموں پر رحمدلی اور حق کا حامی ہے اور اپنی ساری قوت، جدوجہد، صلاحیتیں اور اپنے سارے وسائل اور ذخائر اللہ کے نام کی بلندی اور انسانوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف اور انسان کی بندگی سے اللہ کی بندگی کی طرف بلانے میں صرف کرتا ہے..... زندگی کے بارے میں اس کی پالیسی اور موقف یہ ہے کہ وہ اس کو سب سے بلند مقصد ''آدرش'' اور ترقی وکامیابی کی معراج نہیں سمجھتا، وہ اس کو ایک ایسا عبوری مرحلہ سمجھتا ہے جس کو پار کرنا انسان کے لئے ضروری ہے۔ اس کے نزدیک وہ عظیم تر کامیابی، لافانی اور پُرمسرت زندگی کا ایک ذریعہ اور واسطہ ہے۔''

مردِ مومن ان تمام لوگوں سے نفرت کرتا ہے جو اس دنیا کو آخرت کا پُل سمجھنے کے بجائے لازوال اور ہر اندیشے سے خالی تصور کرتے، وہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو آخرت کو ترجیح دیتے ہوئے دنیا وآخرت میں توازن قائم رکھتے ہیں خلاصہ یہ کہ:

''وہ تعبیر اور تمثیل جو اس دنیا کے بارے میں ایک مسلمان کے موقف کو بہت کامیابی اور نزاکت کے ساتھ متعین کرتی ہے، وہ یہ ماثور حکیمانہ جملہ جو جمعہ کے بعض خطابات کا جزو ہے۔ ''دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔'' مسلمان دنیا کے اسباب ووسائل سے اس طرح فائدہ اٹھاتا ہے جیسے کہ یہ چیز اس کے لئے مسخر کر دی گئی بلکہ اسی کے لئے وجود میں آئی ہے اور آخرت کے لئے وہ اس طرح کوشش کرتا ہے جیسا کہ وہ اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ دنیا اور اس کے اسباب ووسائل کو مرکب سمجھتا ہے، راکب نہیں، غلام اور ماتحت سمجھتا ہے آقا اور مالک نہیں، ذریعہ اور وسیلہ سمجھتا ہے، مقصد اور غائت نہیں، آخرت وہ اپنے سفر کی منزل مقصود سمجھتا ہے جہاں اس کو پہنچنا ہے، ایسا وطن سمجھتا ہے جہاں اس کو پناہ لینا ہے، چنانچہ اس کے لئے وہ اپنی ساری قوت جمع کرتا ہے ہر قسم کی زحمت مول لیتا ہے، عزم اور شوق کے ساتھ اپنے وسائل کو کام میں لاتا ہے اور یہ نبوت کی وہ مثال ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، آپ نے فرمایا تھا:۔

''میرا اور دنیا کا تعلق صرف اتنا ہے کہ میری مثال اس سوار کی طرح ہے جو تھوڑی دیر کے لئے ایک درخت کے نیچے سایہ لینے کے لئے بیٹھ گیا اور پھر اس کو چھوڑ کر چلا گیا۔''

''مردِ مومن''
صوفی حکماء کی نظر میں

(۱) ابوالقاسم جنید بغدادی کا تصورِ انسان (وفات ۹۱۰ء)

جنید بغدادیؒ حارثؒ کے شاگرد تھے۔ یہ مشہور صوفی اور مصنف ہیں ان کی تصانیف میں ''محاسبہ'' پر بہت زور ملتا ہے۔

رعایۃ الحقوق اللہ ان کی مشہور کتاب ہے۔ بعض محققین کے مطابق امام غزالی کی تصنیف ''احیاء علوم فی الدین'' پر کتاب مذکور کے گہرے اثرات موجود ہیں۔ ''کتاب الوصایا'' میں جنید بغدادی کے عارفانہ مضامین ہیں۔ وہ اپنے ایک مشہور رسالہ ''فصل فی المحبت'' میں رقمطراز ہیں:۔

''اللہ تعالیٰ نے مومنین کی محبت کی تصدیق فرمائی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ جو ایمان لانے والے ہیں خدا سے محبت کرتے ہیں ''والذین آمنوا اشد حباً للہ'' نور شوق دل میں محبت سے پیدا ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے قلب میں یہ چراغ روشن کرتا ہے تو یہ قلب کے تاریک گوشوں تک پہنچ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے منورہ ہو جاتا ہے۔ یہ چراغ کبھی نہیں بجھتا، سوائے اس صورت کے کہ انسان اپنے اعمال پر تکبر کرنے لگے۔ عشق الٰہی کی سب سے واضح نشانی کثرت شوق ہے۔ جس کے ساتھ مسلسل مراقبہ، طویل نگہداشت اور مکمل طور پر نفی خودی شامل ہے، اطاعت بھی اس کے ساتھ شامل ہے اور ان سب باتوں میں عجلت کی ضرورت ہے کہ ایسا نہ ہو کہ موت آپہنچے۔''

اسی مذکورہ بالا پس منظر سے جنید بغدادیؒ کا صوفیانہ کردار ابھرتا ہے۔ عشق کے ذریعہ حصولِ معرفت آگے چل کر تصوف کا بنیادی رجحان بن گیا اور رفتہ رفتہ عقل پر عشق کو اور شریعت پر طریقت کو ترجیح دی جانے لگی:۔

''تیسری صدی کے ایک اور مشہور صوفی بزرگ ذوالنون مصری (وفات ۸۶۱ء) ہیں جو وحدتِ وجود کے قائل ہیں..... ابو یزید بسطامیؒ (وفات ۸۷۵ء) پہلے صوفی ہیں جن کا مسلک واضح طور پر شریعت کے پابند عام مسلمانوں سے کسی قدر مختلف نظر آتا ہے، ان کا قول تھا کہ ''میں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی روح میں پالیا ہے۔ صوفیا کا مسئلہ فنا فی اللہ بھی انہیں سے شروع ہوتا ہے۔ جس کے منطقی نتائج یہ ہیں کہ وجود حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کا ہے باقی ہر شے معدوم ہے تلاش حق اور خودی کو مٹانا ہی اصل ایمان ہے۔ احمد بن عیسیٰ الخراز (وفات ۸۹۹ء) نے اس مسئلہ فنا کو مسلمانوں کے عام عقیدۂ توحید سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ جنیدؒ جو محاسبی کے شاگرد تھے اور شیخ الطائفہ کہلاتے تھے، ابو یزید بسطامیؒ سے ایک قدم اور آگے بڑھ جاتے ہیں اور وحدتِ وجود کے مسئلہ کو فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں ان کے نزدیک کائنات کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس عالم کی طرف عود کر آئے جس میں وہ وجود میں آنے سے پہلے تھا۔ تخلیق آدم سے پہلے اللہ نے آدم سے خطاب کیا تھا جب کہ آدم کا وجود نہ تھا لیکن آدم خود حق تعالیٰ کے وجود میں تھا۔ شیخ الطائفہ کے ہی ہمعصر مشہور صوفی منصور حلاج (وفات ۹۲۲ء) تھے جن کا عقیدہ تھا کہ معرفت وسلوک کی منازل طے کرنے کے بعد صوفی ذات حق میں مل جاتا ہے۔ منصور نے ان منازل سے گزرنے کے بعد ''انا الحق'' کہا تھا، ظاہر پرستوں اور اہل شریعت نے اسے کلمۂ کفر سمجھا اور حلاج کو پھانسی دیدی گئی..... حلاج کا فلسفہ فنا میں بقا کا فلسفہ ہے..... محاسبی سے منصور تک صوفیا کے رجحانات قدرتی طور پر پابند شرع مسلمانوں کے نقطہ نظر سے سخت قابل اعتراض تھے۔

شیخ احمد سرہندی کے زمانے میں صوفیا کے اس رجحان میں نمایاں تبدیلی آئی اور شیخ نے وحدت الوجود کے نظریہ کو کشفی غلط فہمی کا نتیجہ قرار دیا اور وحدت الشہود کی تبلیغ کی۔ خیر، بات نکلی تھی جنید

پھر تصوف کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا اور اسے مربوط کر کے عقلی بنیادوں پر مستحکم کیا۔ ''فنا'' اور ''اتصال'' کی اجتہادی انداز میں تشریح کی اور ظاہر و باطن کی تاویل کچھ اس انداز سے کی کہ شریعت اور طریقت میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔

''انہوں نے عقلی اور اخلاقی زیادتیوں اور مبالغہ آمیزیوں کو اصل و جوہر سے دست کش ہوئے بغیر بہت کم کر دیا انہوں نے تصوف کے گویا بہت سے پہاڑی نالوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے انہیں ایک باقاعدہ اور دریائی شکل دیدی۔''

ان کے یہاں توحید خالص کے دو مراحل ہیں۔ پہلے مرحلے میں خدا کی وحدانیت کا اقرار اور یہ یقین کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ دوسری تمام اشیاء سے بے نیازی کو ظاہر و باطن پر محیط کرنا۔

توحید خالص کی دوسری منزل میں انسان خدا کے سامنے اس انداز میں آتا ہے کہ درمیان سے سارے حجابات ختم ہو جاتے ہیں اور بندہ جوار الٰہی میں غرق ہو جاتا ہے اور اسی استغراق کے عالم میں اسے حقیقت مطلق کی وحدانیت کا ادراک ہوتا ہے۔ انسان پہلی منزل میں اپنی آرزوؤں کو کلی طور پر رضائے الٰہی کے تابع کر دیتا ہے اور دوسری منزل میں وہ رضائے الٰہی میں مدغم ہو جاتا ہے۔

''اس آخری حالت میں دراصل رضائے الٰہی کے تابع ہونے سے بھی بلند تر ایک چیز ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان خود رضائے الٰہی بن جاتا ہے اور اس کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ اس کی رضاء اس کا عمل اس کا زندہ رہنا اور تخلیق کرنا خالق کی رضا میں تمام و کمال جذب ہو کر وہ صرف ایک ہی رضاء، رضائے حق بن جاتا ہے۔

جنید بغدادی کے نزدیک وجود کی دو قسمیں ہیں ایک ربانی اور دوسری دنیوی۔ ربانی وجود سے مراد خدا کی ذات کے اندر موجود رہنا ہے۔ یہ وجود اس دنیا میں آنے سے پہلے تھا، توحید کا ادراک انسان کو اپنا دنیوی وجود فراموش کر کے روز کر کے روز الست کے وجود کو پا لینے کے موڑ پر ہی ہوتا ہے:۔

''ایک زندہ انسان وہ ہے جو اپنی زندگی کو اپنے خالق کے وجود کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے نہ کہ وہ جو اپنی زندگی اپنے جسمانی ہیکل کے حفظ و بقا کی اساس پر تعمیر کرتا ہے، پس اس کی زندگی کی حقیقت موت ہوگی کیوں کہ وہ اس اولین اور ابتدائی حالتِ وجود کو واپس لوٹنے کا ایک ذریعہ ہوگی۔''

فنا کے مقام پر جنید بغدادی کے مطابق صوفی کو جو آخری تجربہ ہوتا ہے وہ دیدار ذات یا دیدار الٰہی ہے اس سلسلے میں اقبال رقمطراز ہیں:

''اس تجربے کا تجربہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس مقام پر حواس کی فعلیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ صوفیانہ احوال میں ہم حقیقت مطلقہ کے مرد کامل سے رابطہ پیدا کر لیتے ہیں، اس منزل پر سن و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ صوفی کا یہ حال یا یہ کیفیت خدا سے شدید قلبی رابطہ کا نام ہے یوں سمجھئے کہ اس کی ذات کے ساتھ اتحاد و اتصال کا نام ہے جو اگرچہ صوفی کی ذات سے ماورائی مگر اس کے باوجود اس پر محیط ہے۔ اس اتصال میں صوفی کی شخصیت عارضی طور پر خدا کی ذات میں گم ہو جاتی ہے۔''

جنید بغدادی کے مطابق فنا کے اس آخری مقام پر بھی انسان اور خدا کے درمیان الوہیت اور بندگی کا حریری پردہ حائل رہتا ہے اور کیفیت سخت آزمائش کی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں صوفی کا کرب والم بہت ہی شدید ہو جاتا ہے۔ جنید بغدادی کے ان خیالات کو ڈاکٹر اشفاق حسین اس انداز میں بیان کرتے ہیں:۔

''آخری مقام پر انسان کا خدا سے الگ ایک وجود ہوتا ہے۔ بہت سے پردے ہٹ جاتے ہیں لیکن ایک پردہ حائل رہتا ہے۔ وہ رب یعنی خالق اور انسان یعنی مخلوق کا پردہ ہے۔ یہ حالت کرب و الم سے پُر ہوتی ہے۔ یہ دراصل سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو کی حالت ہے۔ یہ طلبِ الٰہی اور آرزوئے وصال کی منزل ہے اس حالت کا برداشت کرنا روح کے لئے ایک کڑی آزمائش ہے۔ اس حالت میں توفیقِ ایزدی اس کی مدد کرتی ہے۔ روح انسانی اس آزمائش اور ابتلاء کی منزل میں بھی ایک روحانی مسرت محسوس کرتی ہے اس لئے کہ ایسے کڑے وقت رحمتِ خداوندی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔''

فنا کا وہ مقام جہاں انسان خدا کی ذات میں کھو جاتا ہے اور مدہوشی کے عالم میں اس کا شعور مفقود ہو جاتا ہے، جنید بغدادی کے نزدیک انسانی کمال کی یہ آخری منزل نہیں ہے بلکہ آخری منزل تو وہ ہے جب وہ پھر اپنے وجود کو سمیٹ کر ہوش میں آجاتا ہے۔ اس منزل کو جنید بغدادی صحو یا ہوش کی منزل سے موسوم کرتے ہیں۔

''حالت مدہوشی میں وہ صرف ذاتِ خداوندی میں موجود رہتا ہے اور اپنے آپ میں نہیں اور حالت ہوش میں وہ اپنے آپ میں بھی موجود ہوتا ہے اور غائب بھی، جب وہ غلبۂ خداوندی کی سرشاری سے نکل کر حالت صحو (ہوش کی حالت) کی کھلی فضا میں آجاتا ہے تو اس کا مشاہدہ اور اس کی تمام قوتیں اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہیں اور اس کو اپنی پہلی صفات واپس مل جاتی ہیں، روحانیت کے اس بلند مقام کو پہنچ جانے کے بعد جب وہ واپس آتا ہے تو اس کا عمل اہل دنیا کے لئے ایک لائق اتباع نمونہ بن جاتا ہے۔''

یہ جنید بغدادی کا اجتہاد ہے کہ انہوں نے مدہوشی کو ہوش کا پیش قرار دے کر تصوف کے دامن کو بے عملی کے رجحان سے آلودہ ہونے سے بچانے کی کوشش کی۔ اس سے قبل اکثر صوفیا کا یہ نظریہ بن گیا تھا کہ دراصل عمل سے دور رہنا ہی اپنے آپ کو آلائشوں سے پاک رکھنے کے مترادف ہے لیکن جب جنید بغدادی سے اس کی وضاحت طلب کی گئی تو آپ نے جواب دیا۔

''یہ ان لوگوں کا عقیدہ جو مذہبی اعمال کو بالکل بے وقعت خیال کرتے ہیں اور یہ میرے نزدیک ایک بڑا بھاری گناہ ہے..... اگر میری عمر ایک ہزار برس بھی ہو تو میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ اعمال خیر میں میرے اندر ایک ذرہ بھر بھی کمی پائی جائے۔''

الغرض نظریہ بحالی ہوش جنید بغدادی کی فکر کی اساس ہے جس کی وجہ سے حالت ہوش میں آنے کے بعد عظیم المرتبت انسان جب معاشرے میں رہنے لگتا ہے تو حالتِ فنا کے یہ تجربے اس کے تحت الشعور میں باقی رہتے ہیں اور ان تجربوں سے وہ بنی نوع انسان کو مالا مال کر دیتا ہے۔ سرشاری اور جذب و مستی پر وہ ہوش کو اس لئے ترجیح دیتے ہیں کو صوفی سراپا رضائے الٰہی بن کر دنیا کے دوسرے انسانوں کی رہنمائی کر سکے۔

''صوفی کی اس حالت کو وہ (جنید بغدادی) مدہوشی اور سرشاری کی حالت پر اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ مدہوشی ایسی کیفیت ہے جس میں انسان مسلسل حالت اضطراب میں رہتا ہے۔ شعور اور ارادہ اور فکر و عمل کی صلاحیتیں اس میں باقی نہیں رہتیں اور بے عملی ہی اس کا مطمع نظر بن جاتی ہے۔ ان کے نزدیک حالتِ ہوش روحانی بلندی کی برتر منزل اس لئے ہے کہ اس حالت میں انسان اپنے وجود کے مقصد و منشاء کو پا لیتا ہے، یعنی اپنی صلاحیتوں کی بازیافت کے بعد وہ کائنات میں اس منصب کو حاصل کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو جاتا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ خدا کی قربت اور اتصال سے اسے جو روحانی بلندی میسر آتی ہے اور مشاہد باطنی سے اسے جو ایمان و ایقان کی دولت ملتی ہے اسے وہ محفوظ کر لیتا ہے اور پھر بنی نوع انسان میں اسے بانٹ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انفرادی فلاح اجتماعی فلاح سے وابستہ ہوتی ہے، وہ اپنے فکر و عمل سے حیات اجتماعی میں اخلاقی اور انسانی قدروں کا تحفظ کر کے حسن عمل اور حسنِ اخلاق کو انسانیت کی کسوٹی بنا دیتا ہے۔ اس کے اعمال خیر دوسروں کے لئے نمونہ بن جاتے ہیں۔ ایسا بندۂ حق جب زمانہ اور زندگی کو میسر آتا ہے تو اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔

(۲) شیخ ابن عربی کا نظریہ انسانِ کامل:۔

محی الدین ابن عربی کا زمانہ ۱۱۶۵ء تا ۱۲۴۰ء پر محیط ہے۔ اکابر صوفیا میں سب سے پہلے شیخ اکبر نے ہی وحدۃ الوجود کو فلسفیانہ رنگ میں باضابطہ طور پر پیش کیا۔

وحدۃ الوجود کو چند لفظوں میں وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

ہے۔'' (فتوحات ۲۷۔۴۔۶)

ابن عربی نے اپنے اشعار میں بھی اس عقیدہ کی تشریح یوں کی ہے:۔

''اے کہ تو نے تمام اشیا کو اپنی ذات میں خلق کیا تو جمع کرتا ہے ہر اس چیز کو جسے تو پیدا کرتا ہے۔تو اس چیز کو پیدا کرتا ہے جس کا وجود تیری ذات میں مل کر کبھی فنا نہیں ہوتا اور اس طرح تو ہی تنگ ہے اور تو ہی وسیع بھی ہے۔'' (فصوص الحکم صفحہ ۲۸)

''یہ عقیدہ وحدت الوجود کی ایک ایسی صورت ہے جس کی رو سے تمام عالم اشیا اس حقیقت کا محض سایہ ہیں جو اس کے پیچھے مخفی ہے۔یعنی اس وجود حقیقی کا جوہر اس شے کی آخری بنیاد ہے جو تھی یا ہے اور آئندہ ہوگی۔ بے توفیق عقل حق یا خلق کی دوئی پر زور دیتی ہے اور ان کے اتحاد جوہری کا ادراک نہیں کر سکتی۔اس قسم کے اتحاد کے ادراک کا واحد وسیلہ صوفیان وجدان یا ذوق ہے۔''

ابن عربی کے عقیدے کے مطابق ایک ہی وحدت کثرت میں جلوہ نما ہے۔ساری کائنات ایک ہی حقیقت کی پرچھائیں ہے۔جس کا ادراک صوفیانہ وجدان کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ابن عربی کے انسان کامل کا تصور ان کے مندرجہ ذیل نظریات سے تیار ہوتا ہے:۔

''ابن عربی کا نظریہ یہ ہے کہ خدا اور کائنات کی طرح خدا اور انسان بھی ایک دوسرے کے مظہر ہیں۔انسان مظہر صفاتِ خداوندی ہے۔خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ساری مخلوق میں وہی اسرار الٰہی کا رازداں اور خلافت الٰہی کا مستحق ہے۔وہ خلاصہ کائنات ہے یعنی جو کچھ کائنات میں ہے اس کا جوہر انسانی شخصیت میں سمٹ آیا ہے۔اسی طرح وہ عالم اصغر ہے اور جو کچھ انسان کی ذات میں ہے وہ اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ کائنات پر محیط ہے۔گویا کائنات انسان کبیر ہے۔ابن عربی کے یہاں انسان کا یہ بلند ترین منصب ان کے نظریہ انسان کامل پر منحصر ہے۔اسلامی فکر میں ابن عربی پہلے مفکر ہیں جنہوں نے انسان کامل کے بارے میں ایک مکمل نظریہ پیش کیا ہے۔''فصوص الحکم'' کا مرکزی موضوع انسان کامل ہی ہے۔انسان کامل وہ آئینہ ہے جس میں تمام اسرار منکشف ہوتے ہیں اور وہ واحد تخلیق ہے جس میں تمام الوہی صفات ظاہر ہوتی ہیں۔''

شیخ ابن عربی نظریہ ارتقا کے قائل ہیں لیکن ان کا یہ نظریہ خالصتاً اسلامی ہے۔ان کے نزدیک انسان ہی نہیں بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ ہر لحہ ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔انسان تمام جانداروں میں اس لئے افضل ہے کہ اسے علم جیسی متمائز صلاحیت عطا کی گئی ہے۔علم کے ذریعے ہی وہ ترقی کی آخری منزلوں کو چھوتا ہے۔وہ اپنی معلومات کے ذریعے جہالت سے نجات حاصل کرتا ہے اور جب اسے اپنی ذات کائنات اور خدا کا صحیح صحیح علم حاصل ہو جاتا ہے تو وہ جاوداں ہو جاتا ہے۔

''بنی آدم تمام اجزاء عالم ہے مرتبہ علم میں مقدم اور مرتبہ وجود میں مؤخر ہے۔الارض کے تمام طبقات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ طبقۂ نباتات جمادات سے بہتر ہے۔اور طبقۂ حیوانات نباتات سے بہتر ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک طبقہ ترقی کرتا ہوا اعلیٰ طبقہ میں تبدیل ہوتا ہے۔ قانون ارتقا کی اصلاح میں اس کو بہتر صورت سے تعبیر کرتے ہیں۔طبقۂ حیوانات میں سب سے بہتر انسان ہے اور انسانوں میں سب سے بہتر وہ افراد ہیں جن کی دائمی بقاء کی یہ سورۃ ضامن ہے:۔

''انجیر کی قسم اور زیتون اور طور سینین کی قسم اور اس امن والے شہر کی کہ ہم نے انسانوں کو بہت صورت میں پیدا کیا ہے، پھر رفتہ رفتہ (بدل کر) پست سے پست کر دیا۔مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے ان کے لئے بے انتہا اجر ہے، تو اے آدم زاد پھر تو جزا کے دن کو کیوں جھٹلاتا ہے۔کیا خدا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟'' (ق۔۳۰۔۱۹)

فلسفہ ارتقا کے باب میں شیخ ابن عربی نے اکثر مواقع پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:۔

''انسان ہمیشہ ترقی کر رہا ہے، دنیا میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔دنیا کی ترقی کا علم تو مشاہدہ سے ہر ایک کو حاصل ہے۔بعد مرگ ترقی کی جو کچھ صورتیں ہیں اس کا ذکر میں اپنی کتاب ''التجلیات'' میں کر چکا ہوں..... میں بعض اولیا اللہ مثلاً حضرت جنیدؒ اور حضرت شبلیؒ اور حضرت ابو یزید بسطامیؒ، منصور حلاج وغیرہ سے کشف میں ملا اور ان بزرگوں کو مسئلہ ارتقاء کی تعلیم دی۔میں نے ان بزرگوں کو دیکھا کہ وہ ترقی کر رہے ہیں مگر ان کو اس کا علم نہیں، جس کی وجہ اللہ تعالیٰ کے قول سے واضح ہوتی ہے کہ: واوتوا بہ متشابہا

یہ قانون قدرت ہے کہ کسی چیز پر یک لخت کوئی ایسا تغیر واقع نہیں ہوتا کہ وہ محسوس ہو، بچہ سے بڑھاپے تک انسان ہر لحظہ ''فی لبس جدید'' ہے۔مگر ایک دن کا فرق نمایاں نہیں ہوتا۔مگر فرق کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔خواہ محسوس نہ ہو۔بچہ وہی ہے جو بوڑھا ہو گیا۔بچے اور بوڑھے میں کتنا فرق ہے؟''

شیخ اکبر نے قانون ارتقا کے ضمن میں جن لطیف نکات کی تعلیم دی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) ''انسان ہمیشہ ترقی کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

(۲) ''یہ ترقی اس طرح محسوس نہیں ہوتی جس طرح دنیا میں ہم محسوس نہیں کرتے۔''

(۳) کثرت صورتوں یعنی اعراض میں ہے اور جوہر واحد ہے جو ان کا عین ہے اور کثرت عین واحد میں معقول و مفہوم ہے۔

(۴) انسان ہر ساعت اور ہر دم صورت بدلتا ہے، یہ صورت خواہ ظاہری ہو یا باطنی، اول صورت کو آخری صورت فنا کرتی ہے اور خود باقی رہتی ہے۔مگر دوسرے وقت میں آخری صورت اول کی طرح فنا ہوتی ہے اور اس کی آخری صورت باقی رہتی ہے اور اس طرح ایک غیر محدود سلسلہ چلا گیا ہے۔

(۵) اہل آخرت انہیں قوانین قدرت کے زیر اثر ترقی کر رہے ہیں جو اہل دنیا پر مؤثر ہیں۔

اس سے کسی کو انکار نہیں کہ انسان فی الارض اشرف المخلوقات ہے اور طبقۂ حیوانات میں دیگر حیوانوں سے بوجہ علم ممتاز ہے۔اگرچہ انسانی دل و دماغ اور اس کے جسم کا ہر ایک عضو اور رگ ریشہ، شکل و صورت دیگر حیوانوں سے بہتر ہے۔مگر ہم اس مقام پر صرف علم کو وجہ امتیاز سمجھتے ہیں۔اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قانون ارتقا نے انسان کو اسفل سافلین سے اٹھا کر بتدریج ترقی کے زینے پر قدم بقدم آگے بڑھایا اور انسان بنایا اور منشا یہ تھا کہ علم حاصل کرے اور علم حاصل کرنے کے قابل بنا دیا اس لئے علم جو سب سے آخری پیدائش ہے سب سے بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔اگرچہ ہم ''ہفت وصد ہفتاد'' قالب دیکھ چکے ہیں لیکن ہمیں مطلق علم نہیں حالانکہ اس سے ہمیں انکار نہیں ہو سکتا کہ ہماری گزشتہ ہستی کی کچھ نہ کچھ صورت تھی۔اس لاعلمی کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہمیں گزشتہ ہستی میں علم حاصل نہ تھا جو موجودہ صورت میں انسان کی ایک ہی امتیازی خوبی ہے۔اس لئے ہمیں آئندہ زندگی میں موجودہ زندگی کا ضرور علم ہوگا۔کیوں کہ ہمیں اب علم حاصل ہے، قیاس ہو سکتا ہے کہ دوامی بقا تو کسی چیز کو حاصل نہیں، اس لئے علم بھی فنا ہوگا۔لیکن فنا ہونے کے بعد یقیناً کسی بہتر صورت میں ظاہر ہوگا۔اس صورت میں بھی ہمارا دعویٰ صحیح ہے کہ آئندہ زندگی میں ہمیں موجودہ زندگی کا علم ہوگا اور بہتر صورت میں ہوگا۔یعنی ہم پر موجودہ صورت کی حقیقت کا انکشاف بھی ہو جائے گا۔''

''فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید'' (ق ۲۶، ۱۵)

سو اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت کا) ہٹا دیا، سو آج (تو) تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔

علم کے ذریعے ہم خدا کی اس کائنات میں تصرف کرتے ہیں ریشم سے کپڑے تیار کر لیتے ہیں اور مٹی سے برتن، ہمارا تخلیقی شعور رفتہ رفتہ تحقیقی مدارج سے گزرتا جاتا ہے یہاں تک کہ ادراک کی آخری منزل پر جا کر انسان انسانِ کامل بن جاتا ہے۔بقول شیخ اکبر:۔

''ہم عالم میں تصرف کرتے ہیں۔زمانہ گزشتہ و حال کی ایجادیں اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ہم زمین میں روئی بوتے ہیں۔آب پاشی اور مناسب حفاظت کے بعد اس کا پیڑ پھل لاتا ہے، ہمیں مشاہدہ اور تجربہ سے یہ علم حاصل ہوا، ہم نے روئی کو اس طرح قدرت کے کھیت میں پھلتے پھولتے دیکھا۔ہم نے بھی اس کی نقل کی یہ تو صریحاً تقلید ہے۔اس کے بعد ہم نے روئی کو جس طرح استعمال کیا

تمام اشیاء میں ایک "قدرِ معلوم" ہے جس کا علم ہونا انسان کامل کے لئے ضروری ہے۔ کیوں کہ اشیاء کے اندر "قدرِ معلوم" کی دریافت اسے اوامر و نواہی کی شناخت میں مدد بہم پہنچاتی ہے۔ ہم پر جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ اس لئے کہ ہمیں اشیاء کی "قدرِ معلوم" کا علم نہیں ہوتا۔ شیخ ابن عربی کے خیالات ملاحظہ ہوں:۔

"غفلت کے باعث یہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اشیاء میں "قدرِ معلوم" کا علم دریافت نہیں کیا جو کوشش سے ہو سکتا تھا یا باوجود علم اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جس کی ہم قدرت رکھتے تھے...... ہماری رائے یہ ہے کہ چونکہ انسان اب اس درجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اس کو اختیار دیا گیا ہے کہ اپنے لئے جو روش چاہے اختیار کرے، اس لئے اب اس کی آئندہ ترقی اس کی اپنی سعی پر موقوف ہے۔ خواہ یہ ترقی دنیوی ہو یا اخروی لیکن اس کے ساتھ ایک امر ضرور ہے جو اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم کی ذات سے وابستہ ہے۔ یعنی یہ کہ ہم کیسے ہی بدکار گنہگار کیوں نہ ہوں، ہمیں ترقی ضرور کرنی ہے۔"

شیخ ابن عربی اس بات پر مصر ہیں کہ تمام انسان صراطِ مستقیم پر ہی ہیں لیکن ہماری نفسانیت اپنے اغراض کی تکمیل کے لئے دلفریب امیدیں پیدا کر دیتی ہے اور امیدوں کے ہجوم میں قلب مکدر ہو جاتا ہے۔ نفسانیت سے توہم پیدا ہوتا ہے اور توہم نفسانیت کو شہ دیتا ہے پھر:۔

"پھر اس ہوا و ہوس یا ظن کی متابعت سے ہم راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ نفسِ امارہ کو جو بدی کی طرف رہتا ہے یا ہوا و ہوس کی اصطلاح میں "شیطان" کہتے ہیں۔ شیخ اس کا مادہ "شیطنیت" یعنی بُعد یا دوری سمجھتے ہیں، شیخ کو عذاب و ثواب یا جنت و دوزخ سے انکار نہیں لیکن ان کے یہاں ضلالت اور غضبِ الٰہی دونوں عارضی امور ہیں۔"

دنیا کی دوسری تمام اشیا مجبور ہیں لیکن انسان مختار ہے اس لئے وہ مسلسل جد و جہد کے بل بوتے اپنی زندگی کو مقصدِ حیات سے ہم کنار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے:۔

"دیگر اشیا محض مجبور ہیں اور انسان مختار، اسی اختیار کے باعث انسان کے درجات میں فرق ہے۔ وہ شخص جو ہوائے نفسانی کا بندہ ہے۔ اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے جد و جہد کرتا ہے۔ نفسانیت ہماری گزشتہ زندگی کا بقیہ ہے۔ اس لئے نفسانیت اپنی ہستی قائم رکھنا چاہتی ہے اور انسانیت اس نفسانیت کو ہلاک کرنا چاہتی ہے۔" شیخ ابن عربی کے نزدیک عقل کا کام بس اتنا ہے کہ وہ حصولِ علم میں ممد و معاون ثابت ہو اور جو ہمیں خارجی کائنات سے متعارف کرا دے۔ ورنہ اس کے بعد انسانی تکمیل کی منزلیں "قلب" کی رہینِ منت ہیں۔

"مسئلہ جبر و اختیار کا مسئلہ اسی قلبِ انسانی نے فاش کر دیا ہم یقین کرتے ہیں کہ "تقدیر العزیز العلیم" نے انسان کو قلب اور قلب کو علم کا صدر مقام بنایا ہے اور اسی علم کی قدر کے مطابق انسان مختار ہے۔ یعنی جوں جوں ہمارا علم ترقی کرتا جائے گا، ہمارے اختیارات کے حدود وسیع ہوتے جائیں گے۔ ہم اسی واسطے مجبور ہیں کہ "جاہل" ہیں۔

شیخ ابن عربی کا انسان کامل پہلے اپنے آپ کو اللہ کی فطرت میں ڈھالنے کی مشق کرتا ہے۔ اس کے بعد اشیا کا علم حاصل کرتا ہے یا یہ علم اسے خود بخود حاصل ہو جاتا ہے بقول شیخ اکبر:۔

"اشیا کو اسی علم سے دیکھتا ہے جس علم سے وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اس لئے اگر ہم یہ کہیں کہ کسی شے کا اصل فنا نہیں ہوتا اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہو جس کی ممکنات صورتیں ہیں تو ہماری رائے میں یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے...... ذکر اور فکر سے انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ خلقت "بالحق" قائم ہے اور باطل نہیں ہے۔ باطل فنا ہونے والا ہے اور حق باقی رہے گا۔ باطل صرف صورتیں ہیں جن کا فنا ہونا ہمارے مشاہدے میں آچکا ہے...... تزکیۂ نفس سے تصفیۂ قلب حاصل ہوتا ہے، تزکیہ نفس اعتدال قائم رکھنے سے ہوتا ہے۔ تصفیۂ قلب کے بعد "ذکر" ہے اور ذکر کے بعد "فکر" ہے یعنی تصفیۂ قلب کے بعد اشیا کا صحیح تصور حاصل ہوتا ہے۔ صحیح تصور سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم اس شے کو اسی شے کے عین سے دیکھتے ہیں۔

اندیشۂ گل اگر کنی گل باشی
در بلبل بیقرار بلبل باشی

اسی موڑ پر انسان کامل جب خدائے واحد کی ہستی کا ادراک کرتا ہے تو ذاتِ باری کو ذاتِ باری کے عین سے دیکھنے کی کوشش ہی اسے فنا کی منزل میں پہنچا دیتی ہے، یہ محدود ہوتا ہے اور وہ لامحدود اور لامتناہی، گویا بندہ جذب و مستی سے سرشار ہو کر بجائے خود دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے اور اس کا ارادہ اور شعور سلب ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی حالت میں وہ خود کو "انا الحق" سے موسوم کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک سُکر کی یہ حالت بے عملی پیدا کرتی ہے اور انسان کامل کا کمال یہ نہیں کہ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے بلکہ حالتِ صحو میں آنا ہی انسانیت کی معراج ہے شیخ اکبر کا انسان کامل چونکہ اشیا کا ادراک ان کی "قدرِ معلوم" کے ذریعے کرتا ہے اور پھر خدا کی معرفت کے لئے اس کو اس کے عین سے دیکھنا چاہتا ہے۔ خدا ساری کائنات پر محیط ہے اور ساری کائنات اسی ذاتِ باری کی جلوہ نمائی کے مترادف ہے۔ الغرض انسان کامل اگر اس مرحلے سے کامیاب نکل جاتا ہے تو پھر ساری کائنات اس میں جذب ہو جاتی ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ خدا کی ہستی خالق کی ہے اور خالق و مخلوق میں انجذاب نہیں بلکہ مغائرت ہوتی ہے۔ شیخ کے اس تصور سے بے عملی اور رہبانیت کے گوشے پیدا ہوتے ہیں خواجہ حسن نظامی کے نام اقبال کے ایک مکتوب کا متعلقہ حصہ ان کے خیال کی مزید وضاحت کرتا ہے:۔

"میں شیخ (محی الدین ابن عربی) کی عظمت اور فضیلت دونوں کا قائل ہوں اور ان کو اسلام کے بڑے حکماء میں سے سمجھتا ہوں، مجھ کو ان کے اسلام میں بھی کوئی شک نہیں ہے کیوں کہ جو عقائد ان کے ہیں (مثلاً قدمِ ارواح اور وحدت الوجود) ان کو انہوں نے فلسفہ کی بنا پر نہیں جانا بلکہ نیک نیتی سے قرآنِ حکیم سے مستنبط کیا ہے۔ بس ان کے عقائد صحیح ہوں یا غلط، قرآن کی تاویل پر مبنی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو تاویل انہوں نے پیش کی ہے۔ وہ منطقی یا منقولی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط۔ اس لئے ان کو میں ایک مخلص مسلمان سمجھتا ہوں۔ مگر ان کے عقائد کا پیرو نہیں ہوں۔"

خواجہ حافظ کے متعلق اقبال کے خیالات پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہو گئی۔ اس سلسلے میں اکبر لٰہ آبادی اور اقبال کے درمیان بھی نظریاتی غلط فہمیاں ہو گئی تھیں۔ اکبر لٰہ آبادی کے کچھ سوالوں کے جواب سے متعلق اقبال کے ایک خط کی چند سطور ملاحظہ ہوں:۔

"میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کون تصوف میرے نزدیک قابلِ اعتراض ہے، میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مجھ سے پہلے حضرت علاؤ الدین سمنانیؒ یہی بات لکھ چکے ہیں، حضرت جنید بغدادی لکھ چکے ہیں، میں نے شیخ محی الدین ابن عربی اور منصور کے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھے جو حضرت سمنانی اور جنیدؒ نے ان کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔"

اب تک شیخ ابن عربی کے جن خیالات کو پیش کیا گیا ہے، اس سے ایک حقیقت بالکل واضح ...... ہے کہ شیخ کا انسان کامل ساری کائنات پر محیط ہے اور ذاتِ باری میں ضم ہے۔ خالق اور مخلوق کے اس انضمام سے شریعت کے متعین کردہ اوامر اور نواہی کو عملی جامہ پہنانے میں بہت سی رکاوٹیں سامنے آ جاتی ہیں۔ یہ بجا ہے کہ شیخ کا انسان کامل بے حد باخبر، صالح اور ہمہ محیط ہے لیکن جذب و مستی سے اسے نجات نہیں۔ اس لئے معاشرے کی ذمہ داریوں کی تکمیل کی وضاحت نہیں ہو پاتی۔ جذب و مستی تو تکمیلِ کمال کی ایک منزل ہے جسے شیخ نے آخری مقام قرار دیا ہے۔ دوسری بات جو سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کامل مادی تقاضوں سے مبرا خالص روحانی پیکر کی طرح ابھرتا ہے اور اس کے بشری خصائص کی عمومیت ختم ہو جاتی ہے جس کے سبب وہ لائقِ تقلید نہیں رہ جاتا۔

(۲) شیخ احمد سرہندی کا نظریۂ وحدت الشہود

ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کے ٹھیک برعکس شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے نظریہ

اور مخلوق ہے۔ وحدت الوجود کے حامی عالم کو عین حق تصور کرتے ہیں اور مجدد الف ثانی اسے ایک کشفی غلطی سے تعبیر کرتے ہیں:۔

''اپنے قلبی تجربات کی روشنی میں اس توضیح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ایک مقام پر پہونچ کر صوفی پر کسی حال کے غالب آ جانے کی وجہ سے سب حق نظر آتا ہے۔ جس طرح دن کے وقت ستارے نظر سے پوشیدہ ہو جاتے ہیں مگر معدوم نہیں ہوتے، اسی طرح عالم ان کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتا ہے، قلبی تجربہ کی اس مخصوص کیفیت سے صوفی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ عالم کی حقیقت عین حق ہے۔''

مجدد صاحب کے مکتوبات سے درج ذیل اقتباس اس اجمال کی صراحت کے لئے ملاحظہ ہو:۔

''توحید شہودی ایک کو دیکھنا ہے یعنی ایک کے سوا سالک کو کچھ شعور نہیں ہوتا اور توحید وجودی ایک موجود کو جاننا اور اس کے غیر کو نابود سمجھنا۔ پس توحید وجودی علم الیقین کی قسم ہے اور توحید شہودی عین الیقین کی قسم سے ہے۔ مثلاً ایک شخص کو آفتاب کے وجود کا علم ہو گیا تو اس یقین کا غلبہ اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ ستاروں کو اس وقت نیست و نابود جانے اگرچہ جب آفتاب کو دیکھے گا اس وقت ستاروں کو نہیں دیکھے گا اور آفتاب کے سوا اس کو کچھ نظر نہ آئے گا۔ اور اس وقت بھی جب وہ ستاروں کو نہیں دیکھتا وہ جانتا ہے کہ ستارے نیست و نابود نہیں ہیں بلکہ موجود ہیں لیکن چھپے ہوئے ہیں اور سورج کی روشنی میں مغلوب ہیں۔ یہ شخص ان لوگوں کے ساتھ جو اس وقت ستاروں کے وجود کی نفی کرتے ہیں انکار کے مقام میں ہے اور جانتا ہے کہ یہ معرفت صحیح نہیں ہے۔ پس توحید وجودی جو ماسوائے ذات حق کی نفی ہے۔ عقل و شرع کے ساتھ مخالفت ہے۔ مثلاً آفتاب کے طلوع ہونے کے وقت ستاروں کی نفی کرنا اور ان کو معدوم سمجھنا خلاف واقعہ ہے۔ لیکن ستاروں کو اس وقت نہ دیکھنا آفتاب کی روشنی کے غلبہ اور دیکھنے والے کی کمزوری کے باعث ہے۔ اگر دیکھنے والے کی آنکھ اس آفتاب کی روشنی سے روشن ہو جائے اور قوت پیدا کرے تو ستاروں کو آفتاب سے جدا دیکھے گا۔ اور یہ دیکھنا حق الیقین میں ہے۔

مجدد الف ثانی کے مذکورہ بالا بیان سے صوفی کا صحیح مقام سامنے آ جاتا ہے اور نفی خودی کی منزل سے وہ پھر اپنی خودی کے خول میں واپس چلا آتا ہے اس کا ذہن صیقل ہو جاتا ہے اور ستاروں کا وجود تسلیم کر لینے کے بعد وہ معاشرے کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوگا کیوں کہ اجتماعی زندگی میں زندگی کا اجتماعی شعور جتنا پختہ ہوگا اتنا ہی زیادہ صوفی کا نصب العین معاشرے کے لئے لائق تقلید ہوگا یہ اور بات ہے کہ اسے پہلے انفرادی تکمیل کے مراحل سے ہی گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن راہ کو منزل تصور کر کے رُک جانے پر اس پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے وہ جذب کی ہوتی ہے اور ایسے عالم میں وہ دوسرے انسانوں کو اس منصب سے آگاہ کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ بجائے خود مدہوش اور مستکلیف ہوتا ہے۔

(۴) سید عبدالکریم جیلی کا نظریۂ انسان کامل

جیلی کا انسان کامل الٰہیاتی اور مابعد الطبعیاتی تعینات سے الگ ہٹ کر ہے۔ وہ کسی مخصوص فکری سانچے میں نہیں سماتا، یہی اس کی انفرادیت ہے:۔

''عبدالکریم جیلی کے انسان کامل کا راستہ الٰہیات اور مابعد الطبعیات میں بہت الجھا ہوا ہے مگر انسان کامل کے کسی اور واحد نظریے کا اقبال کے درویش اور مومن کے تصور پر اتنا اثر نہیں پڑا جتنا جیلی کے بعض خیالات کا پڑا ہے۔ جیلی کے انسان کامل پر اقبال نے ایک مضمون لکھا تھا جو انہوں نے کچھ عرصے بعد ''فلسفۂ عجم'' میں شامل کر لیا۔''

یوں تو جیلی کو سمجھنا دشوار ہے لیکن اقبال نے جیلی پر مضمون لکھ کر اس کے تصور انسان کامل کو بہت کچھ قابل فہم بنا دیا ہے۔ جیلی نے انسان کی تعریف یوں کی ہے:۔

''جان کی عظمت آگ ہے، علم پانی ہے، قوٰی ہوا ہیں، حکمت مٹی ہے، یہ چار عناصر ہیں جن سے ہمارا جوہر یکتا تیار ہوا ہے۔ اس جوہر کے دو عرض ہیں، ایک ازل دوسرا ابد اور اس کے دو وصف ہیں۔ پہلا حق دوسرا خلق اور اس کی دو صفتیں ہیں۔ ایک قدم دوسری حدوث، اس کے دو اسم ہیں، ایک رب دوسرا عبد اور اس کے دو رخ ہیں ایک ظاہر اور وہ دنیا ہے، دوسرا باطن ہے وہ آخرت ہے، اس کے دو حکم ہیں، ایک وجوب دوسرا امکان اور اس کے دو اعتبار ہیں پہلا اعتبار یہ ہے کہ اپنے حق میں موجود اور اپنے غیر کے حق میں موجود ہو اور دوسرا اعتبار یہ ہے کہ اپنے حق میں موجود اور اپنے غیر کے حق میں مفقود ہو اور اس کے لئے دو معرفتیں ہیں۔ پہلی معرفت یہ کہ اول مرتبہ میں اس کی وجوبیت اور دوسرے مرتبہ میں اس کی سلبیت ہو، دوسری معرفت اس کے برعکس ہے۔''

جیلی کے نزدیک اسم کا مفہوم عام مفہوم سے قطعی جداگانہ ہے وہ اسم ہی کو معرفت کا مرکزی نقطہ ٹھہراتے ہیں اور اسی کے سہارے ادراک میں مسمّی کا تصور قائم کرتے ہیں اور کسی اسم سے جو خاص صفتیں مترشح ہوتی ہیں وہی اس شے کی ذات ہوتی ہے:۔

اسم مسمّی کو ہماری فہم میں جما دیتا ہے۔ ذہن میں اس کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ تخیل میں اس کو متحیر کرتا ہے...... اسم ایک آئینہ ہے جو ہستی مطلق کے تمام اسرار منکشف کر دیتا ہے۔ یہ ایک روشنی ہے جس کے ذریعے خدا اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔

''اسم کی بنا پر اقبال نے ان مباحث کا خلاصہ سمجھایا ہے جو اس نے ہستی خالص ہونے کے اپنی مطلقیت کو چھوڑنے کے بعد تین منازل سے گزرتی ہے (۱) احدیت (۲) غیریت (۳) ذاتیت۔ پہلی منزل میں تمام اعراض و علائق کا فقدان ہوتا ہے۔ پھر بھی اس کو واحد ہی سمجھتے ہیں۔ دوسری منزل میں ہستی خالص تمام مظاہر سے آزاد رہتی ہے اور تیسری منزل انفصال ذات باری تعالیٰ ہے۔ یہ تیسری منزل اسم اللہ کا دائرہ ہے...... یعنی ہستی خالص کی ظلمت کو منور کیا جاتا ہے فطرت اس کے سامنے آ جاتی ہے ہستی مطلق ذی شعور ہو جاتی ہے۔''

''ارتقائے مطلق کے تین منازل کے مقابلے میں انسان کامل کے روحانی تادیب کے بھی تین منازل ہیں لیکن انسان کامل کے عمل ارتقاء کو معکوس ہونا چاہئے کیوں کہ اس کا عمل ارتقاء ترقی کی طرف ہے اور ہستی مطلق تو دراصل تنزل کی طرف آتی ہے۔ اپنی روحانی ترقی کی پہلی منزل میں وہ اسم پر استغراق کرتا ہے اور اس فطرت کا مطالعہ کرتا ہے جس پر یہ اسم مرتسم ہے، دوسری منزل میں وہ عرض کے دائرے میں قدم رکھتا ہے۔ تیسری منزل میں وہ جوہر کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ انسان کامل بنتا ہے۔'' اقبال کی تربیت خودی کی تین منزلیں جیلی کے تصورات ہی کی رہین منت معلوم ہوتی ہیں۔ نیابت الٰہی یا انسان کامل کی تعریف عبدالکریم جیلی کی زبانی سنئے:۔

''پھر جان کہ اللہ تعالیٰ نے اس اسم کو انسان کے لئے ایک آئینہ بنایا ہے، پھر جب اپنے منہ کو اس نے آئینے میں دیکھا تو اس پر اس بات کی حقیقت کھل گئی کہ ''کان اللہ ولا شئی معہ'' بس اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی اور اس پر ظاہر ہو گیا کہ اس کی شنوائی اللہ کی شنوائی ہے اور اس کی آنکھ اللہ کی آنکھ ہے اور اس کا کلام اللہ کا کلام ہے اور اس کی حیات اللہ کی حیات، اور اس کا علم اللہ کا علم، اور اس کی ارادت اللہ کی ارادت اور اس کی قدرت اللہ کی قدرت۔''

بقول عزیز احمد ''مسجد قرطبہ'' کے ایک بند میں اقبال نے مذکورہ بالا خیالات کو من و عن بیان کیا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
نقطۂ پرکار حق، مرد خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

جیلی کے انسان کامل کی تکمیل کے مرحلوں کی نشاندہی اقبال نے مندرجہ ذیل لفظوں میں کی

''انسان کو کمال کی طرف ترقی کرنے میں جن تین منازل سے گزرنا پڑتا ہے، اس میں سے پہلی منزل میں اس اسم میں استغراق اور مراقبہ کرنا پڑتا ہے جس کو جیلی نے تمام اسماء کی تجلی سے تعبیر کیا ہے۔ جس کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ اللہ اس کی طرف سے اس شخص کو جواب دیتا ہے اور جو اس کو پکارتا ہے، جب وہ غضب میں آتا ہے تو خدا بھی غضب میں آتا ہے اور جب وہ راضی ہوتا ہے تو خدا بھی راضی ہوتا ہے۔

انسان کامل کی روحانی تادیب کی دوسری منزل میں ایک دوسری صفت بھی اس سے آملتی ہے اور انسان حسب بساط اسے جذب کرتا ہے اور اس مرحلے میں انسان کامل خدا کی صفات اور ان کی اصلی ماہیت میں سے اسی تناسب سے اکتساب کرتا ہے جس تناسب میں اس کی ذات میں دم خم ہوتا ہے۔''

''تیسری منزل جو انسان کامل کی ہے جب کہ وہ انسان کامل کی تمام صفات ربانی سے تجلی حاصل کر کے اسم و اعراض کے دائرے سے گزر جاتا ہے اور جوہر وجود مطلق کے قلمرو میں قدم رکھتا ہے ..... یہی وہ نقطہ ہے جہاں انسانیت اور الٰہیت ایک ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ انسان ربانی کی پیدائش ہے۔''

عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب کے ساتھویں باب میں انسان کامل پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس شرح وسط کی اجمالی یہ ہے کہ:۔

''جمیع افراد انسانی میں سے ہر ایک اپنے کمال کے ساتھ دوسرے کا نسخہ ہے، جو بات ایک میں ہے وہ دوسرے میں پائی جاتی ہے لیکن بعض میں وہ اشیا بالقوۃ ہوتی ہیں اور بعض میں ''بالفعل'' پھر وہ کمال میں متفاوت ہوتے ہیں، بعض اس میں سے کامل اور اکمل ہوتے ہیں اور وہ انسان کامل ہوتے ہیں۔''

جیلی کا یہی متذکرہ بالا بیان انسان کامل کو معاشرے کے لئے مفید اور لائق تقلید بناتا ہے، یہی اسے اپنی انفرادی صلاحیتوں کو اجتماعی مفاد کی خاطر موقف کرانے کی دعوت دیتا ہے۔ انسان کامل کا ایک آئیڈیل جیلی کے ذہن میں موجود ہے اور وہ شخصیت ہے۔

حضرت رسول کریم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ لیکن اس باب میں جیلی کا یہ عقیدہ ہے کہ رسولِ مقبولؐ کے بعد بھی جو کوئی ان راہوں پر چلنے کی کوشش کرے گا اور اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگا وہ انسان کامل کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے۔ حفظ مراتب کا فرق حسب بساط ہوگا۔ اس کا انکشاف وہ اس طرح کرتے ہیں۔

''انسان کامل وہ قطب ہے جس پر اول سے آخر تک وجود کے فلک گردش کرتے ہیں اور جب سے وجود کی ابتدا ہوئی اس وقت سے لے کر ابدالآباد تک ایک ہی شے ہے۔ اس کا اصلی نام محمدؐ ہے ..... پھر ہر زمانے میں اس کا ایک نام ہے۔''

عبدالکریم جیلی کے انسان کامل سے متعلق اقبال کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے عزیز احمد صاحب رقمطراز ہیں:۔

''عبدالکریم جیلی کا طرز تفکر متصوفانہ اور الٰہیاتی ہے۔ اسلوب قرونِ وسطیٰ کا ہے، اسی لئے اقبال نے الجیلی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ اقبال پر جیلی کے ممکنہ اثرات پر اس سے روشنی پڑتی ہے بلکہ خود جیلی کا انسان کامل کے نظام کامل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انسان کامل کی ارتقا کی تنقید کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں۔

''روحانی ارتقا کی اس بلندی پر انسان کامل کس طرح پہنچتا ہے، اس کو ہمارے مصنف نے بیان نہیں کیا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ ہر منزل میں اس کو ایک خاص قسم کا تجربہ ہوتا ہے اور اس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ نہیں ہے۔ اس تجربے کے آلے کو قلب سے تعبیر کرتا ہے ..... وہ قلب کا ایک صوفیانہ نقشہ پیش کرتا ہے اور اس کی اس طرح توجیہہ کرتا ہے کہ یہ ایک آنکھ ہے جو اسما و اعراض اور ہستی، مطلق کا علی الترتیب مشاہدہ کرتی ہے، یہ نفس اور روح کے پر اسرار اتحاد سے پیدا ہوتا ہے اور وجود کے انتہائی حقائق کو معلوم کرنے کا فطرتاً ایک آلہ بن جاتا ہے۔

جیلی کا انسان کامل پیغمبرانہ شان کے ساتھ ابھرتا ہے لیکن اس کی شخصیت کی فلسفیانہ اور صوفیانہ جہتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جیلی کا تصور انسان چونکہ ذات محمدی سے وابستہ ہے، اس لئے اس کا دائرہ عمل اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ یہ کائنات، بعض مقامات پر جیلی کے تصورات سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کی ذات اقدس کو مینارۂ نور تسلیم کر کے اسی روشنی میں اپنے فکر کی تشریح و تاویل کرتا ہے۔ اس طرح رسول اقدس کے بعد جیلی کے مطابق جو بھی انسان کامل ہوگا وہ پابند شریعت ہوگا۔ کیوں کہ اس نے رسول اکرمؐ کی ذات گرامی کو پہلے انسان کامل تصور کیا ہے۔ اس کے بعد اسی ذات اقدس کے اسم کے انسان کامل کو مسمیٰ کیا ہے اس طرح جیلی کا انسان کامل بھی مرد مومن ہی ہے مگر تاویلات کی پیچیدگی میں بعض اوقات کی شباہت بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ گاہ وہ صوفی ہے تو گاہ فلسفی، بہر حال منزل مقصود پر پہنچ کر مومن ہی نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں عزیز احمد اقبال کے مرد مومن سے موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

''میرے خیال میں اقبال کے انسان کامل کا راستہ بھی جیلی سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ پھر بھی اقبال کے انسان کامل اور جیلی کے انسان کامل میں بعض مشترک قدریں ہیں۔ مثلاً حیات، علم، ارادہ، جمال فطرت، عظمت و جلال۔ اقبال کے نزدیک بھی انسان کامل کا ظہور تسلسل فطرت کے لئے ضروری ہے۔ جیلی کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔'' الجیلی کا خیال ہے کہ انسان کامل کائنات کا محافظ ہے۔ لہٰذا تسلسل فطرت کے لئے انسان کامل کا ظہور ایک لازمی شرط ہے۔ یہ ذہن نشین کر لینا آسان ہے کہ ہستی، مطلق جو اپنی مطلقیت کو چھوڑ چکی تھی، پھر انسان کامل میں واپس آ جاتی ہے اور بغیر انسان کامل کے اس کے لئے ایسا کرنا ناممکن تھا۔''

مولانا روم کا مرد عارف

مولانا جلال الدین رومی ۱۲۷۳ء تصوف کی دنیا میں ایک مجتہد کی صورت سے ابھرتے ہیں۔ ان سے قبل اکثر و بیشتر صوفیاء کے یہاں صوفی کا جو پیکر تیار ہوتا ہے اس کا مجموعی مزاج منفی رجحانات اور داخلی تجربات پر حاصل ہے۔ جنید بغدادیؒ اور عبدالکریم جیلی کے یہاں بھی یہ اجتہادی نشان پائی جاتی ہے لیکن مولانا نے صوفی کو جبر کے شکنجے سے قطعی طور پر آزاد کر دیا۔ اتنا ہی نہیں جذب و مستی کے ساتھ ساتھ صاحب اختیار انسان اپنی ساری توانائی اور امکانی قوتوں کے ساتھ ارادے اور اختیار پر بھروسہ کرتے ہوئے عمل پیہم اور جہد مسلسل کی تلقین کرتا ہے۔ ان سے قبل کے صوفیا کا مجبور انسان (جو محض ذات خداوندی کے وصل کا متمنی ہے) دفعتاً خم ٹھونک کر اپنی انفرادیت کا اعلان کرتا ہے اور کمال کی امکانی منزلوں کے سراغ میں سرگرداں ہے۔ مولانا نے حیات و کائنات کی نئی تاویلیں اور تعبیریں ایسے اچھوتے انداز میں پیش کیں کہ ایک لازوال نقش اب تک باقی ہے:۔

''اس موقع پر یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ مولانا کے زمانے میں جو عقیدہ تمام اسلامی ممالک میں پھیلا ہوا تھا، وہ جبر یہ تھا کیوں کہ اشاعرہ کا عقیدہ دراصل جبر ہی کا دوسرا نام ہے چنانچہ امام رازیؒ نے ''تفسیر کبیر'' میں سینکڑوں جگہ صاف صاف جبر کو ثابت کیا ہے ..... باوجود اس کے کہ مولانا کا عام عقیدہ سے الگ روش اختیار کرنا ان کے کمال اجتہاد بلکہ قوت قدسیہ کی دلیل ہے۔''

غرض مولانا روم نے اپنے زمانے کے عقائد کا رخ موڑ کر اسے حرکی بنا دیا۔ تشکیک اور ارتیابیت کو انہوں نے یقین اور امید سے بدل دیا۔ زندگی کو مثبت نظریہ عطا کر کے اسے سوز و ساز آرزو اور جستجو سے ہم کنار کر دیا۔ انہوں نے عشق کے مقابلے میں عقل کی نارسائی کا شکوہ ہی نہیں کیا بلکہ عشق کا نغمہ کچھ اس انداز سے چھیڑا کہ وہ ساری کائنات پر محیط ہو گیا، تخلیق آدم اور تقدیر آدم کی نئے انداز سے تشریح کی اور انسان کو فنا ہونے سے بچا لیا۔ تصوف کا مسئلہ فنا اور بقا ان کے یہاں آ کر نئی جہت اختیار کر

ہو جائے۔ بلکہ ادنیٰ حالت سے ارفع صورت میں ڈھلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ صورت فنا ہو جائے، اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ پہلے تم جماد تھے پھر تم میں قوت نمو پیدا ہوئی، پھر تم میں جان آئی پھر عقل و تمیز، پھر حواس خمسہ کے علاوہ اور حواس حاصل ہوئے۔ جب فناؤں میں تم نے یہ بقائیں دیکھیں تو جسم کی بقا پر کیوں جان دیتے ہو، نیا لو اور پرانا چھوڑ دو۔ کیوں کہ تمہارا ہر سال پار سال سے اچھا ہے۔''

از جمادی بے خبر سوئے نما — و زنما سوئے حیات و ابتلا
باز سوئی عقل و تمیزات خوش — باز سوئی خارج ایں بیش و شش
در فنا ہا ایں بقاہا دیدۂ — بر بقائے جسم چوں چسپیدۂ
تازہ می گیرد کہن رامی سپار — کہ ہر امسالت فزوں ست از سہ پار

مندرجہ بالا اشعار اس امر کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ مولانا روم مسئلہ فنا کو نظریہ ارتقاء سے حل کرتے ہیں۔ مولانا کا عارف زیرکی اور چالاکی سے متنفر ہے بلکہ وہ علم اور عشق کا قائل ہے اور اسی حربے کو اعصائے موسوی کے طور پر حیات کی شاہراہوں پر ٹیکتا ہوا ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے۔ انہیں اس امر کا اعتراف ہے کہ:۔

''حقیقت کا عشق معرفت کی اساس ہے..... دنیا میں بہت سے علوم وفنون اور ہنر ایسے ہیں جن مقصود کچھ مادی مفاد حاصل کرنا ہے یا جسمانی لحاظ سے جلب منفعت یا دفع مضرت، بہت سی معلومات انسان اپنی ہوسوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے کرتا ہے۔ بعض لوگ چالاک شمار ہوتے ہیں، دوسروں کو دھوکا دینے کے لئے بہت سی معلومات اور نفسیات استعمال کی جاتی ہیں۔ کامیاب طور پر دھوکا دینے کے لئے بہت سے واقعات کا علم حاصل کرنا پڑتا ہے..... بعض صوفیا کا یہ قول مشہور ہے کہ ''العلم حجاب الاکبر'' خدا کی طرف بڑھتے ہوئے یہ علم معاون ہونے کے بجائے ایک گاڑھا پردہ بن جاتا ہے۔ معرفت اور عشق کی خاطر تزکیہ نفس کرتے ہوئے اس قسم کی زیرکی کا بھی صفایا کرنا لازمی ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ دیکھو! نادان نوآموز بچہ پہلے تختی کو دھوتا ہے تا کہ اس پر کچھ نئے حروف لکھ سکے۔ لکھنے والا ایسا کاغذ ڈھونڈتا ہے جو سادہ ہو اور اس پر پہلے کچھ لکھا ہوا نہ ہو، کنواں کھودتے ہوئے پہلے مٹی باہر نکال کر پھینکنا پڑتی ہے تا کہ خالص پانی تک پہنچ سکیں، اسی طرح بیج بونے والا زمین کا وہ ٹکڑا تلاش کرتا ہے جہاں پہلے سے کچھ اگا ہوا نہ ہو، نیا گھر بنانے کے لئے پہلی بنیادوں کو کھود ڈالنا پڑتا ہے، مادی علوم سے روحانی علوم کی طرف ترقی کرنے کے لئے بھی لازماً ایسا ہی کرنا پڑے گا۔''

لوح راہ اول بشوید بیوقوف — آنگہے بروئے نویسد او حروف
وقت شستن لوح را باید شناخت — کہ مراں را دفترے خواہند ساخت
کاغذے جوید کہ آں نوشتہ نیست — تخم کارد موضع کہ کشتہ نیست
چوں اساس خانہ نو افگند — اولیں بنیاد را برمے کند
گل بر آرند اول از قعر زمین — تا بہ آخر برکشی مائے متین

مولانا کا انسان یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کا قائل ہے وہ محبت کرتا ہے اور محبوب کی خاطر اپنا سب کچھ خوشی خوشی لٹا دینا چاہتا ہے۔

از محبت دار تختے می شود
وز محبت بار بختے می شود

''محبت کے ساتھ قید خانہ بھی گلشن معلوم ہوتا ہے اور نار نمرود گلستان ابراہیم بن جاتی ہے، اس کے برعکس اگر کسی کو باغ و بہار و گل و گلزار میں رکھا جائے لیکن اس کے دل میں میں اگر کسی اچھی محبت کی گرمی نہ ہو تو اس کو گلستان بھی ایک بھٹی معلوم ہوگا۔

از محبت خس گلشن می شود — بے محبت روضہ گلخن می شود

''اگر کسی شخص کو کسی کام سے دلی لگاؤ نہ ہو تو وہ کام خواہ کتنا ہی آسان ہو اسے کرنے کے لئے طبیعت آمادہ نہیں ہوتی اور وہ کام نہایت دشوار اور سنگین معلوم ہوتا ہے اس کے برعکس اگر کام کتنا ہی سنگین ہو لیکن عشق قوت آفریں ہو تو پتھر روغن کی طرح سیال ہو جائے۔ فرہاد کو کوہکنی میں کیا لطف آتا ہو گا۔

برائی کوہکن از کاخ بے ستوں کم
نیست
صدائے تیشہ ز آواز ارغنوں کم
نیست

پتھروں کی خارائی محبت کی لطافت میں گداز ہوتی ہوگی۔

از محبت سنگ روغن می شود
بے محبت موم آہن می شود
از محبت حزن شادی می شود
وز محبت غول ہادی می شود

محبت کرنے والا نیش کو نوش سمجھتا ہے اور جگر کے اندر تیر نیم کش سے اس کو نا قابل بیان لطف حاصل ہوتا ہے اگر شیر پر محبت غالب ہو تو وہ محبوب کے سامنے دبک کر چوہا بن جائے۔ محبت میں بڑے بڑے تند خو اور سخت گیر لوگ ایسے رام ہوتے ہیں کہ لوگوں کو خصلت کی یہ تبدیلی ایک اعجاز معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عمر فاروق میں جب خدا اور رسول اسلام کی محبت سرایت کر گئی تو ان کی مشہور عالم درشتی کمال درجے کے عجز و انکسار میں تبدیل ہو گئی چنانچہ انہوں نے خود فرمایا کہ میں بڑا سخت گیر انسان تھا اسلام نے مجھ کو نرم کر دیا، اس کے برعکس حضرت ابوبکر صدیق فرماتے تھے کہ میں بڑا نرم اور رقیق القلب شخص تھا لیکن خلافت کی ذمہ داریوں نے مجھے سخت بنا دیا کہ میں ضعیفوں کو زبردستوں کے مقابلے میں ان کے حقوق دلوانے میں ملائمت نہ برتوں۔

از محبت نیش نوشی می شود
وز محبت شیر موشی می شود

مولانا روم اطاعت و بندگی کے لئے عشق کے پہلو پر اسی لئے زور دیتے ہیں کہ جب خدا اور اس کے رسول سے انسان کو عشق ہو جائے تو پھر وہ ان تمام چیزوں سے محبت کرنے لگتا ہے جسے خدا اور رسول پسند کرتے ہیں اور ان ساری چیزوں سے اجتناب کرتا ہے جسے مشیت ایزدی ناپسند کرتی ہے، وہ شریعت کا اس لئے پابند نہیں ہوتا کہ اسے خدا اور رسول کا حکم جاننا ہے بلکہ اس کی فطرت ہی کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ محبوب کے اشارے پر ناچنے لگتا ہے اور اس کے ہر اشارے کو جب عملی جامہ پہناتا ہے تو اسے ایک تازہ مسرت اور انبساط کا احساس ہوتا ہے۔ اسلام خود کو دین فطرت کہتا ہے۔ عاشق کی فطرت وہی ہو جاتی ہے جو قرآن اور صاحب قرآن کی فطرت ہے۔ اس طرح اوامر و نواہی کا وہ خود بخود پابند ہو جاتا ہے۔ لیکن علم و عشق کے باب میں مولانا روم جو ایک نکتے کا انکشاف کرتے ہیں وہ یہ کہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنے علم کے ذریعے پہلے خدا اور رسول اور اپنی ذات کو پہچانے کیوں کہ

بے علم نتواں خدا را شناخت

محبت کے اعلیٰ اور انسانی مدارج دانش ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں اس تخت شرف پر بیٹھنا بے عقلوں کا کام نہیں ہے۔

ایں محبت ہم نتیجۂ دانش است
کے گزافہ بر چنیں تختے نشست

اور علم ایک نور الہٰی ہے جو عاصی کے قلب میں منعکس نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کے قلب پر حرص اور غلط اندیشی نے غلاف چڑھا دیا ہے جب ذاتی اغراض سے پاک ہو کر خالص طلب حق پیدا ہو تو پھر ایسے حقائق منکشف ہوتے ہیں جن کے حصول کے لئے کسی خارجی واسطے کی ضرورت نہیں رہتی اور انسان کتابوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ایک علم وہ ہے جو علم الکتاب ہے اور دوسرا علم اُم الکتاب ہے جب تزکیہ نفس سے انسان خود اُم الکتاب بن جائے تو ضروری علوم اس کے اندر سے اس طرح اُبھریں گے جس طرح چشمے میں سے پانی نکلتا ہے۔

خویش را صافی کن از دصاف خود
تا بہ بینی ذات پاک صاف خود
بینی اندر دل علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا
بے صحیحین و احادیث و رواۃ
بلکہ اندر مشرب آب حیات

مولانا سختی سے وحدانیت کے قائل ہیں اور کسی قیمت پر بھی خدا کی ذات میں مدغم ہونا پسند نہیں کرتے۔ اور منصور حلاج کے ''انا الحق'' اور بایزید بسطامیؒ کے ''سبحانی اعظم شانی'' کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لوہا جب آگ میں گرم کیا جاتا ہے اور سرخ ہو کر آگ کا ہم رنگ ہو جاتا ہے تو گو وہ آگ نہیں ہو جاتا، لیکن اس میں تمام خاصیتیں آگ کی پیدا ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ خود لوہے کہ اپنے اوپر آگ کا گمان ہوتا ہے۔ فنافی اللہ کی یہی منزل ہے، لیکن ٹھنڈا ہونے کے بعد پھر لوہا لوہا ہے۔

رنگ آہن محو رنگ آتش است
ز آتشی می لافد و خامش وش است

چوں بہ سرخی گشت، ہمچوں زرکاں
پس انا النارست لافش بے زباں
شدز رنگ و طبع آتش محتشم
گوید او من آتشم من آتشم
آتشم من گر ترا شک ست وظن
آزموں کن، دست را بر من بزن
آتشم من بر تو گرشد مشتبہ
روئی خود بر روئی من یکدم بنہ
آدمی چوں نور گیرد از خدا
ہست مسجود ملائک ز اجتبا

اور جب انسان عشق و معرفت کی بھٹی میں تپ جاتا ہے تو پھر اس کی تقدیر تقدیر الٰہی بن جاتی ہے اور وہ بالکل اپنے آپ کو رضائے الٰہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ایک صوفی سے کسی نے پوچھا کہ کیسی گزرتی ہے بولے کہ آسمان میری ہی مرضی پر حرکت کرتا ہے۔ ستارے میرے ہی کہنے کے لئے مطابق حرکت کرتے ہیں، زمین میرے ہی حکم سے دانے اگاتی ہے، بادل میرے ہی اشاروں پر برستے ہیں، سائل نے تعجب سے پوچھا یہ کیوں کر؟ فرمایا میری کوئی ذاتی خواہش نہیں بلکہ جو کچھ وقوع میں آتا ہے وہی میری خواہش ہے لہٰذا جو کچھ ہوتا ہے وہ میری ہی خواہش کے موافق ہوتا ہے اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مولانا روم کا انسان بے عملی کا شکار ہے۔ بلکہ اس سے وہی عمل سرزد ہوتا ہے جو خدا کو پسند ہے۔ مولانا روم توعمل کے اس قدر قائل ہیں کہ وہ خدا سے پہلے انسان کی تلاش کرتے ہیں اور انسان اپنے عمل کے خمیر سے بنتا ہے۔ دیو جانس ایک دن منڈی میں چراغ لے کر پھر رہے تھے۔ لوگ انہیں ایک سنکی حکیم سمجھتے تھے۔ اس لئے استہزاً دریافت کیا ''کس چیز کی تلاش ہے؟'' انہوں نے جواب دیا، آدمی کی۔ لوگوں نے کہا کیوں تمہیں آدمیوں کا یہ ہجوم نظر نہیں آتا، انہوں نے کہا۔ یہ سب ادنیٰ درجے کی مخلوق ہیں، آدمی ان میں ایک بھی نہیں، مولانا بھی ویسے ہی آدمی کی تلاش میں ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
از ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نہ شود آنم
آرزو ست

مولانا روم کو جس انسان کی تلاش ہے وہ اپنی تقدیر کا خالق آپ ہے:-

''رومی نطشے اور اقبال تینوں کی جرأت اس بارے میں حیرت انگیز ہے...... اس مضمون کو کہ انسان کی زندگی کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ انسان خدا کو تلاش کرے، اقبال نے الٹ دیا ہے، وہ کہتا ہے کہ انسان پہلے اپنی تلاش کرے، اس کے لئے یہ راستہ زیادہ صحیح ہے کیونکہ ''خدا ہم در تلاش آدمی ہست'' اکثر مذاہب کی یہ تعلیم تھی کہ انسان تقدیر کی نوشت یا کرم کی کڑیوں سے پا بہ زنجیر ہے۔ لیکن رومی اور اقبال دونوں نے تقدیر کے مفہوم کی نئی تعبیر کی ہے، ان دونوں کے نزدیک روح انسانی خود اپنی تقدیر کی معمار ہو سکتی ہے۔ مومن خود تقدیر الٰہی ہے جب وہ خود بدل جاتا ہے تو اس کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ مولانا نے ''قدم جف القلم'' کی ایک بلیغ تفسیر کی ہے تقدیر کا قلم خشک ہو چکا ہے، جو مقدور تھا مقرر ہو چکا ہے اور اس میں کوئی کانٹ چھانٹ اور اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے عام طور پر یہ مراد لی جاتی ہے کہ ہر شخص کے اعمال پہلے سے مقرر ہیں جو خیر و شر انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ خدا ہی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے انسان کے اعمال سزا و جزا کے مستوجب ہیں۔ اس انداز فکر سے نہ صرف منطقی تناقص پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ اخلاقی ذمہ داری کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے، بغیر اختیار حقیقی کے اخلاقی ذمہ داری ایک مہمل چیز ہے، مولانا روم فرماتے ہیں کہ جس کو تقدیر کہتے ہیں وہ حقیقت میں قوانین حیات کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ قانون قانون ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ تبدیلی اور تلون سے مبرا نہ ہو۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ تقدیر کا اٹل ہونا صحیح ہے، سنت اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ سنت اللہ یہ ہے کہ اگر تم چوری کرو گے تو تم پر اور جماعت پر فلاں فلاں نتائج مرتب ہوں گے۔ سچ بولو گے تو فلاں فلاں قسم کی صلاح و فلاح اس کا نتیجہ ہو گی۔ خدا نہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر اس سے چوری کراتا ہے اور نہ کسی کی زبان کو ہلا کر اس سے سچ یا جھوٹ بلواتا ہے عمل اختیار سے سرزد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے نتائج تقدیری یعنی آئینی ہیں جو فطرت النفس آفاق میں غیر متبدل ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے نفوس میں تغیر پیدا نہ کرے۔ خدا نے یہاں اپنے عمل کو اقوام کے اختیاری عمل پر مشروط قرار دیا ہے اور اس طرح ایک اٹل قانون حیات بیان کیا ہے جو ارادوں کو آزاد چھوڑنے کے باوجود تقدیر مبرم کی طرح کام کرتا ہے۔''

مولانا نے اختیار کے ثبوت کے لئے جو دلائل فراہم کئے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل

(۱) ہر شخص کے دل میں اختیار کا یقین ہے اور گو سخن پروری کے موقع پر کوئی شخص اس سے انکار کرے لیکن اس کے تمام اقوال وافعال سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اختیار کا معترف ہے۔ اگر کسی کے سر پر چھت ٹوٹ کر گر پڑے تو اس کو چھت پر مطلق غصہ نہیں آتا لیکن اگر کوئی شخص اس کو پتھر کھینچ مارے تو اس شخص پر اس کو سخت غصہ آئے گا، یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ چھت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں اور آدمی جس نے پتھر کھینچ مارا تھا وہ فاعل مختار ہے۔

گر ز سقف خانہ چوبے بشکند — بر تو افتد سخت مجروحت کند
ہیچ خشمی آیدت بر چوب سقف؟ — ہیچ اندر کین او باشی تو وقف
کہ چرا بر من زد و دستم شکست — یا چرا بر من فتاد و کرد پست
واں کہ قصد عورت تو می کند — صد ہزاراں خشم از تو سر زند
در بیاید سیل درخت تو برد — ہیچ با سیل آورد ، کینی خرد
گر بیاید باد و دستارت ربود — کے ترا با باد ، دل خشمی نمود
خشم در تو شد بیان اختیار — تا نہ گوئی جبر یا نہ اعتذار

ایک بہت لطیف استدلال مولانا نے یہ کیا ہے کہ جانور تک جبر وقدر کے مسئلے سے واقف ہیں۔ کوئی شخص ایک کتے کو اگر دور سے پتھر کھینچ مارے تو کو چوٹ پتھر کے ذریعے سے لگے گی لیکن کتا پتھر سے معترض نہ ہوگا بلکہ اس شخص پر حملہ کرے گا اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ کتا بھی سمجھتا ہے کہ پتھر مجبور تھا اس لئے قابل الزام نہیں جس شخص نے بہ اختیار اذیت دی وہ مواخذے کے قابل ہے۔

ہم چنیں گر بر سگے سنگ زنی — بر تو آرد حملہ گردی منثنی!
گر شتر بان اشتری رامی زند — آں شتر قصد زنندہ می کند
خشم اشتر نیست با آں چوب او — پس ز مختاری شتر بردہ است بو
عقل حیوانی چوں دانست اختیار — ایں مگو اے عقل انسان شرم دار

انسان کے تمام افعال واقوال سے اختیار کا ثبوت ہوتا ہے۔ ہم جو کسی کو کسی بات کا حکم دیتے ہیں، کسی کام سے روکتے ہیں۔ کسی بات پر غصہ ظاہر کرتے ہیں، کسی کام سے روکتے ہیں۔ کسی بات پر غصہ ظاہر کرتے ہیں، کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں، کسی فعل پر نادم ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور اس بات کی دلیل ہیں کہ ہم مخاطب کو اور اپنے آپ کو فاعل مختار خیال کرتے ہیں۔

ایں کہ فردا آں کنم یا ایں کنم — ایں دلیل اختیار ست ای صنم
واں پشیمانی کہ خوردی از بدی — ز اختیار خویش گشتی مہتدی

(۳) جبر کے ثبوت میں سب سے قوی استدلال جو پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا اگر ہمارے افعال کا فاعل نہیں تو مجبور ہے اور اگر قادر ہے تو ایک فعل کے دو فاعل نہیں ہو سکتے۔ مولانا نے اس سوال کا ایسا جواب دیا جو جواب بھی ہے اور بجائے خود ثبوت اختیار پر مستقل استدلال بھی ہے۔ وہ یہ کہ جو چیز جس چیز کے ذاتیات میں ہے وہ اس سے کسی حالت میں منفک نہیں ہو سکتی۔ صناع جب کسی آلہ سے کام لیتا ہے تو صناع کی قوت فاعلہ آلہ کو با اختیار نہیں بنا سکتی جس کی وجہ یہ ہے کہ جمادیت جماد کی ذاتیات میں ہے۔ اس لئے کسی فاعل مختار کا عمل اس کی جمادیت کو سلب نہیں کر سکتا۔

اسی طرح قوت اختیاری بھی انسان کی ذاتیات میں سے ہے۔ اس بنا پر وہ کسی حالت میں سلب نہیں ہو سکتی، ہم سے جب کوئی فعل سرزد ہوتا ہے تو گو خدا ہمارے فعل پر قادر ہے لیکن جس طرح صناع کا اثر آلہ سے جمادیت کو مسلوب نہ کر سکا، اسی طرح خدا کی قدرت اور اختیار بھی ہمارے قوت، اختیار کو جو ہماری ذاتیات میں سے ہے سب نہیں کرتا۔''

قدرت تو بر جمادات از نبرد — کے جمادی را از انہا نفی کرد
قدرتش بر اختیارات آں چناں — نفی نہ کرد و اختیاری راندا‌ں

رومی کا انسان جسم وروح کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ وہ جہد پیہم سے کائنات کو تسخیر کر کے اوامر ونو اہی کے نفاذ کے ذریعے نیابت الٰہی کا حق ادا کرنا چاہتا ہے۔ وہ زیرکی کو عشق کے تابع رکھتا ہے کیوں کہ عشق ہی کے دام میں یہ خدائی گرفتار ہو سکتی ہے اور عشق ہی کے ذریعے اس میں الٰہیہ صفات پیدا ہوتی ہے جس سے وہ اپنا دائرہ تسخیر بڑھاتا ہے وہ اس بات پر بھروسہ رکھتا ہے کہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے اور تقدیر اسی جہد مسلسل کی تابع ہے۔ غرض ہر انسان اپنی تقدیر کا خود ذمہ دار ہے۔ اس لئے عمل بجائے خود عبادت ہے۔ سکون اور سکوت موت کی علامت ہے۔ اس لئے رومی یہاں تک کہنے پر آمادہ ہے کہ ''کوشش بیہودہ بہ از خفتگی''۔ رومی کے انسان کی یہی شاہراہ ہے جس پر اس کا اصلی جانشین ''مرد مومن'' سات سو برس بعد اقبال کے مرد مومن کی حیثیت سے گامزن ہے۔

دوسرے حصے کا پہلا حصہ

آفاقیت

علامہ اقبال کہ تصور مرد مومن میں آفاقیت ایک اہم جزو ہے۔ زیر نظر ایک خط کا ایک حصہ دیا جا رہا ہے جو علامہ اقبال نے 7 اکتوبر 1937ء کو قائداعظمؒ کے نام لکھا اس خط کا مضمون اور قائداعظمؒ نے جو عملی قدم اس کے بعد اٹھایا اس سے ہمیں جہاں بہت کچھ پتا چلتا ہے وہاں یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ اقبال صرف مسلمانوں کا درد ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ مرد مومن کی ہی صفت ''جو کہو اس پر عمل کرو، کی مانند اپنی ہر فکر اور سوچ پر عمل پیرا بھی تھے۔''

آپ نے اکتوبر 1937ء کو قائداعظم کے نام اپنے خط میں تحریر کیا کہ

''مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے مسلم لیگ کے مقاصد کے لئے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ہمارے لئے بہادر موقع ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسلم لیگ اس مسئلہ پر ایک زوردار قرارداد ہی منظور نہیں کرے گی۔ بلکہ لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس میں کوئی ایسا لائحہ عمل بھی تیار کیا جائے گا جس میں مسلمان عوام بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں۔ اس سے (ایک طرف تو) مسلم لیگ کو مقبولیت حاصل ہوگی اور (دوسری طرف) شاید فلسطین کے عربوں کو فائدہ پہنچ جائے۔ ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لئے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام پر پڑتا ہو جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔ مشرق کے عین دروازہ پر ایک مغربی چھاؤنی کا قیام (اسلام اور ہندوستان) دونوں کے لئے پر خطر ہے۔''

قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ 15-18 اکتوبر 1937ء میں اپنے خطبہ صدارت میں مسئلہ فلسطین پر تفصیلی بحث کی۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ ''میں حکومت برطانیہ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر اس نے مسئلہ فلسطین کا جرات دلیری اور انصاف کے ساتھ فیصلہ نہ کیا تو یہ حکومت برطانیہ کی تاریخ میں ایک جدید انقلاب کا دروازہ کھول دے گا۔ میں صرف مسلمانان ہند کی نہیں بلکہ اس معاملہ میں مسلمانان عالم کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ اور تمام انصاف پسند اور فکرمند اصحاب اس بات میں میری تائید کریں گے۔ جب میں یہ کہوں گا کہ اگر برطانیہ نے اپنے ان مواعید عزائم اور اعلانات کو جو زمانہ قبل وبعد جنگ تمام دنیا کے روبرو غیر مشروط طور پر عربوں کے ساتھ کئے تھے پورا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہے۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ عربوں کے اندر نہایت شدید احساس پیدا ہو چکا ہے اور حکومت برطانیہ جھلا کر اور

ہندوستان عربوں کے اس منصفانہ اور جرات آموزانہ جہاد میں ان کی ہر ممکن امداد کریں گے۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے میں ان کو یہ پیغام بھیجنا چاہتا ہوں کہ اس منصفانہ جنگ میں وہ جس عزم اور حوصلے کے ساتھ لڑ رہے ہیں وہ انجام کار کامیاب ہو کر رہیں گے۔" اس اجلاس میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں حکومت برطانیہ کو آگاہ کیا گیا کہ "اگر وہ بیت المقدس میں یہودیوں کی حمایت کی پالیسی سے باز نہ آئے گی تو اسلامی ممالک کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے ہندوستان کے مسلمان بھی برطانیہ کو اسلام کا دشمن تصور کریں گے اور مجبوراً اس کے ردعمل کے لئے مذہب کی ہدایت کے مطابق ان کو کوئی اور پالیسی اختیار کرنا پڑے گی۔" علاوہ ازیں 7 اکتوبر 1938ء کو مسلم لیگ نے قاہرہ فلسطین کانفرنس میں اپنا ایک وفد بھیجا جو عبدالرحمٰن صدیقی (وفات 1953) خلیق الزماں (1889-1973) اور مولوی ظہیر الدین (وفات 1939ء) پر مشتمل تھا۔

درویش خدا مست ، نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی ، نہ صفاہاں نہ سمرقند

مردِ مومن تفصیل

طیب عثمانی ندوی اپنی کتاب "انسانیت کی جستجو" کے مضمون بعنوان انسانِ کامل اقبال کی نگاہ میں صفحہ 91 پر لکھتے ہیں۔

اقبال کی نگاہِ متجسس کو اس عالم رنگ و بو میں جو اپنے اندر گونا گوں دلفریبیاں اور دلچسپیاں رکھتی ہے، صرف درندوں کا بھٹ اور چوپایوں کا جنگل نظر آیا اور اس کی متجسسانہ نگاہیں اس درندوں اور چوپایوں کی دنیا میں کسی "انسان" کی جویا رہیں۔ اپنے اس تلاش و جستجو کی ابتدا اپنی مشہور کتاب "اسرار خودی" میں مولانا جلال الدین رومی کے ان اشعار سے کی ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دو ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہاں سست عناصر دلم گرفت
شیر خداو رستم و ستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشو و جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اندھیری رات ہے اور ایک درویش سن رسیدہ ہاتھ میں مشعل لئے کوچہ و بازار کی خاک چھانتا پھرتا ہے، جیسے اس کی نگاہ کسی گمشدہ کی تلاش میں ہو، میں نے کہا حضرت سلامت کس چیز کی تلاش ہے؟ فرمانے لگے ان درندوں اور چوپایوں کی بستی میں رہتے رہتے طبیعت عاجز آ گئی ہے، اب اس وسیع کائنات میں کسی "انسان" کی تلاش کو نکلا ہوں، ایک ایسا نوجوان جس کی مردانگی اور شخصیت میری روح کو تسکین اور بالیدگی عطا کر سکے۔ میں نے کہا آپ کس دھوکے میں ہیں؟ یہ تو عنقا کی تلاش ہے۔ اس کے پیچھے اپنے آپ کو کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں؟ میں نے اس راہ میں دردر کی خاک چھانی ہے، دشت و صحراء آبادی و ویرانہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں میرے قدم نہ پہنچے ہوں مگر اس کی حقیقت تو کیا پرچھائیں بھی نظر نہ آئی، درویش نے کہا مجھے تو اس شے کی تلاش و جستجو زیادہ محبوب ہے جس کا وجود نادر اور جس کا حصول آسان نہ ہو.....!

سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس "گمشدہ انسان" کو اس وسیع کائنات میں پا لیا یا حیران و سرگرداں بھٹکتے پھرے؟ اقبال کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کی طرف اچھی نشاندہی کرتا ہے بیک نظر اور بلا خوف تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں اقبال نے اس کھوئے ہوئے انسان کو پا لیا اور نہ صرف پایا بلکہ اس کو اچھی طرح پہچانا اور زندگی کے طویل ایام اس کے ساتھ گزارے۔ اقبال کا یہ اکتشاف کولمبس کی نئی دنیا کے اکتشاف سے زیادہ وقیع اور بڑا اکتشاف ہے اور بلا شبہ ایک فتح عظیم ہے۔ اس لئے کہ کھوئے ہوئے انسان کی تلاش و جستجو اور پھر اس میں کامیابی اس عالم کی سب سے بڑی خوش بختی اور سب سے بڑی یافت ہے، خصوصاً اس دور میں جب کہ "انسان" کھو چکا ہو اور انسانیت افسانہ بن چکی ہو۔

مردِ مومن کا تاریخی پس منظر

مردِ مومن کے کردار کی تحلیلِ نفسی اقبال کے عصری رجحانات سے بے نیاز ہو کر نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ ہر انسان پر اس کے متعلقہ عہد کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں مترتب ہوتے ہیں۔ انفرادی طور پر تمام افراد کی ذہنی جسمانی اور روحانی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ اوسط درجے کے انسانوں کی شخصیت نسبتاً اپنے ماحول سے بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ کمتر درجے کے افراد اسی وجہ سے معاشرے کے مجموعی مزاج میں کھو جاتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی شخصیت میں کس بل زیادہ ہوتا ہے، جو عوام کی سطح سے بلند ہوتے ہیں، جن کی ذہنی اور روحانی نشوونما اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے وہ ابتداً ماحول کا اثر قبول تو کرتے ہیں لیکن جب معاشرے کا عطا کردہ جامہ ان کے جسم پر تنگ ہوتا ہے تو وہ اسے تار تار کر کے پھینک بھی دیتے ہیں اور اپنی شان کے شایان لباس زیب تن کرتے ہیں پھر بعد میں ان کے بانکپن سے معاشرہ بھی متاثر ہو کر اور اسی باغی کی تقلید شروع کر دیتا ہے۔ اقبال بھی ایسے ہی عظیم انسانوں میں سے ایک ہیں جو خود بدلتے تو ضرور ہیں لیکن جب پوری طرح بدل جاتے ہیں تو اپنے پیچھے چلنے والے لاکھوں انسان چھوڑ جاتے ہیں۔ آیئے ذرا اس ماحول پر ایک نظر ڈالیں جسے منقلب کرنے کے لئے اقبال کو "مردِ مومن" کی ضرورت محسوس ہوئی۔

"تمام دنیائے اسلام پر جمود و خمود کی کیفیت طاری تھی لازمی نتیجہ تھی اس کورانہ تقلید، تنگ نظری اور جہالت کا جو ملتِ مرحومہ پر صدیوں سے مسلط تھی۔

(۱) مجمع الجزائر مشرقی خصوصاً جاوا کے مسلمانوں میں کسی قسم کی حرکت نہیں تھی۔ نہ سیاسی، نہ ثقافتی، نہ علمی۔ یہ لوگ ڈچ حکومت کے زیر سایہ کان ڈھلکائے غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ چونکہ دستور قدیم کے مطابق حج کر لینے کے بعد شادی میں سہولت حاصل ہو جاتی تھی اس لئے اس جزیرے کے باشندے اس فریضہ کی ادائیگی میں بہت سرگرمی کا اظہار کرتے تھے بلکہ اس کو جہاد فی سبیل اللہ سمجھتے تھے۔

(۲) افغانستان کے باشندے تقلید، تعصب، جہالت اور رسوم پرستی میں تمام مسلمانوں سے چار قدم آگے تھے (اور آج بھی یہ لوگ اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ ان معاملات میں کوئی قوم ان کی حریف نہیں ہے) سیاسی اعتبار سے افغانستان کے مسلمان انگریزوں کے زیر اقتدار تھے۔ کیوں کہ عبدالرحمٰن خاں اور امیر حبیب اللہ خاں دونوں کو دولت برطانیہ کے خزانے سے 26 لاکھ روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ جسے یہ حکمران اپنی رعایا کو خوش کرنے کے لئے "خراج" سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ اگرچہ انگریز اس بات سے آگاہ تھا لیکن عقلمند آدمی آم کھاتا ہے پیڑ نہیں گنتا۔

(۳) اب رہے ترکستان (سمرقند و بخارا) کے مسلمان تو وہ 1873ء سے روس کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے تھے ان پر بھی کامل جمود طاری تھا۔ افغانوں کی طرح علوم و فنون سے نفور اور ترقی سے کوسوں دور تھے۔

(۴) ایران کے مسلمان ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے شکنجہ میں گرفتار تھے یعنی آزاد ہونے کے باوجود غلام تھے اور معاشی بدحالی جو ملوکیت کا لازمی نتیجہ ہے، ان کے سروں پر مسلط تھی.....فوج کے سپاہی بجائے رائفل کے تعویذ سے کام لیا کرتے تھے اور عوام جدوجہد کے بجائے عزاخانوں میں سوز خوانی کو مقصدِ حیات سمجھتے تھے۔

(۵) سلطنت ترکی جس کی فوجیں کبھی قلب یورپ کو اپنی جولانگاہ بناتی تھیں اور ردیانا پر دستک دیا کرتی تھیں اب اپنے دارالحکومت کی حفاظت بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اگر انگریز مانع نہ ہوتے تو روسی فوجیں کبھی کی قسطنطنیہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہو چکی ہوتیں وہی سلطنت ترکی جس کے جنگی جہاز کبھی بحر ہند کا سینہ چیرتے رہتے تھے بیسویں صدی کے آغاز میں اس قدر عاجز اور نادار ہو گئی تھی کہ جب

اس لئے کہ اس کے پاس کوئی جنگی جہاز نہ تھا۔

اب رہے ترکی علماء تو ان کی روشن خیالی کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم کے ترجمہ کو کفر کا ہم پلہ قرار دیا تھا۔ ان علماء کی نظر میں قرآن حکیم اس لئے نازل نہیں ہوا تھا کہ اس کے معنی ومطالب سے آگاہی حاصل کی جائے۔ ملا خواہ افغانی ہو یا ایرانی، ہندی ہو یا ترکی اس کی ذہنیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

(۶) مصر پر انگریزوں کا اقتدار 1882ء میں قائم ہوا تھا اور اس صدی کے آخر میں یہ اقتدار تسلط میں متبدل ہو چکا تھا۔ سوڈان پر باقاعدہ برطانوی قبضہ تھا۔ لارڈ کچنر مہدی سوڈانی کی قبر کھود کر اس مردمجاہد کی ہڈیاں شارع عام پر نذر آتش کر کے برطانوی شرافت اور مغربی تہذیب کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

(۷) الجیریا اور تیونیسیا پر تیسری بڑی طاقت یعنی فرانس نے اپنا تسلط قائم کر لیا تھا اور مراقش آزادی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ ساری دنیا کے مسلمان یا تو مختلف یورپین طاقتوں کے غلام تھے یا غلامی کی طرف مائل تھے۔

ہندوستان کے عوام کی عموماً اور مسلمانوں کی حالت خصوصاً معاشی، ذہنی، روحانی، عملی اور علمی اعتبار سے ناگفتہ بہ تھی۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمان پیش پیش تھے۔ لیکن بغاوت پر قابو پانے کے بعد انگریزوں نے ان سے گن گن کر انتقام لینا شروع کیا اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی زندگی اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ:

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے

زیادہ تر ذی شعور مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر انگریزوں نے قید خانوں میں بند کر دیا یا انہیں تہہ تیغ کر دیا۔ مسلمانوں سے جاگیریں چھین کر برادران وطن کے حوالے کیں اور اس طرح ان کی معیشت کو تباہ کر دیا۔ اعلیٰ ملازمتوں کے لئے مسلمانوں کی وفاداری کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ برادران وطن نے بھی اس موڑ پر یہی نہیں کہ مسلمان کی کوئی دلجوئی نہیں کی، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے عقائد کے خلاف نفرت انگیز لٹریچر شائع کرنا شروع کر دیا اور اپنی قوم کو علیحدہ ابھارنے کے لئے رانا پرتاپ، شیواجی اور بندہ بیراگی کو قومی ہیرو بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ 1927ء تک ہندوستان میں مسلمانوں کی اپنی کوئی اعلیٰ علمی درسگاہ نہ تھی۔ لے دے کر ایک علی گڑھ کالج تھا جس کے طفیل بعض مسلمانوں کو ڈپٹی کلکٹری مل جاتی تھی۔ دیوبند کی درس گاہ تو تھی لیکن علماء کشاکش حیات سے کنارہ کش تھے اور طلباء کو دین کی باتیں پڑھانے کے سوا دوسرے تمام امور کو دنیا داروں کی ذمہ داری تصور کئے بیٹھے تھے۔ امراء انگریز پرستی میں مصروف تھے اور صوفیا مریدوں کی جہالت سے مستفیض ہو رہے تھے۔ رہ گئے شعراء وادبا تو وہ زلف پیچاں میں اسیر تھے، اقبال کی نظر سے یہ حالات اوجھل نہ تھے۔

میدانِ شعر میں حالی اور اکبر الہ آبادی ان کے پیش رو ہیں۔ حالی نے درد وسوز بھری آواز میں ماضی کی عظمت کی یاد دلائی تو اکبر الہ آبادی نے انگریز پرستی یا تقلید فرنگی کا مذاق اڑا لیا۔ لیکن ان دونوں میں سے ایک نے بھی کوئی ایسا نسخہ تجویز نہیں کیا جس سے تھکے ہارے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ سکتی۔ شروع میں اقبال نے بھی مناظر فطرت کی کوئی اور تحریک آزادی سے متعلق حب الوطنی کے جذبات کے حصار میں پیچ وتاب کھایا لیکن جب بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو اس وقت اقبال کی عمر 27-26 سال کی تھی اور وہ ایم اے پاس کر کے پروفیسری کے عہدہ پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کا ملی اور سیاسی شعور بلوغ کو پہنچ چکا تھا۔ اب اپنی قوم کی پستی اور زبوں حالی کے اسباب تک ان کی رسائی ہوئی۔ اس موڑ پر اقبال کے ذہن کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی رقمطراز ہیں:

''میرا خیال ہے کہ 1905ء تک اقبال کے اثر پذیر دل نے اپنی قوم کی زبوں حالی کا ہر پہلو سے مطالعہ کیا۔ اس کے بعد قدرت نے ان کو تین سالوں کے لئے ان قوموں میں بھیج دیا جن کی تقدیریں صبح وشام بدلتی رہتی ہیں۔ جب انگلستان اور جرمنی میں بھی انہوں نے زندہ قوموں کو بچشم خود دیکھا تو یقیناً موازنہ کیا ہوگا کہ مسلمان تو غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یورپ کی قومیں اسلام سے کوسوں دور ہیں لیکن ساری دنیا پر حکمراں ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ اقبال جب انگلستان سے واپس آئے تو اپنی ملت کی زبوں حالی اور یورپ کی خوش حالی کے اسباب ان کے ذہن کو متاثر کرتے رہے۔ اس کے علاوہ میں پروفیسر مذکور کے بیان میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ تجسس اقبال کی فطرت ثانیہ تھی۔ ان کا اپنا گھریلو ماحول مذہبی تھا اور مذہب کے شخصی عرفان کا رجحان ان کے ذہن میں بچپن ہی سے تھا، مزید انہیں اپنے تحقیقی مقالے کے سلسلے میں ایرانی مسلمانوں کے صوفیانہ افکار کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ صوفیوں کے ایجابی اور سلبی رجحانات کا علم حاصل ہوا اور جرمنی میں نطشے کی جوش عمل اور توانائی سے بھرپور تصنیفات صوفی کے ایجابی رجحانات کا جزو لاینفک بن گئیں اسی لئے جو اقبال ہندوستان سے انگلستان گیا تھا وہ واپس نہیں آسکا بلکہ جو اقبال دوبارہ ہندوستان واپس آیا اس کی شخصیت قطعاً منقلب ہو چکی تھی اور اس نے پرانے اقبال کو ایک نئے آدم میں بدل ڈالا تھا۔ جس کے بطون میں بلا کی ہلچل اور غضب کا جوشِ عمل تھا۔ یورپ سے لوٹنے کے بعد کی اقبال کی شاعری اس امر کی شاہد ہے۔ تقریباً 1908ء سے 1913ء تک کی ان کی شاعری سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ انہیں اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ ملتِ بیضا کی زبوں حالی کا سب سے بڑا سبب اس کی بے عملی ہے۔

اور جب ہمارے حساس شاعر کی انگلی قوم کی دکھتی ہوئی رگوں پر پڑی تو پھر ''اسرار خودی'' اور ''رموز بیخودی'' جیسی کتابیں سامنے آگئیں۔'' اسرار خودی کے دیباچے میں اقبال نے قوم کی تشخیص کرتے ہوئے لکھا:

مسئلہ انا کی تحقیق وتدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب وغریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے شری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نکتۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل ودماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم وفضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے۔ اسلامی تخیل کا ایک جزو لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگ گئے۔ ایران کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہوسکتی تھی؟ جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ انہوں نے خبر واور کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے ''رگِ چراغ'' میں ''خون آفتاب'' کا اور ''شرار سنگ'' میں ''جلوہ طور'' کا بلاواسطہ مشاہدہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔ مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انہوں نے دل کو آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین وجمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تقریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا۔

اس محرومی، بے ذوقی، بے عملی، محکومی اور غلامی سے عالم اسلام کو نجات دلانے کے لئے اقبال نے اثبات واستحکام خودی کی تعلیم دی، جہد مسلسل اور سعی پیہم کا سبق پڑھایا۔ حصول قوت اور تسخیر کائنات کی دعوت دی۔ مثنوی ''اسرار خودی'' کی اشاعت کے بعد جیسے سارے ہندوستان کے مسلمانوں پر بجلی سی گر پڑی اقبال پر سخت تنقیدیں ہونا شروع ہوگئیں انہیں سخت سست بھی کہا گیا۔ فلسفہ خودی مغربی فلسفہ قرار دیا گیا۔ لیکن اقبال نے یہ سب کچھ نادانستہ نہیں کیا تھا۔ ان کے ساتھ علم ویقین کی طاقت تھی۔ اس لئے وہ اپنے ارادے میں اٹل رہے اور اسی فکری آویزش کے سلسلے میں 18 اکتوبر 1915ء کو مثنوی کی اشاعت کے چھ ماہ بعد اکبر الہ آبادی کو اپنے مطمع نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

''مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے، یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی لکھنے

پھر خواجہ حسن نظامی کے مشتعل جذبات کو رام کرنے کے لئے ان کے ایک خط کے چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

''عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن تو پیدا ہوتا ہے لیکن ایسا کہ طباع کو پست کرنے والا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرنے والا ہے۔ اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے۔ قومی لٹریچر کبھی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکا۔ قوم کی زندگی کے لئے اس کا اور اس کے لٹریچر کا رجائی ہونا ضروری ہے۔''

یہی اقبال کے ''مردمومن'' کی عقبی زمین ہے۔ یہی وہ عصری رجحان تھا جس کے خلاف ''مرد مومن'' کو اعلان جنگ کرنا پڑا مردمومن، اپنی فطرت کے اعتبار سے رجائی اور جفاکیش ہے۔ عاشقِ رسول ہونے کے ساتھ ساتھ تسخیر فطرت کا قائل ہے۔ خانقاہوں میں آرام فرما ہونے سے زیادہ اسے میدان جنگ کی سرگرمی محبوب ہے۔ وہ متعلقہ عہد کی معاشرت اور عقائد دونوں پر تیشہ زن ہے۔ زندگی کی تمام فرسودہ قدروں کا انہدام اس لئے ضروری سمجھتا ہے کہ حیات نو کی تعمیر کی جا سکے۔ اسے اپنی ذات اور کائنات کا بھرپور احساس ہے۔ وہ بیخود نہیں بلکہ خوددار ہے پہلے اپنے آپ کو پہچانتا ہے۔ تب ساری دنیا سے متعارف ہوتا ہے۔ وہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ جھکتا ہے (لیکن اس کا جھکنا محض اس لئے ہے کہ ساری دنیا اس کے سامنے جھک سکے یا کم از کم وہ دوسرے انسانوں کے سامنے نہ جھک سکے۔ وہ معبود حقیقی کے سامنے بھی اپنا وجود الگ رکھتا ہے۔ اور اپنی ذات کو ذات خداوندی میں مدغم نہیں ہونے دیتا) وہ اپنی آرزوؤں کی آگ میں جلتا ہے اور باطل کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ وہ اپنی آرزوؤں کو مشیت ایزدی کے تابع رکھتا ہے۔ اس لئے فقر و استغنا کی دولت سے مالا مال ہے۔ چونکہ ماسوا کے سامنے کبھی سجدہ ریز نہیں ہوتا، اس لئے خدا کا مقرب ہو جاتا ہے۔ اور خدا ساری خدائی اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتا ہے۔ ''مردمومن'' ایک مرد بے نیاز ہے۔ اس لئے زمین پرست، زن پرست یا زر پرست نہیں ہے۔ اپنی اسی شان قلندری کی وجہ سے وہ غالب و کارکشا اور کار آفریں ہے۔ محکوم اور بے عمل نہیں۔ یہ تاریخی پس منظر اس بات کا گواہ ہے کہ ''مردمومن'' عصری رجحانات سے اقبال کے تناصر اور ملتِ بیضا سے بے پناہ ہمدردی کا زندہ پیکر ہے۔

مردمومن کی خصوصیات

اقبال کا مردمومن ''یقین محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم کے خمیر سے بنا ہے اس میں ہر لحظہ نئی شان اور نئی آن کی نمود ہوتی ہے۔ گفتار اور کردار میں وہ اللہ کی برہان ہے۔ لہٰذا ''تمہاری وغفاری وقدوسی وجبروت'' کے چاروں عناصر اس کے مزاج میں ایک حسین تناسب کے ساتھ جاگزیں ہیں۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
تمہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مردمومن ان عناصر کا اکتساب کیسے کرتا ہے انہیں کیسے پروان چڑھاتا ہے۔ پھر کن اصولوں کے تحت ان عناصر کو اپنی ذات کا جزو لاینفک بنا لیتا ہے؟ وہ کون سے سوتے ہیں جن سے مردمومن کی شخصیت سیراب ہوتی ہے۔ وہ حیات کی بلندیوں کو کیسے چھو لیتا ہے؟ مردمومن سب سے پہلے جذبۂ خودی کو صیقل کرتا ہے۔ وہ ہر آن سرگرم کار رہتا ہے۔ عمل اس کی حیات کا ناگزیر جزو ہے بلکہ عین حیات ہے وہ جذبۂ عمل کو جذبۂ عشق سے تقویت دیتا ہے۔ اور فقر سے اس میں استغنا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مادی ضرورتیں بے حد قلیل ہوتی ہیں۔ اس کی نظر میں بلا کی تیزی ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسا مرد فقیر ہے جسے مادی چمک دمک مرعوب نہیں کر سکتی۔ اس لئے اس کی فقیری اپنے قدموں پر بادشاہت کو جھکاتی ہے۔ مومن کی ان تمام صفات کا فرداً فرداً مطالعہ کرنے پر اس کا کردار نمایاں ہو کر سامنے آ سکے گا۔

اقبال کے تصور خودی کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اقبال کے نقطۂ نظر سے ہر صاحب خودی، ان کا نصب العینی انسان نہیں ہے۔ اقبال نے نپولین، مسولینی اور ہٹلر بلکہ ''ابلیس'' کو بھی صاحبانِ خودی میں شمار کیا ہے۔ اسی حیثیت میں وہ نپولین اور مسولینی جیسی شخصیتوں سے متاثر ہوتے ہیں اور انہیں شعر کا موضوع بھی بنایا ہے۔ لیکن خودی اقبال کی نصب العینی سیرت کا صرف ایک رخ ہے۔ اقبال کے انسان کی شخصیت کا احاطہ ان کے تین مابعد الطبیعاتی تصورات کے ذریعے ممکن ہے۔ ایک ان کا تصور خودی ہے، دوسرا تصور عشق ہے اور تیسرا فقر جسے انہوں نے روح اسلام سے بھی موسوم کیا ہے۔''

''اقبال جو خودی کا مفسر ہے۔ جب خودی کے تصور کے متوازی دھیمے سروں میں ''بیخودی'' کا راگ بھی چھیڑ دیتا ہے تو بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر وہ فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کے لامحدود امکانات پر بندشیں عائد کر رہا ہے لیکن اقبال کے تصور بیخودی کے مضمرات سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ انسان اسلام کے دو بنیادی اصولوں توحید اور ریاست ''لا الہ الا اللہ'' اور محمد الرسول اللہؐ۔ کی بصیرت کے تابع ہو کر دنیائے عمل میں قدم رکھے۔ بالفاظِ دگر عظمت وکمال کے نصب العین ''خدا'' کے سوا دوسری کسی قوت اور نصب العین کو تسلیم کرنے سے انکار کرے اور خاتم النبیین کے پیام۔ اسلام کو حقیقت اخریٰ تسلیم کرے۔

اقبال سے قبل لفظ خودی کا استعمال تکبر یا غرور کے معنوں میں ہوتا تھا اس لئے اقبال نے ''اسرار خودی'' کے دیباچے میں اس اصطلاح کی تشریح ان لفظوں میں کی ہے۔

''لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے۔ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض ''احساس نفس'' یا ''تعیین ذات'' ہے۔ مرکب لفظ ''بیخودی'' میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔ دیباچے کی ابتداء ان جملوں سے ہوتی ہے:

یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ، جس سے تمام انسانی تخیلات وجذبات وتمیلات مستنیرہ ہوتے ہیں۔ یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے یہ ''خودی'' یا ''انا'' یا ''میں'' جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی کیا چیز ہے۔ کیا یہ لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے اخلاقی اعتبار سے افراد اور اقوام کا طرز عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے۔

مذکورہ بالا اجمال کی تفصیل اب کلام اقبال کی روشنی میں ملاحظہ ہو:۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

''اسرار خودی'' اور بعد کی تمام تحریریں دیباچے میں پیش کردہ اقبال کے تمام سوالوں کا جواب فراہم کرتی ہیں۔ خودی اپنے اثبات، تکمیل اور استحکام کے لئے غیر خود سے ٹکراتی ہے اور اسی تصادم اور کشمکش میں فرد کی باطنی قوتیں نمو پاتی ہیں اور افراد کا درجہ مدارج حیات میں متعین ہوتا ہے۔

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد   آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او   غیر او پیداست از اثبات او
سازو از خود پیکر اغیار را   تا فزاید لذت پیکار را
چوں حیات عالم از زور خودی است   پس بقدر استواری زندگی است
چوں زمیں بر ہستی خود محکم است   ماہ پابند طواف پیہم است
ہستی مہر از زمیں محکم تر است   پس زمیں مسحور چشم خاور است

انسان اس سلسلے ارتقاء کی آخری کڑی ہے اس لئے وہ افضل ترین ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات   خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے   نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی   ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر   ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے   فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

انسان کی بڑی محض اس میں پوشیدہ ہے کہ اسے اپنا اور اپنے مقاصد کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے اور یہی شعور اسے دوسری مخلوق سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ تھوڑے سے غور وخوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کا وجود فرضی نہیں بلکہ واقعی ہے اس کے برعکس کائنات کا وجود انسانی ادراک اور مشاہدے کا پابند ہے۔

ایں جہاں چیست؟ صنم خانہ پندار من است
جلوۂ او گروِ دیدۂ من است
ہمہ آفاق کہ گیرم بہ نگاہے اورا
حلقۂ ہست کہ از گردش پرکار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من
چہ زماں و چہ مکاں شوخی افکار من است

اگر انسان کو اپنے وجود پر شک گزرے تو شک کا گزرنا ہی اس کے وجود کی دلیل ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ انسان، اتنی کھلی حقیقت، ساری کائنات اور اپنے آپ سے بھی انکار کر بیٹھتا ہے۔

اگر گوئی کہ "من" وہم وگمان است   نمودش چوں نمود این وآں است

انسان جس قدر اپنے گرد وپیش کی دنیا سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے متخاصم ہوتا ہے اس کے سینے میں خودی کی آگ تیز سے تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ماحول سے رگڑ کھانے کے بعد اس کے وجود سے شرارے پھوٹتے ہیں اور وہ مزید مستحکم اور مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔

زندگانی را بقا اندر مدعا ست   کاروانش راؤ درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است   اصل او در آرزو پوشیدہ است
از تمنا رقص اندر سینہ ہا   سینہ ہا از تاب او آئینہ ہا
ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم   از شعاع آرزو تابندہ ایم

مردِ مومن کے "سوز وساز آرزو" اور درد وداغ جستجو کا یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے اور ان مرحلوں کی تکمیل میں وہ قیود زمان ومکان سے آزاد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا چلنا اور چلتے رہنا ہی اس کا شعار ہوتا ہے۔

خودی کی ہے یہ منزل اولیں   مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں   جہاں تجھ سے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر   طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود   کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا   تری شوخی فکر و کردار کا

لیکن کوہ گراں توڑنے کے لئے کسی ایسے مرد کامل کی صحبت درکار ہوتی ہے جس سے تکمیل خودی کی تربیت حاصل ہو سکے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است   زیر خاکِ ما شرارے زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر   زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے   بوسہ زن بر آستانِ کاملے

عارف خودی کو جو زندگی میسر آتی ہے وہ موت کی سرحدوں سے ماوراء ہے کیوں کہ خودی کے ذریعے مردِ مومن اپنی ذات اس قدر مستحکم کر لیتا ہے کہ موت اس کے لئے حیاتِ نو کا پس منظر بن کر باعث مسرت ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک موت "تجدید مذاقِ زندگی" سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مومن موت کے وقت جسم کا لبادہ اتار دیتا ہے لیکن جسم چھن جانے سے وہ نابود ہونے کی بجائے روحانی دنیا میں ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا جاوداں ہو جاتا ہے اور موت اس کی تکمیل حیات کا ایک اور مرحلہ بن جاتی ہے۔

ہو اگر خودنگر خودگر خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

خودی دست سوال پھیلانے سے ضعیف ہو جاتی ہے۔ اسی لئے صاحب خودی خود کو دولت عشق سے مالا مال کر کے استغنا اور بے نیازی کو اپنی فطرت ثانیہ بنا لیتا ہے حد تو یہ ہے کہ اس موڑ پر وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

صاحب خودی کے لئے غیر خدا کے سامنے جھکنا حرام ہے۔ اس سے ضعف پیدا ہوتا ہے:۔

"جس طرح خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے اسی طرح سوال سے ضعیف ہوتی ہے۔ ہر وہ چیز جو ذاتی کوشش کے بغیر حاصل ہو تحت مقولہ سوال ہے ایک دولت مند آدمی کا بیٹا جو اپنے والدین کی دولت ورثہ میں حاصل کرتا ہے دراصل سائل (بھکاری) ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی سائل (گداگر) ہے جو دوسروں کے افکار وخیالات کی تقلید کرتا ہے یا ان کو اپنے افکار وخیالات بناتا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ صاحب خودی دوسروں کی عطا کردہ کسی چیز کو پسند نہیں کرتا حتیٰ کہ خدا کی بنائی ہوئی یہ دنیا بھی جوں کا توں قبول کرنے میں اسے عار ہے وہ یہاں کی ہر چیز اپنے عملی تصرف کے بعد ہی لینا پسند کرتا ہے۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اپنے خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

مومن کی صفات بیان کرتے ہوئے طیب عثمانی ندوی لکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا نظریہ زندگی ایک مردِ مومن کے لئے کسی طرح صحیح نہیں، وہ کہتا ہے۔

حدیث کم نظراں ہے "تو بازمانہ بساز"
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

کے فاسد قدروں سے نبرد آزمائی کرنا ہے، اس کا کام حیات انسانی کی بڑی ہوئی قدروں کی اصلاح ہے اور اس سلسلہ میں اسے تخریب سے بھی کام لینا پڑے تو صحیح ہے اور یہ بد بنائے تعمیر و اصلاح ہوگا، چنانچہ کہتا ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اقبال کے نزدیک حالات و مصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دینا اور قضا و قدر کا عذر پیش کرنا ایک مرد مومن کا کام نہیں، اس قسم کا عذر تو وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو ضعیف الایمان اور کمزور عزم و ارادہ کے ہیں۔ مرد مومن خود تقدیر الٰہی ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں — مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کے اس قول پر تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں اور بلاشبہ مومن صادق کی مٹھی بھر جماعت نے دشت و دریا، کوہ اور سمندر ہر جگہ اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں اور قدموں سے روند ڈالا اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ اسلامی شہسواروں کے واقعات آج بھی تاریخ کے صفحوں پر ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سعد ابن ابی وقاص، خالد ابن ولید، مثنیٰ ابن حارثہ، عقبہ ابن عامر، محمد ابن قاسم، موسیٰ ابن نصیر اور طارق ابن زیاد کے زندہ جاوید کارنامے تاریخ عالم کے مطلع پر ہمیشہ روشن رہیں گے اور یہ اقبال کے قول کی سچی اور عملی تصویریں ہیں۔

مردِ مومن کا شعور

اقبال کا مرد مومن اپنی ذہنی نشوونما کے کسی بھی مرحلے میں حیات و کائنات کا دامن اپنے ہاتھوں سے نہیں چھوڑتا، اسے ہر لحہ اپنی ذات کے احساس کے ساتھ ذات حق کا تصور دامن گیر رہتا ہے۔ وہ خود کو حیات و کائنات کا امین سمجھتے ہوئے اپنے ترفع کی کوششوں میں مصروف ہے اس کی غرض و غایت محض شکم پروری نہیں بلکہ تکمیل ذات کے بعد خلق خدا کی رہبری ہے۔ وہ انسانی معاشرے کو تمام انسانوں کے لئے فرحت بیز بنانا چاہتا ہے اور ان تمام امور میں وہ قرآن کریم اور رسول پاکؐ کے اسوۂ حسنہ کا پیرو ہے۔ ''رموز بیخودی'' کے آخر میں عرض حال مصنف بحضور ''رحمت اللعالمین'' کے تحت اقبال اس حقیت کا صرف اعلانیہ ہی اعتراف نہیں کرتے بلکہ حلقیہ انداز میں کہتے ہیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است — ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن — ایں خیاباں راز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اقبال کا رسول پاک سے یہ عرض کرنا کہ یا رسول اللہ میرے خیالات تک انسان راکھ کا ایک ڈھیر ہوتا ہے۔ اس تخلیقی شعور (Creative Sense) کے حصول میں اسے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جب وہ فطرت کے رموز و علائم کو پالیتا ہے اور اثبات ذات کے بعد احکام خداوندی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے لگتا ہے تو موت بھی اس کی زندگی کا ایک مرحلہ بن جاتی ہے۔ کیوں کہ تخلیقی ارتقا (Creative Evolution) کے نظریے کے تحت شخصی بقا جہد پیہم اور احکام خداوندی کی پابندی پر ہی منحصر ہے۔ بقول اقبال:۔

''شخصی بقا ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ شخصی جدوجہد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ انسان کی حیثیت اس ضمن میں صرف ایک امیدوار کی ہے..... ''انا'' کو اس وقت تک جدوجہد جاری رکھنی چاہئے جب تک اپنے آپ کو وہ مجتمع نہ کر لے اور اپنے لئے بقا کو فتح نہ کر لے۔''

مولانا روم اور اقبال کی ہم آہنگی

مولانا رومؒ اور اقبال ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں، دونوں تخلیق ارتقاء کے قائل ہیں اور دونوں کا یہ خیال ہے کہ انسان اپنے عمل کے بل بوتے پر ہی نیابت الٰہی کی ذمہ داریوں کا اہل ہو سکتا ہے۔

''اقبال و رومی کی طبیعتوں میں ہم رنگی پائی جاتی ہے۔ خدا کی محبت خدا تک رسائی، خدا کی عبادت یہ تمام مضامین مذہب اور فلسفہ مذہب کے عام اور قدیم مضامین ہیں۔ لیکن انسانوں کو یہ تعلیم دینا کہ پیغمبروں اور فرشتوں، خود خدا کا شکار کرو، ایک انوکھا نقطہ نظر ہے۔ رومی بٹھنے اور اقبال تینوں کی جرأت اس بات میں حیرت انگیز ہے..... اس مضمون کو کہ انسان کی زندگی کا ایک مقصد ہونا چاہئے کہ انسان خدا کو تلاش کرے، اقبال نے الٹ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان پہلے اپنی تلاش کرے اس لئے کہ یہ راستہ زیادہ صحیح ہے۔ کیوں کہ ''خدا ہم در تلاش آدمی ہست۔'' اکثر مذاہب کی یہ تعلیم تھی کہ انسان تقدیر کی نوشت کی کڑیوں سے پابہ زنجیر ہے، لیکن رومی اور اقبال دونوں نے تقدیر کے مفہوم کی نئی تعبیر کی ہے۔ مومن خود تقدیر الٰہی ہے جب وہ خود بدل جاتا ہے تو اس کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ مولانا روم نے قد جف القلم کی ایک بلیغ تفسیر کی ہے۔ تقدیر کا قلم خشک ہو چکا ہے، جو مقدر تھا مقرر ہو چکا ہے اور اس میں کوئی کانٹ چھانٹ یا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے عام طور پر یہ مراد لی جاتی ہے کہ ہر شخص کے اعمال پہلے ہی سے مقرر ہیں جو خیر و شر انسان سے سرزد ہوتا ہے وہ خدا ہی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے انسان کے اعمال سزا و جزا کے مستوجب ہیں۔ اس انداز فکر سے نہ صرف منطقی تناقص پیدا ہوتا ہے بلکہ اخلاقی ذمہ داری ایک مہمل چیز ہے۔

مولانا روم اور تقدیر

مولانا روم فرماتے ہیں کہ جس کو تقدیر کہتے ہیں وہ حقیقت میں قوانین حیات کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ قانون قانون ہی نہیں ہو سکتا جب تک وہ تبدیلی اور تلون سے مبرا نہ ہو۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ تقدیر کا اٹل ہونا صحیح ہے۔ سنت اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن سنت اللہ یہ ہے کہ اگر تم چوری کرو گے تو تم پر اور جماعت پر فلاں نتائج مرتب ہوں گے۔ سچ بولو گے تو فلاں فلاں قسم کی صلاح و فلاح اس کا نتیجہ ہوگی۔ خدا نہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر اس سے چوری کراتا ہے اور نہ کسی کی زبان کو ہلوا کر اس سے سچ یا جھوٹ بلواتا ہے۔ عمل اختیار سے سرزد ہوتا ہے۔ لیکن اس کے نتائج تقدیری یعنی آئینی ہیں جو انفس و آفاق میں غیر متبدل ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ قوم خود اپنے نفسوں کو نہ بدل لے۔

اقبال ایک نئے آدم کی تعمیر ممکن سمجھتا ہے جو اپنے لئے نیا جہان اور نئی تقدیر پیدا کرے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تو بدل جائے تو یہ عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بھی بدل جائے۔ اقبال کے نزدیک زندگی کے لامتناہی ارتقاء کا کوئی پہلے سے بنا بنایا نقشہ کسی لوح پر محفوظ نہیں ہے۔ زندگی جیسے جیسے تخلیقی حیثیت سے آگے بڑھتی ہے وہ اپنی تقدیر خود ڈھالتی جاتی ہے۔''

تو می گوئی کہ آدم خاک زاد است — اسیر عالم کون و فساد است
ولے فطرت ز اعجازے کہ دارد — بنائے سجر پُر جوئے نہاد است

''مرد مومن'' کی ذہنی نشوونما میں یہی متذکرہ بالا عقیدہ کارفرما ہوتا ہے جسے مدنظر رکھتے ہوئے وہ جہاد زندگانی میں یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کی شمشیر سے باطل کو کاٹتا ہوا آگے نکلتا

تڑپ ہوتی ہے اور وہ شدید اولوالعزمی کے ساتھ حصولِ مقصد میں لگ جاتا ہے اور اپنی تقدیر کی تعمیر میں مصروف ہو جاتا ہے اور اپنی خودی کی نشو ونما کے مراحل سے گزرتا ہوا ساری کائنات پر چھا جاتا ہے۔ جب اپنی انا کا اسے بھرپور شعور حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے تمام اعمال کو احکام الٰہی کے تابع کر دیتا ہے۔ اور اس کا کردار قلندرانہ شان، شاہانہ انداز نظر، فقیرانہ استغنا اور عاشقانہ جذب و مستی سے سرشار ہو کر اپنے اندر خدائی صفات جذب کر لیتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی ذات بقول اقبال (Good of all) کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ Good of all سے یہاں مراد یہ ہے کہ مردِ مومن کمال کی منزل پر پہنچنے کے بعد روئے زمین پر حکومتِ الٰہیہ کا قیام کرتا ہے اور تمام نوعِ انسانی کو احکام الٰہی کا پابند بنا کر انہیں مسرت بکنار کرتا ہے، ظالم اور جابر، فاسق اور فاجر یا تو اس کی شخصیت کے قاہرانہ پہلو سے مرعوب ہو کر اس کی تقلید کرنے لگتے ہیں، یا بحالتِ دگر وہ ان کے وجود کو سیل تندرو بن کر بہا دیتا ہے۔ کمزوروں اور ناتوانوں کے لئے اس کی دلبری حرز جان ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح تمام نوع انسانی امن وچین کی زندگی بسر کرتی ہے۔

خودی کی تربیت کے مراحل

اطاعت

خودی کی تہذیب وتادیب کا پہلا درجہ اطاعت ہے، دوسرا ضبطِ نفس اور تیسرا نیابتِ الٰہی کا مقام ہے۔ اطاعت سے مراد اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ اس مرحلے میں اللہ اور اس کے رسول کی فرداً فرداً اطاعت کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ خدا اپنے احکام خود رسول پر وحی کے ذریعے نازل فرماتا ہے اور رسول اس پر خود عمل کرنے کے ساتھ ساتھ تمام نوعِ بشر کو دعوتِ عمل دیتا ہے لہٰذا اتباعِ رسول ہی مشیت ایزدی کی پیروی ہے اور خدا چونکہ عمل کی گرفت سے باہر ہے اس لئے اسوۂ حسنہ ہی مردِ مومن کے لئے لائق تقلید ہے۔ ''ومن یطیع الرسول فقد اطاع اللہ (۴۔۷۹) (اور جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے بلاشبہ اللہ ہی کی اطاعت کی) لہٰذا اطاعت رسول میں چون وچرا کی قطعی گنجائش نہیں ہے اسی لئے اقبال کہتے ہیں۔

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

عشق رسول کا یہ سبق بھی ''مردِ مومن'' نے قرآن ہی سے پڑھا ہے۔

ارشاد باری ہے:۔

والذین آمنوا اشد حباللہ	اور جو لوگ مومن ہیں ان کی شناخت یہ ہے کہ وہ محبت الٰہی میں اشد ہوتے ہیں، یعنی ان کے دل میں

اللہ سے محبت ہو نہیں سکتی کیوں کہ وہ وراء الحواس ہے اور وراء العقل بھی ہے اس لئے خود تمہیں تعلیم دی گئی ہے کہ:

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ''اگر تم اللہ سے محبت کے آرزومند ہو تو میری اتباع کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔'' چونکہ اتباع کے لئے محبت لازمی ہے اس لئے اتباع رسول وہی شخص کرسکتا ہے جو رسول سے محبت کرتا ہو۔ بالفاظ دیگر عشق رسول اتباع یا اطاعت کے لئے شرط اولین ہے۔

ضبطِ نفس

خودی کا دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس کا ہے۔ ضبطِ نفس کا مطلب ہے نفسِ امارہ کو اس کی طبعی خواہشات اور اس کے ذاتی میلانات کو راہ راست پر لانا۔ مردِ مومن اس مرحلے میں شہوت اور غضب کی آلودگیوں اور بے راہ رویوں سے خود کو پاک کرتا ہے۔ اور نفسانی محبت اور جذبات پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔

نفس تو مثل شتر خود پرور است | خود پرست و خودسوار و خودسر است
مرد شو، آور زمام او بکف | تا شوی گوہر اگر باشی خذف
طرح تعمیر تو از گل ریختند | با محبت خوف را آمیختند
خوف دنیا خوف عقبیٰ، خوف جاں | خوف آلام زمین و آسماں
حُب مال و دولت و حب وطن | حُب خویش و اقربا و حب زن
تا عصائے لا الٰہ داری بدست | ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد | فارغ از بند زن و اولاد شد

نیابتِ الٰہی

مندرجہ بالا دونوں مراحل طے کر لینے کے بعد مردِ مومن نیابت الٰہی کا مستحق ہو جاتا ہے اور بلندترین خودی کا حصول ہی اس کا نصب العین ہے اور اسی مردِ مومن کے انتظار میں کائنات ہر لحظہ کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است
ہستی او ظل اسم اعظم است

اسی طرح ڈاکٹر سعید نور الدین ''اسلامی تصوف اور اقبال'' میں انہی صفات کو مزید تفصیل سے لکھتے وہ کہتے ہیں کہ:۔

انسان کامل تک اقبال کی روحانی ارتقا کا طریقہ کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کو اپنی کتاب ''اسرار خودی'' میں منظم طریقے سے پیش کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک خودی کی تربیت کے تین مراحل ہیں:(۱)

مرحلۂ اول...... اطاعت......

مرحلۂ دوم...... ضبطِ نفس......

مرحلۂ سوم...... نیابت الٰہی......

مرحلۂ اول...... اطاعت

قرآن مجید میں آیا ہے: یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم (۲) (اے ایمان والو! اطاعت کرو تم اللہ کی، اور اطاعت کرو تم رسولؐ کی، اور تم میں سے جو صاحب امر ہے)۔

دوسری جگہ آیا ہے: تلک حدود اللہ۔ ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتھا الانہار خالدین فیہا وذلک الفوز العظیم (۱) (یہ اللہ کی حدود ہیں، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ اس کو ایک ایسی بہشت میں داخل کرے گا، جس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔ اس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے)۔

مندرجہ بالا آیتوں میں اطاعت سے مقصود اللہ اس کے رسول صلعم الٰہی کی اطاعت ہے۔ تربیت خودی میں اطاعت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اطاعت نہ ہو تو انسان کسی حالت میں بھی ترقی نہیں کرسکتا۔ علامہ اقبالؒ نے اطاعت کو تربیت خودی کا اولین مرحلہ قرار دیا ہے۔

شکوہ سنج سختی آئین مشو

مرحلہ دوم......ضبط نفس (۲)

اس مرحلہ میں وہ اسلام کے ارکان خمسہ کی پابندی کو لازمی قرار دے کر ان کے مقاصد اور فوائد بیان کرتے ہیں۔ اسلام کے ارکان خمسہ یہ ہیں:

۱۔کلمہ توحید......

۲۔نماز......

۳۔روزہ......

۴۔حج......

۵۔زکوۃ......

ضبط نفس کا پہلا رکن کلمہ توحید ہے۔ جب تک انسان اس پر ایمان نہ لائے۔ اس کا نفس غیر اللہ کے وساوس سے آزاد نہیں ہو سکا۔ غیر اللہ کے قوای غالبہ کے خوف وبیم سے اس کا نفس ہمیشہ ترسان ولرزان رہتا ہے۔ لیکن جو شخص کلمہ توحید پر ایمان لے آئے، اس کا نفس ہر قسم کے وسوسوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اس وقت وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا خالق و مالک سمجھتا ہے اور اسی کا خوف رکھتا ہے۔

چنانچہ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

تا عصای لا الہ داری بدست   ہر طلسم خوف را خواہی شکست

خوف را در سینۂ او راہ نیست   خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

انسان کو فطری طور پر اپنے اعزہ سے محبت ہوتی ہے، اوران کی محبت بعض اوقات ایسی شدید صورت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ فرائض دینی کی انجام دہی سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن کلمہ توحید پر جو شخص ایمان رکھتا ہے، وہ بند زن وفرزند سے فارغ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد   فارغ از بند زن و اولاد شد

می کند از ماسوے قطع نظر   می نہد ساطور بر حلق پسر

ضبط نفس کا دوسرا رکن نماز ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: ان الصلواۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر۔ (۲) (بے شک نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے)۔

اس آیت کی رو سے نماز ضبط نفس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کہ نفس ہمیشہ برے کاموں کا حکم دیا کرتا ہے (۳) اور نماز اس سے باز رکھتی ہے نماز کی اس فضیلت کی بنا پر اس کو "حج اصغر" کہا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

لا الہ باشد صدف، گوہر نماز   قلب مسلم را حج اصغر نماز

در کف مسلم مثال خنجر است   قاتل فحشا و بغی منکر است

ضبط نفس کا تیسرا رکن روزہ ہے۔ روزہ سے نفس کو فطری طور پر ضعف پہنچتا ہے، اور منہیات اور ناجائز خواہشات سے بچنے کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

روزہ بر جوع و عطش شبخون زند   خیبر تن پروری را بشکند

ضبط نفس کا چوتھا رکن حج ہے۔ وطن پرستی نفس کی خاص خواہشات میں سے ہے۔ اس کے ترک کا واحد طریقہ حج ہے۔ یہ مسلمانوں کو ہجرت سکھاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا فریضہ ہے، جس کی بدولت سال میں ایک خاص مرکز پر مسلمانوں کو یکجا جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

مومنان را فطرت   ہجرت آموز و وطن سوز

فروز است حج   است حج

طاعتی سرمایۂ جمعیتی   ربط اوراق کتاب ملتی

ضبط نفس کا پانچواں رکن زکوۃ ہے۔ حب مال وحب دولت نفسانی خواہشات کا تقاضا ہے۔ اس سلسلہ میں ضبط نفس کا واحد طریقہ زکوۃ ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں آیا ہے: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔ (تم ہرگز نیکی کے مستحق نہیں ہو سکتے، جب تک کہ تم اس چیز کو خرچ نہ کرو، جس کو تم محبوب رکھتے ہو)۔ اس کے علاوہ زکوۃ سے اخوت ومساوات کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے، اور مال میں برکت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

حب دولت را فنا سازد زکوۃ   ہم مساوات آشنا سازد زکوۃ

دل ز حتی تنفقوا محکم کند   زر فزاید، الفت زر کم کند

الغرض یہ ہیں اسلام کے ارکان خمسہ، جن پر انسان کاربند ہو کر ضبط نفس یعنی حصول کمال کا دوسرا مرحلہ طے کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

ایں ہمہ اسباب استحکام تست   پختۂ، محکم اگر اسلام تست

مرحلہ سوم......نیابت الٰہی

اس مرحلہ پر پہنچنے کے بعد انسان "خلیفۃ اللہ فی الارض" ہونے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" (بے شک میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں) کی صداقت کو صحیح معنی میں احساس کر سکتا ہے۔ جو شخص "نیابت الٰہی" اور "خلیفۃ اللہ فی الارض" ہونے کا مستحق ٹھہرتا ہے، وہی انسان کامل ہے۔

انسان کامل کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ انسان کے روحانی ارتقا کا خلاصہ ہے۔ حیات یا خودی مدتوں تک مسلسل روتی رہتی ہے، تو کہیں جا کر ایک انسان کامل پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات

تا ز بزم عشق یک دانائی راز آید بروں

اس "دانائے راز" کا ظہور "حقیقت محمدیہؐ" کی صورت میں ہو چکا ہے۔ آپؐ ہی "دانائے راز" اور "انسان کامل" ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

شعلہ ہائی او صد ابراہیم سوخت

تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت

لیکن آپؐ خاتم الانبیاء ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اس لئے علامہ اقبالؒ بھی دوسرے صوفیا کی طرح رسول اکرم صلعم کے بعد ایک دوسرے انسان کامل کے قائل ہیں۔

وہ کہتے ہیں۔

"انسان کامل کے بغیر دنیا میں امن وامان قائم نہیں ہو سکتا۔ لیگیں، پنچائتیں اس مقصد کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ آئے دن اس قسم کی لیگیں اور پنچائتیں بر اہ نا کام ثابت ہو رہی ہیں۔"

انسان کامل کی پیدائش سے قبل انسانیت کے لئے جسمانی اور روحانی حیثیتوں سے مدارج ارتقا کا طے کرنا شرط ہے۔ وہ ابھی ہمارے لئے ایک نصب العین ہے۔ اس زمانے میں خارج میں اس کا کہیں وجود نہیں۔

البتہ انسانیت کے تدریجی ارتقا سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ مستقبل میں ایک ایسی قوم پیدا ہوگی، جس کے افراد کم وبیش ایسے یکتا ہوں گے کہ وہ انسان کامل ان ہی میں پیدا ہوگا۔ چنانچہ وہ اس کے ظہور

ای سوار اشہب دوران! بیا　　ای فروغ دیدۂ امکان! بیا
رونق ہنگامہ ایجاد شو　　در سواد دیدہ ہا آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن　　نغمۂ خود را بہشت گوش کن
باز در عالم بیار ایام صلح
جنگجویان را بدہ پیغام صلح

قرآن مجید میں آیا ہے: لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ (بے شک تمہارے لئے رسول اللہ صلعم میں بہترین نمونہ موجود ہے)۔ انسان آنحضرت صلعم کی ذات بابرکت کو نمونہ قرار دے کر انسان کامل بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے عقیدہ کے مطابق انسان کے اندر نائب الٰہی بننے کی صلاحیت بدستور موجود ہے۔ اس کی بین دلیل خدا کا قول: انی جاعل فی الارض خلیفۃ (بے شک میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں) ہے۔

انسان کامل دنیا میں خدا کا حقیقی نائب اور انسانیت کا حقیقی حکمران ہوگا۔ وہ اپنی فطرت کے خزانہ سے دوسروں کو ''دولت حیات'' بخشے گا۔ انسان ارتقا کے مدارج جس قدر طے کرتا جائے گا، اسی قدر اس سے قریب تر ہوتا جائے گا۔ انسان جس قدر اس کی طرف بڑھتا جائے گا، اسی قدر وہ کمال کے درجہ تک پہنچتا جائے گا

انسان کامل ''کامل ترین خودی'' ہے۔ انسانیت کے ارتقائی مدارج میں جس قدر بھی مشکلیں اور صعوبتیں پیش آئیں، وہ صرف اسی نصب العین کے حصول کی خاطر گوارا ہو سکتی ہیں۔

انسان کامل دراصل موجودہ انسان کی جسمانی اور روحانی معراج کمال ہوگا۔ اس میں زندگی کی متضاد قوتیں ہم آہنگ ہو جائیں گی، اور اس کے اندر قوت اور علم اپنے انتہائی مدارج کے ساتھ موجود ہوگا۔

وہ انسان کامل تمام کائنات پر حاوی ہوگا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ کا ایک واقعہ نہایت دلپذیر پیرایہ میں بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کامل کائنات میں گم نہیں ہو سکتا، بلکہ خود کائنات کے اندر گم ہو جاتی ہے۔

آنحضرت صلعم کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہؓ ایک آپؐ کے ایام طفولیت میں آپ کو لے کر بیابان کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ یکایک آپ گم ہو گئے۔ وہ آپ کو نہ پا کر بہت پریشان ہوئیں، اور آپؐ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑیں، لیکن غیب سے یہ تسلی بخش ندا آئی:

غم مخور یاوہ نگردد او ز تو
بلکہ عالم یاوہ گردد اندرو

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

''میں (انسان کامل کے متعلق) اس سے بڑھ کر کہتا ہوں''

در رضایش مرضی حق گم شود
''این سخن کی باور مردم شود

انسان کامل کے اندر وہ قوت موجود ہے، جس کی رو سے وہ نہ صرف کائنات کو اپنے اندر جذب کرتا ہے، بلکہ خود خدا کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں:

مسلم استی، دل باقلیمی مبند　　گم مشو اندر جہان چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم　　در دل او یاوہ گردد شام و روم
دل بدست آور کہ در پنہائی دل　　می شود گم این سرائی آب و گل

انسان کامل کی ہمہ گیر فطرت کے متعلق انہوں نے ''مرد مسلمان'' کے عنوان سے ایک پر زور نظم لکھی ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!
ہمسایۂ جبریل امین بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشاں!
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان!
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان!
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمٰن

انسان کامل کے ماخذ

علامہ اقبالؒ کے انسان کامل کا ماخذ خود قرآن مجید اور حدیث شریف ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: انی جاعل فی الارض خلیفۃ (بے شک میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں)۔ وہی خلیفہ انسان کامل ہے۔ اس لئے کہ انسان فقط درجۂ کمال پر پہنچنے کے بعد ہی نیابت الٰہی کا مستحق ہو سکتا ہے۔ دنیا میں وہ انسان کامل آنحضرت صلعم کی ذات گرامی تھی۔ دوسروں کو یہ درجہ صرف آپؐ کے فیض اور کامل اطاعت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ آیا ہے: لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (رسول اللہ کی ذات میں تمہارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے)۔

ایک حدیث قدسی میں آیا ہے: **لولاک لما خلقت الافلاک** (اگر تو نہ ہوتا، تو میں ہرگز آسمانوں کو پیدا نہ کرتا)۔ اب ظاہر ہے کہ جس ذات بابرکت پر آسمانوں کی تخلیق موقوف ہو، وہ ذات انسان کامل کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

انفرادی اور اجتماعی خودی:

نیابت الٰہی کے درجے پر فائز ہونے کے بعد صاحب خودی اور ملت میں ربط و ضبط اور توازن و توافق اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ احکام الٰہیہ اس رشتے کا شیرازہ ہوتا ہے۔ اس رشتے کی وضاحت مضمون کے ابتدائی حصے میں کر دی گئی ہیں تاہم اقبال کے فلسفہ ''بے خودی'' کی مزید صراحت کے لیے فرد اور معاشرے کے حدود اور رشتوں کی وضاحت ضروری ہے اقبال کے نصب العینی معاشرے میں مرد مومن کو بحیثیت مجموعی تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ مرحلے اعتقاد، تفکر اور انکشاف پر ختم ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ لا الہ سے الا اللہ اور محمد الرسول اللہ کا ذہنی عمل اور روحانی سفر طے کر لینے کے بعد مرد مومن کی آزاد شخصیت معاشرے کے حق میں قوت و حیات کا سرچشمہ بن کر سراپا رحمت کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔ فرد اور معاشرے کی اس حیثیت کو اقبال ''قطرہ'' اور ''دریا'' کی علامتوں سے واضح کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ مومن کی خودی جب ملت سے رشتہ قائم کرتی ہے تو وہ اس میں فنا نہیں ہو جاتی بلکہ مزید استحکام حاصل کرتی ہے اور اپنے بلند اور دائمی مقاصد سے ہمکنار ہوتی ہے۔

فرد تنہا از مقاصد غافل است　　قوتش آشفتگی را مائل است
قوم باضبط آشنا گرداندش　　نرم رو مثل صبا گرداندش
چوں اسیر حلقہ آئیں شود　　آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

فرد قائم ربط ملت سے ہے ، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اب تک کی تفصیل کی اجمالی خود اقبال کی زبانی سنیے!

رمز دین مصطفےٰ دانی کی چیست؟　　فاش دیدن خویش راشا بشی ست
چیست دیں؟ دریافتن اسرار خویش　　زندگی مرگ است بے دیدار خویش
آں مسلمانے کے بیند خویش را　　از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیر کائنات آگاہ اوست　　تیغ لا موجد "الا اللہ" اوست
درمکان و لامکاں غوغائے او　　نہ سپہر آوارہ در پنہائے او
بندہ حق وارث پیغمبراں　　او نگنجد درجہان دیگراں
تاجہانے دیگرے پیدا کند　　ایں جہانے کہنہ را برہم زند
زندہ مرداز غیر حق دارد فراغ　　از خودی اندر وجود او چراغ
پائے او محکم ز رزم خیر و شر　　ذکر او شمشیر و فکرارد سپر
شخص بش از بانگے کہ برخیز دز جاں　　نے نہ نور آفتاب خاوراں
فطرت او بے جہات اندر جہات　　اور حیم و در طوفش کائنات
ذرہ از گرور اتش آفتاب　　شاہد آمد بر عروج او کتاب
فطرت اور اکشاد از ملت است　　چشم اور روشن سواد از ملت است

یہ سچ ہے کہ اقبال کا سارا فلسفہ اسلامی روح سے سرشار ہے لیکن وہ دنیا کی دوسری قوموں کو اپنے نصب العینی معاشرے سے خارج کرنے کے حق میں نہیں۔ ان کے مطابق تو ساری کائنات مرد مومن کی میراث ہے۔

من نہ گویم از بتاں بیزار شو　　کافری شائستہ زنار شو
اے امانتدار تہذیب کہن　　پشت پا برملت آبا مزن
گرز جمعیت حیات ملت است　　کفر ہم سرمایہ جمعیت است

اقبال کو اقوام عالم کے باطنی اضطراب کا اندازہ ہے اس لیے وہ تمام قوموں کا مداز پیش کرتے ہیں نہ کہ صرف ملت بیضا کا البتہ دوسری اقوام ملت بیضا کی مقلد ہوں گی کیونکہ مرد مومن کا نصب العینی معاشرہ اور نصب العینی انسان دونوں کی روح حقائق اسلام سے لبریز ہے۔ "پیام مشرق" کے دیباچے کے چند جملے ملاحظہ ہوں :

"حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت اس وجہ سے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی اضطراب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب وتمدن کے خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے والے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیر وبا نفسھم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے :

مذکورہ بالا بیان میں محض ملت بیضا کو ہی مخاطب نہیں کیا ہے بلکہ "اقوام مشرق" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اقوام عالم نہ کہنے کی وجہ نمایاں ہے کیونکہ جس زمانے کی یہ تحریر ہے اس زمانے میں مغربی اقوام خصوصاً برطانیہ نے سارے مشرق کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور انہیں ذہنی، اخلاقی، روحانی اور معاشی اعتبار سے قعر مذلت میں دھکیل دیا تھا۔ اسی لیے اقوام مشرق کو ہی اقبال نے خصوصاً مخاطب کیا ہے تا کہ وہ اپنی بقا اور روشن مستقبل کے لیے چوکنا رہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات روز روشن کی طرح نمایاں ہے کہ مرد مومن اپنی انفرادی قوت وجبروت کے ساتھ ساتھ بہر حال پابند شریعت ہو کر غفاری کا مظہر ہے اور من حیث فرد جماعت کی اجتماعی خودی کی پرورش میں مصروف ہے وہ اپنی خودی کی تکمیل کے بعد نوع بشر کو ان کی عظمتوں کا احساس دلاتا ہے اور اجتماعی خودی کو اس لیے مستحکم کرتا ہے کہ آئین الٰہیہ کے نفاذ کے لیے میدان ہموار ہو جائے۔ وہ ذہنی، روحانی اور عملی تجربات کی بھٹی میں اتنا پک کر منظر عام پر آتا ہے کہ آدمیت کا احترام اس کی سرشت بن جاتی ہے۔ البتہ راہ میں حائل افراد اور قوموں کے معاملے میں وہ بے حد سخت ہے۔ وہ کسی قیمت پر کسی قسم کی بت پرستی کی اجازت نہیں دیتا اور تمام خدا پرستوں کو اپنا بھائی تصور کرتا ہے۔ وہ رنگ، نسل، قوم اور وطن کے بتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ وہ امارت ورعونت سے گریزاں ہے حد تو یہ ہے کہ مساوات سے آگے بڑھ کر وہ اخوت کا سبق دیتا ہے۔ نام نہاد جمہوریت کی مساوات کا نہیں جو سب کو برابر تو کر دیتی ہے لیکن بھائی کو بھائی تسلیم کرنے سے عاری ہے۔ مرد مومن انسانیت کی معراج ہے اور ساری کائنات کی کایا پلٹ دینے کا حوصلہ رکھتا ہے :

"اسلام محض انسان کی (انفرادی) اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں۔ بلکہ عام بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔"

اقبال خودی کو حیات کی ایک "اکائی" تعبیر کرتے ہیں ان کے یہاں خودی اور شخصیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب اس اکائی کو احساس نفس کے شدید تجربے کے بعد ضبط نفس اور اطاعت کے مرحلوں سے گزر کر نیابت کے سرحدوں میں داخل ہونے کا موقع فراہم ہوتا ہے اس وقت اس کی توانائی اور شدت کا اندازہ بے حد مشکل ہے۔ اس میں اپنے وجود کا احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ اگر وہ احکام خداوندی کا پاس نہ کرے تو ہٹلر اور مسولینی بن کر ابھرتی ہے۔

قرآنی آیات خودی:

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ امت مسلمہ نے اقبالؒ کی اصطلاح خودی کو اس صحیح اور مفید زاویہ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی، جو کہ خود اقبالؒ کا مقصود ہے اور جس کی رو سے یہ ایک خالص "اسلامی" اور "قرآنی" چیز ثابت ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے مضمون خودی کو محض سطحی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس قدر غفلت و بے اعتنائی سے کہ عام طور پر اس کا مطلب نہایت گمراہ کن ثابت ہو رہا ہے۔

یہاں آپ قدرتی طور پر دریافت فرمائیں گے کہ عقید تمندان اقبالؒ نے "عموماً خودی" کو محض سطحی نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس قدر غفلت و بے اعتنائی سے کہ عام طور پر اس کا مطلب نہایت گمراہ کن ثابت ہو رہا ہے۔

یہاں آپ قدرتی طور پر دریافت فرمائیں گے کہ عقید تمندان اقبالؒ نے عموماً "خودی" کے کیا معنی سمجھتے ہیں؟ جواباً عرض ہے کہ انہوں نے

خودی کا مطلب "انانیت" "خواہش غلبہ وحکمرانی" یا "غرور وتکبر" سمجھا ہے اور بس۔ بسا اوقات میں [illegible]

خدا نہیں ملتا'' اور کبھی ''جہاں خودی ہے صداقت عیاں نہیں ہوتی'' اور کبھی ''خودی نے حیف مردہ کی ہے تیری روح ایمانی'' وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ایسے ایسے مصرعوں میں ''خودی'' کو سراسر بمعنی ''تکبر'' استعمال کیا گیا ہے، اور یہی ہے وہ مفہوم جس کو عموماً اقبالؒ کی ''خودی پر بھی چسپاں کر کے نہ صرف کلام اقبالؒ کے پڑھنے والے خود گمراہ ہوتے ہیں بلکہ دوست احباب کو بھی ایک خوفناک غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں۔ غالباً اسی خدشے کی بنا پر علامہ اقبالؒ نے بھی ''خودی'' بمعنی تکبر کی شدت سے تردید کی ہے اور کس قدر واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

خودی کی تندی و شوخی میں کبر و ناز ہو ناز بھی ہو تو بے لذت نیاز نہیں نہیں

مطلب یہ کہ مسلمان کی خودی باوجود اس قدر خوددار، غیرت مند، محکم اور سربلند ہونے کے اپنے اندر کبر و ناز نام کو نہیں رکھتی۔ اس میں اگر ناز (یعنی غنا) ہے تو وہ بے لذت نیاز (یعنی عجز و فروتنی) ہرگز نہیں۔ بالفاظ دیگر خودی میں جذبہ غیرت و خودداری کے ساتھ ہی ساتھ عجز اور تواضع کی عالی صفات بھی پائی جاتی ہیں۔ خودی نیاز مند ہو بھی تو اپنی غیرت کی حدود سے نکل کر نہیں بلکہ عزت نفس کے دائرے میں مقید رہتے ہوئے کہ بقول اقبال یہ ''فقیری'' بھی رشک ''شہنشاہی'' ہے۔

استغفر اللہ یہ بھی کس قدر خوفناک غلط فہمی ہے کہ خودی انسان کو خدا سے واصل نہیں ہونے دے گی اور بطور حجات خالق اور مخلوق کے درمیان حائل رہے گی اگر ایسا ہوتا تو اقبالؒ خودی کے ذریعہ دیدار الٰہی قرار دے کر یہ کیوں کہتا کہ:

زمن کو صوفیان با صفا را خدا جویان معنی آشنا را
غلام ہمت آں خود پرستم کہ با نور خودی بیند خدا را

ترجمہ: میری جانب سے خدا کو تلاش کرنے والے اور صورت کے بجائے معانی کے دلدادہ صوفیوں کو یہ پیغام پہنچا دو کہ میں تو فقط اسی ''خود پرست (خود شناس) مسلمان کی ہمت کا غلام ہوں جو نور خودی میں ذات خداوندی کا مشاہدہ کرے۔''

جب انسان فطری طور پر حاصل شدہ صفات کی قدر کرتا ہے اور اعمال صالحہ و ذکر الٰہی سے آئینہ دل کو روشن کرتا ہے تو لازمی طور پر اس کی زندگی خدا کی مقدس صفات کی ترجمان بن جاتی ہے۔ ایسا انسان کم از کم اس انعام کا مستحق ہے کہ خدا اسے ایک دائمی اثر و رسوخ عطا کرے اور اس کا نام اور کام دونوں چیزیں لوح عالم پر نقش دوام حاصل کریں۔ اس طرح گویا انسان نے خدا کی ذات و صفات کو اپنے اعمال صالحہ سے دنیا میں متعارف کیا اور کدائے راستبازی کے عوض انسان کی ہستی کو دنیائے فانی میں بھی غیر فانی ہونے کا رتبہ عطا فرمایا۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ:

نمود اس کی نمود تیری، نمود تیری نمود اس کی
خدا کو تو بے حجات کر دے، خدا تجھے بے حجاب کر دے

''نمود اس کی نمود تیری'' یعنی خدائی صفات کا اظہار درحقیقت تیرے حسن فطرت کا اظہار ہے اور جب تیرا حسن فطرت ایمان محکم اور اعمال صالحہ کی صورت میں ظاہر ہوا تو گویا خدا ہی کا دنیا میں نور و ظہور ہوا اور یہی چیز ہے نمود تیری نمود اس کی! اس طرح جب انسان کے اعمال میں خدا جلوہ گر ہوا۔ اور خدا نے بطور انعام انسان کو چشم عالم پر ہمیشہ کے لئے جلوہ گر کر دیا تو اس کیفیت سے ہر دو نے ایک دوسرے کی مخفی صفات کو بے حجات کر دیا یعنی الست بربکم قالو بلی کے معانی عملی طور پر ظہور پذیر ہوئے۔ ان اشعار کو بہ نظر غائر ملاحظہ فرمایئے۔

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود	حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پروین سے ہے اسی کا مقام	اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ منات	دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے؟ حیات	رہا نہ تو، ترو نہ سوز خودی نہ ساز

پس ثابت ہوا کہ اقبالؒ کی ''خودی'' کا مطلب ''تکبر'' نہیں بلکہ ''خود شناسی'' یا ''عرفان نفس'' ہے اور یہ وہ مقدس، وہ برگزیدہ اور وہ سرمدی حقیقت ہے جس کی تاکید خود قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر کی اور سچ پوچھئے تو اقبالؒ کی تعلیم خودی ہے بھی ان آیات قرآنی کی وضاحت جو ''عرفان نفس'' کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ ذیل کی آیات میں غور و تدبر فرمایئے اور ان کے مقصد حقیقی کا سراغ لگایئے۔

ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس به نفسه ونحن اقرب اليه من حبل الوريد

ترجمہ: ''ہم نے انسان کو پیدا کیا، اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ اس کے دل میں اس کا نفس کیا کیا وسوسے پیدا کرتا ہے اور ہم انسان کی طرف اس کی شاہ رگ سے بھی قریب تر ہیں۔''

اس آیہ شریف کا کیا مقصد ہے؟ مقصد یہ ہے کہ انسان کو دنیا کی سب سے زیادہ صادق، غیر فانی اور ناقابل تغیر کتاب (قرآن) کے ذریعے اس حقیقت کا اذعان کرلیا جائے کہ خدا نے اسے گوشت پوست اور حواس خمسہ دے کر دیگر حیوانات کی طرح فقط کھانے پینے اور نفسانی و شہوانی خواہشات کی تعمیل کرنے کے لئے آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اسے اپنا مقام خلافت عطا فرماتے ہوئے خود اس کے وجود میں شاہ رگ سے بھی قریب تر آ کے جلوہ افروز ہوا ہے اور جسم انسانی میں ''دل'' کو اپنی نشست بنایا ہے خدا کے اس احسان عظیم کے باوجود جو شخص اپنے مقام خودی کو نہیں پہچانتا اور اپنی ذات و صفات کا وہ عرفان حاصل نہیں کرتا، جس کی وساطت سے خدا کی وہ ہستی اس پر آشکار ہو جو اس کے سینے میں مکیں ہے تو اس شخص سے زیادہ غافل بدبخت اور ''ظلوم و جہول'' اور کون ہو سکتا ہے؟ پس خدا کی ہستی کو ذکر الٰہی اور عرفان نفس سے اپنے سینے میں موجود پانا اور پھر ''نگاہ پاک'' سے اس کا مشاہدہ کرنا ہی خودی کا مقصد اولین ہے اور اسی مقدس احساس سے اس کی تمام عملی قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے ایک بوند پانی میں بند

خودی کی نشوونما:

جوہر خودی کی کشود و نمود ''خودی'' کی تشکیل و نشوونما کے تابع ہے۔ فرد اپنی شخصیت کی انفرادیت متعین کر کے معاشرے کے دیگر افراد سے ممیز ہو جاتا ہے اس حقیقت کا اظہار اقبال یوں کرتے ہیں:

زندگی در صدر خویش گہر ساختن است
چو تاب از خود گیر و قطرہ آب
میان صد گہر یک دانہ گر دو
بہ بزم ہم نوایاں آں چناں زی
کہ گلشن بر تو؟ خانہ گردو

خلوت اور کم آمیزی:

خلوت اور دوسروں کے اثرات سے خود کو محفوظ رکھنا خاص کر ایسے افراد کی صحبت سے گریز لازمی ہے جن کی خودی تحلیل ہو چکی ہے۔

خودی را مردم آمیزی دلیل نارسائی با

لبا شکرہ افتادہ ور روئے خاک
شد از صحبت دانہ چیناں ہلاک

ستر مرداں حفظ خویش از یار بد

کس میاں ناکساں ناکس شود
فطرتش گر شعلہ باشد خس شود

خلوتوں میں خودی پروان چڑھتی ہے۔ایک مرد باعمل کو جس قدر زیدہ خود کی صحبت میسر آتی ہے اسی قدر وہ زیادہ ''باخدا'' ہوتا ہے اور اس کی خودی نشوونما پاتی ہے۔شوپنہاور کا یہ قول کہ:

''اگر میں بادشاہ ہوتا تو میرا یہ اہم ترین فرمان ہوتا کہ مجھے تنہا چھوڑ دو۔''

اسی لیے خودی کی تربیت کے لیے اقبال نے بھی خلوت پر بہت زور دیا ہے۔

گرچہ داری جان روشن چوں کلیم
ہست افکار تو بے خلوت عقیم
از کم آمیزی تخیل زندہ تر
زندہ تر، جوینده تر، یا بنده تر

صاحب تحقیق راخلوت عزیز صاحب تخلیق را خلوت عزیز
درنگر ہنگامہ آفاق را زحمت خلوت مده خلاق را

حفظ ہر نقش آفریں خلوت است
حوروں کو شکایت ہے کہ کم آمیز ہے مومن

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بڑی دلربانہ

ذوق تصادم:

ذوق تصادم اور خطر پسندی کے بغیر خودی کی تخلیق کا خطرہ رہتا ہے۔ذوق تصادم ہی صاحب خودی کو راہ میں حائل چٹانوں سے ٹکرانے کی ترغیب دیتا ہے اور ٹکراؤ کا یہی تسلسل خودی کو غذا فراہم کرتا ہے۔اس تصادم کے ماحول میں صاحب خودی یقین اور اعتماد کی دولت حاصل کرتا ہے جس بت کو ایک بار توڑ دیتا ہے اسے ہزاروں بار توڑنے کے حوصلے اس کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں۔مدرسے کے طلبہ کو مخاطب کر کے اقبال کہتے ہیں:

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش

کہا پہاڑ کی ندی سے سنگریزے سے
فتادگی و سرافگندگی تری معراج

ترا یہ حال کہ پامال درد و مند ہے تو
مری یہ شان کہ دریا بھی ہے مرا محتاج

جہاں میں تو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا
کسے خبر کہ تو ہے سنگ خارہ یا کہ زجاج

سخت کوشی اور خطر پسندی:

اس عنوان کے تحت ڈاکٹر غلام عمر خان رقمطراز ہیں:

''خود کو ماحول کی قوتوں پر مسلط کرنے کی یہی آرزو، عمل پیہم سخت کوشی اور خطر پسندی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔خودی کا رہبرانہ عمل انہیں اوصاف سے عبارت ہے۔بلند عزائم کی تخلیق کر کے خودی اپنی صفات کے لیے نکاس فراہم کرتی ہے۔بلند عزائم، سخت کوشی اور خطر پسندی لازم وملزوم ہیں۔یہ عزائم انسان میں جوش حیات کی فراوانی اور طاقت وقوت کے دفور (Overflow) کو ظاہر کرتے ہیں۔اس کے برعکس، سہل پسندی، کمزوری اور نکما پن ہے جو خودی کی موت پر دلالت کرتا ہے۔

سہل را جتن دریں دیر کہن
ایں دلیل آں کہ جاں رفت از بدن

خودی کا استحکام انسان کو عالم کی زبردست قوتوں سے متصادم ہونے اور ان کی تسخیر یا ان کو اپنی ذات میں انجذاب کرنے پر مائل کرتا ہے۔مستحکم خودی اس راستے کو اختیار کرنے میں اپنی ذلت سمجھتی ہے جس میں اس کو رکاوٹیں پیش آئیں اور جہاں اس کی رہنما قوت کی فراوانی کے لیے نکاس نہ فراہم ہو۔

بہ کیش زنده عطاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نہ کر دم کہ راہ بے خطر است

مرید ہمت آں رہردم کہ پاسنگداشت
بہ جادہ کہ درد کوہ دوشت و صحرانیست

اقبال کا مرد مومن خیر وشر اور مسئلہ جبر وقدر کی توضیح بھی خودی کے زیر اثر ہی کرتا ہے۔یہ قدریں شخصیت کی تعمیر سے الگ اپنا کوئی انفرادی وجود نہیں رکھتیں۔اس لیے ان کی حیثیت اضافی ہے۔بہر حال ان قدروں کا مطالعہ بھی اگلے صفحات میں الگ عنوانات کے تحت کیا جائے گا۔سردست مرد مومن کے ''فلسفہ عشق'' اور ''عمل'' دو نمایاں عناصر کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ ان دونوں عناصر کا خودی کے ساتھ بے حد گہرا تعلق ہے۔مرد مومن تکمیل ذات کے لیے عقل وعشق وعمل، فقر اور قلندری کے حربے استعمال کرتے ہے۔اور فکر مومن کے یہ تمام دھارے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔''عقل و عشق'' کا مطالعہ ایک ہی عنوان کے ساتھ مناسب ہوگا۔فقر وقلندری کی شانوں میں بھی تنا بہ ہے۔

عقل وعشق:

مرد مومن خدا تک پہنچنے کی سعی سے زیادہ خود تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور عشق اس کی خودی کو خدا کا راستہ بتاتا ہے یہ تمام دھارے ایک ساتھ مل کر بہتے ہیں۔اس مرحلے میں جذبات وخیالات کی بیشمار ایسی لہریں بھی معاون ہوتی ہیں جنہیں کوئی نام دینا مشکل ہے۔مرد مومن حیات وکائنات سے اس لیے متصادم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کا اثبات کر سکے۔جب اسے اپنی زندگی کا سراغ مل جاتا ہے تب قرب خداوندی اس کا مقدر ہو جاتا ہے۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کا قول بھی یہی تعلیم دیتا ہے خودی کے دو واضح پہلوؤں نار خودی اور نور خودی میں اسی وقت ہم آہنگی ممکن ہے جب قاہری اور دلبری، جلال اور جمال کو ایک ہی ظرف حیات میں شیر وشکر کر دیا جائے۔نار خودی میں سلگتا ہوا انسان دنیا کے لیے مجسم عذاب بن سکتا ہے۔اس

اور انسان کو باطل کے خوف سے آزاد کر دیتا ہے۔ ''لا'' کی تلوار اتنی تیز ہوتی ہے کہ اس موڑ پر عارف کی نظروں میں اپنی ذات کے سوا تمام چیزیں غیر موجود ہوتی ہیں۔ اسے اگر بھروسہ ہوتا ہے تو صرف اپنی ذات پر، اپنی انانیت پر، اپنی قوت بازو پر، اگر وہ عاشق ہوتا ہے تو محض اپنے ہی جلال اور جمال کا، اسے اپنی قاہری عزیز ہوتی ہے۔ وہ خود ہی عابد و معبود، ساجد و مسجود ہو جاتا ہے۔ سرمد کو محض اسی ادھورے کلمے کی وجہ سے سزائے موت دی گئی تھی۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ''لا الہ'' کا بھرپور یقین دل میں جمنے کے ساتھ ہی خدا مرد مومن کے قلب میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے صنم خانوں میں خدا کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انسان کا دل دنیا کا عظیم ترین بتکدہ ہے لہذا ''لا'' کی لاٹھی سے مرد مومن اس بتکدے کو منہدم کرتا ہے اور مکمل انہدام کے بعد ''الا اللہ'' کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ''لا الہ'' کی منزل میں بھی اللہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا مقصد تلاش خدا ہو۔ اسی ''لا'' ''ولا اللہ'' کے بین بین عشق ابھرتا ہے اور ''محمد الرسول اللہ'' تک پہنچ کر اپنی منزل پالیتا ہے۔ اس لیے خودی کی تندی و شوخی میں کبر و ناز نہیں رہ جاتا اور ناز ہوتا ہے تو ''بے لذت نیاز'' نہیں ہوتا۔

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں

''خودی'' ''عشق'' کے بغیر ایک اندھی قوت ہے۔ ''انا'' کو عشق ہی سے تقویت ملتی ہے اور اسی کے فیض سے مرد مومن کے اندر سوز و گداز کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔

''انا'' کا استحکام عشق ہی سے ہوتا ہے۔ یہ لفظ (اس موقع پر) بہت ہی وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں جذب کر لینے اور اپنے آپ میں سمو لینے کی خواہش، اس کی سب سے اعلیٰ صورت قدروں اور نصب العینوں کی تخلیق اور ان کو ایک واقعیت بنا لینے کی کوشش ہے۔ عشق، عاشق اور معشوق دونوں کو منفرد بنا دیتا ہے۔ سب سے زیادہ یکتا شخصیت کی واقعیت کو مان لینے کی کوشش طالب کو منفرد بنا دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مطلوب کی انفرادیت کو بھی مطمئن کرتی ہے کیونکہ کوئی دوسری شے طالب کی فطرت کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ ''انا'' کے استحکام کے لیے ہمیں ''عشق'' یعنی جذب کر لینے والے عمل کی طاقت کو نشو و نما دینا چاہئے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت میں جذب کر لینے والے عمل کا سبق موجود ہے اور خصوصاً ایک مسلمان کے لیے:

مندرجہ بالا اقتباس میں اقبال نے عشق کو انا کے استحکام کا ایک وسیلہ بتایا ہے جو اپنے اندر جذب کی لامحدود امکانی صورتیں پوشیدہ رکھتا ہے۔ قدروں اور نصب العینوں کی تخلیق عشق ہی کے ذریعے ممکن ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

حضرت ابراہیم کو خدا سے عشق تھا اس لیے آگ کا خیال یا خوف ان کے دل میں کیوں کر جاگزیں ہوتا۔ جب طالب آگ میں کود گیا تو مطلوب کی غیرت نے آگ کی صفت ہی بدل دی کیونکہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہے لیکن عقل ایسی جست لگانے پر آج بھی حیران ہے۔ اس صفت کو اپنی شخصیت میں جذب کرنے کے لیے مرد مومن رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور رسول مقبول کی اقتدا کر کے ہی اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے۔

مرد مومن کی حیات مقصد آفرینی سے عبارت ہے اور اس کے حصول کی جتنی بھی کٹھن منزلیں ہیں، وہاں عقل کے بال و پر جلتے ہیں۔ محض عشق ہی ساتھ دے پاتا ہے۔ عشق تمام ذہنی اور روحانی بیماریوں کا واحد علاج ہے۔

در جہاں ہم صلح، ہم پیکار عشق
آب حیواں تیغ جوہر دار عشق

مرشد رومی کی طرح اقبال بھی کاملین کی صحبت کو اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری گردانتے ہیں:

کیمیا پیدا کن از مشت گلے بوسہ زن بر آستان کاملے

عشق کی سب سے بڑی خصوصیت یا اس کا آخری ثمر یہ ہے کہ عاشق میں معشوق کی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔

از نگاہ عشق خار اشق شود عشق حق آخر سراپا حق شود

اقبال ''اسرار خودی'' میں مرد مومن کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ تو عشق کی دولت حاصل کر، کسی کو اپنا محبوب بنا، اگرچہ یہ راہ دشوار گزار ہی لیکن منزل سے قریب تر ہے البتہ اس راہ میں مشکلات کا سامنا یقینی ہے۔ کیونکہ ہر معشوق اپنے عاشق کا امتحان لیتا ہے اور قرآنی اصطلاح میں اس امتحان کو ''ابتلا'' کہتے ہیں۔ تو کسی مرد کامل کے قدموں میں سر رکھ دے پھر تو پارس پتھر بن جائے گا۔ مٹی کو چھو دے گا، مٹی سونا بن جائے گی اور پھر تو جسے ایک نظر دیکھ لے گا وہ بھی تیری طرح کامل بن جائے گا۔ اسی حقیقت کا غماز یہ شعر ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مگر وہ کون سا معشوق ہے جس کے قدموں کو بوسہ دینے سے عاقبت سنور جاتی ہے؟ جس کی نگاہوں میں یہ خصوصیت ہے کہ ایک نظر میں دلوں کو مقلب کر دیتی ہے اور تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ جس کے ادنیٰ اشاروں پر کائنات میں غلغلہ پیدا ہو سکتا ہے، جو حاصل حیات و کائنات ہے اور جس کی تقلید سے مرد مومن مذکورہ بالا تمام صفات اپنی ذات میں پیدا کر لیتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

درد دل مسلم مقام مصطفےٰ است
آبروئے ما ز نام مصطفےٰ است

''عشق اقبال کے نزدیک ایک بنیادی جذبہ حیات ہے۔ انسانی خودی حیات کی اعلیٰ سطحوں پر خودی مطلق سے ملنے اور قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتی ہے۔ اس کا یہ اضطراب، یہ تڑپ اور یہ بے چینی ہی جذبہ عشق ہے۔ خودی کا سوز و ساز اور کیف و مستی ہی اسے پائیدار بناتی ہے۔ یہ عشق ہی خودی کو پائیدار اور مستحکم بناتا ہے۔ حیات کا ارتقاء، سوز و ساز پر موقوف ہے۔

از محبت چوں خودی محکم شود
توسنش فرمانده عالم شود

جب خودی محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو اپنی اس طاقت سے کائنات پر حکمرانی کرتی ہے۔ زندگی کی ابتدائی منزلوں میں عقل ہی رہنمائی کرتی ہے لیکن جب خودی مادے پر غالب آ کر با اختیار ہو جاتی ہے تو زندگی کے خطرناک سفر میں عقل پیچھے رہ جاتی ہے اور عشق مرد مومن کا رہنما بن جاتا ہے۔ یہاں عقل اور عشق ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ خدا ہیں عقل سے عشق پیدا ہوتا ہے اور بعد میں جواں ہو کر آگے نکل جاتا ہے پھر بھی عقل کا قطعی طور پر ساتھ نہیں چھوڑ دیا۔ اس کی سکت بھر مرد مومن اس سے کام لیتا ہے۔ عقل حقیقت کو جز و جز و پاتی ہے اور عشق وجدان کے آئینے میں حقیقت کلی طور پر بے نقاب ہو جاتی ہے۔ باطنی تجربہ کوئی بعید از قیاس قوت نہیں بلکہ حقیقت تک پہنچنے کا ایسا ذریعہ ہے جو عقل سے ممکن نہیں اس لیے کہ یہاں آ کر فکر بالکل ختم ہو جاتی ہے اور صرف جذبہ باقی رہ جاتا ہے جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے انسانی تجربوں کی طرح یہ تجربہ بھی راست ہوتا ہے۔ انسان کی ذہنی صلاحیتوں سے ہم حقیقت کی خبر پا سکتے ہیں لیکن قلبی صلاحیتیں ہمیں نظر بخشتی ہیں۔ حقیقت کی تلاش میں عقل عشق کی رفیق ہے۔ مگر یہ جرات رندانہ سے محروم ہے اور زندگی کی انتہائی کٹھن منزلوں پر عقل سوچ میں پڑ جاتی ہے، حیلے تلاش کرنے لگتی ہے لیکن عشق جست لگا دیتا ہے۔

عشق اوبر لا مکاں شخوں زند

عقل در اندیشہ گیر و مقام
عشق را کا شانہ قلب لا نیام

عقل ہم عشق است داز ذوق نظر بیگانہ نیست
لیکن ایں بے چھارہ را آں جرات رندانہ نیست

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ صوفی نہ حکیم

عشق ہی سے قلب مومن میں سوز وگداز پیدا ہوتا ہے جسے دے کر وہ شان خداوندی لینے کو بھی تیار نہیں

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

تجرباتی اور عقلی ذرائع کے علاوہ علم و آگہی کا ایک اور ذریعہ ہے۔ جسے وجدان کہتے ہیں اور یہی وجدان عشق کی راہوں سے فقر سے ہم آہنگ ہوکر مرد مومن میں قلندرانہ شان پیدا کرتا ہے۔

اقبال کے یہاں عقل و عشق میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ عقل ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں کام آتی ہے اور عشق نیابت الٰہی کے مقام کا شعور عطا کرتا ہے۔

از خلش کرشمہ کار نئی شو و تمام
عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب

عقل سفر حیات میں مرد مومن کے لیے روشنی بکھیرتی ہے۔ لیکن عشق خود جوش حیات ہے جو عمل میں ڈھلنے کے بعد تخلیق بن جاتا ہے اور بجائے کود ایک روشنی کا ایسا مینار ہے جس کی حدود میں دنیا کی تمام حقیقتیں بے نقاب نظر آتی ہیں۔

خرد سے راہبرو و روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغ رہ گزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے

عقل زمان و مکان کی پابند ہے۔ اور قیود زمان مکان سے خود آزاد نہیں کرسکتی ہے۔

خرد در لا مکاں طرح مکاں بست
چوں زنارے زماں راہر میاں بست

عشق، قلندر، یا فقیر یا مرد مومن اور انسان کامل کی تخلیقی فعلیت کا محرک ہے اور انسان کامل کی طرح اس کی تخلیق بھی لافانی ہوتی ہے عاشق اپنے قدموں کے نشانات کائنات کے رخسار پر رہتی دنیا تک کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ مکان اور زمان انتشار اور زوال کے پابند ہیں۔ ان کا احتساب عقل کے ذریعے ہوتا ہے۔ لیکن قدر آفریں خودی عشق کے وسیلے سے جو کچھ کرتی ہے اس کو زبان مسلسل مٹانے سے قاصر ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات ، موت ہے اس پہ حرام
تند و سب سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی جن کا نہیں کو نام

عشق بجائے خود اعلیٰ ترین ایقا اور وجدان ہے۔

عشق دم جبریل، عشق دم مصطفٰے
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

موجودہ انسان سے انسان کامل تک پہونچنے کا راستہ عشق ہے۔

بیا اے عشق، اے رمز دل ما
بیا اے کشت ما، اے حاصل ما
کہن گشتند ایں خاکی نہاداں
دگر آدم بنا کن از گل ما

دین کی تکمیل بغیر عشق کے نہیں ہوسکتی۔ حیات کا میکانیکی تصور قرب الٰہی کا باعث نہیں ب سکتا۔ عشق وہ جذبہ ہے جس کے ذریعے "مرد مومن" غم حیات اور مشکلات کے احساس کو کند کر کے ہر گھڑی تازہ دم رہتا ہے۔

زندگی را شرع و آئین است عشق
اصل تہذیب است دین است عشق

ظاہر او سوز ناک و آتشیں
باطن او نور رب العالمین

از تب و تاب و روش علم و فن
از جنون ذو فنوش علم و فن
دیں نگر دو پختہ بے آدب عشق
دیں بگیر از محبت ارباب عشق

عشق کی حکومت، جسم و روح، ظاہر و باطن سب پر یکساں ہے اس کے بغیر زندگی یاس و قنوطیت کا شکار ہوسکتی ہے۔ بے عشق حیات وسوسوں میں گرفتار رہتی ہے۔ اور جرات مندانہ کے ساتھ امتحانہ گاہ میں قدم نہیں رکھتی۔ خودی سے قاہری تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن خودی بھی دلبری کے لیے عشق کی محتاج ہے۔ جلال، شخصیت کا ایک پہلو اور جمال دوسرا۔ مرد مومن جلال و جمال کا آمیزہ ہے اس لیے صاحب عشق بھی ہے۔

از محبت جذبہ ہا گرد و بلند
ارج می گیراز و نا ارجمند
بے محبت زندگی ماتم ہمہ
کارو بارش زشت نا محکم ہمہ

عشق مورو مرغ و آدم رابس است
عشق تنہا ہر دو عالم رابس است
دلبری بے قاہری، جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

عالمے در عالمے انگیخت عشق

وہ صاحب عشق ہستیاں ہی ہیں جو نان جویں پر گزارا کر کے در خیبر اکھاڑ پھینکتی ہیں جن کی ضربوں کی تاب نمرود کو بھی نہیں ہوتی اور یہ وہ لوگ ہیں جو بے لشکر اور ہتھیار کے فرعون کو غرق دریا کر دیتے ہیں۔ اور جن کے اشاروں پر چاند کا کلیجہ پھٹ سکتا ہے۔ یہ عشق پابند زمان و مکان ہرگز نہیں۔

عشق بانان جویں خیبر کشاد
عشق دراندام مہہ چاکے نہاد
کلمہ نمرود بے ضربے شکست
لشکر فرعون بے حربے شکست

لازماں و دوش و فردائے ازو
لامکاں وزیر دبا لائے ازو

علم و عقل عشق کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچنے سے قاصر ہیں کیونکہ عقل کوف وحراس میں گرفتار رہتی ہے، علم جلال کائنات سے مرعوب ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ علم کے اصول جبری ہیں اس میں وجدانی الہامی اور القائی انکشافات اور اطلاعات و انشراحات کی گنجائش کہاں اس کے برخلاف عشق کی رسائی ہمہ محیط ہے۔

بربیم در جا واردا اساس
عاشقاں رانے امیدو نے ہراس
علم ترساں از جلال کائنات
عشق غرق اندر جمال کائنات
علم راہد رفتہ و حاضر نظر
عشق کوید آنچہ می آید نگر
علم پیماں بستہ با آئین جبر
چارہ او چیست غیرانہ جبر و صبر
عشق آزاد و غیور ا ناصبور
درتماشائے وجود آمد جسور

نظر اور دید:

''نظر'' اور ''دید'' کا استعمال بھی اقبال نے عشق ہی کے باب میں کیا ہے۔ یہ عشق ہی کی ادائیں ہیں، عشق کی مزید وضاحت کے لیے ڈاکٹر نکلسن کے نام اقبال کے ایک خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جہاں تک انسان کا تعلق ہے اس کے وجود کا نقطہ مرکزی شخصیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے (اور یہی ایغو ہے) شخصیت دراصل) جوش اور ولولے (Tention) کی ایک کیفیت ہے۔ شخصیت کا وجود اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اس جوش اور ولولے کی کیفیت قائم ہی۔ یہی کیفیت انسان کی سب سے بیش قیمت متاع ہے اور انسان کا فرض ہے کہ اس بات کا اہتمام کرے کہ جوش اور ولولے کی اس کیفیت میں کبھی کمی نہ ہو۔ جو چیز اس جوش اور ولولے کی کیفیت کو برقرار رکھ سکتی ہے وہی ہمیں بقائے دوام بخش سکتی ہے، مختصر یہ کہ شخصیت کے تصور کی بدولت ہمیں ایک معیار قدر حاصل ہوتا ہے جسے کسوٹی بنا کر خیر و شر کو پرکھا جا سکتا ہے۔ جو چیز شخصیت کو مستحکم کرے، ولولے کو برقرار رکھے، وہ خیر ہے''۔ جو چیز اس کیفیت کو کمزور کرے (انسان کو سست رفتاری پر مائل کرے) وہ شر ہے۔ شخصی بقا اسی کو حاصل ہوگی جو اپنی زندگی میں فکر و عمل کے ایسے طریقے اختیار کرے کہ جوش اور ولولے کی کیفیت قائم رہے۔ بالفاظ دیگر شخصیت برقرار رہے۔ اگر ہمارے عمل کا مقصد یہ ہو کہ شخصیت کے جوش و ولولے کی کیفیت قائم رہے تو موت کا صدمہ بھی اسے متاثر نہ کر سکے گا۔ موت کے بعد ایک وقفہ البتہ ممکن ہے جسے قرآن مجید برزخ کہتا ہے۔ یہ وقفہ موت اور حشر اجسام کے درمیان واقع ہوتا ہے اور اس وقفہ میں وہی انا یا ایغو باقی رہتے ہیں جو زندگی میں یہ اہتمام کر لیتے ہیں کہ برزخ کے وقفے میں ان کی شخصیت برقرار رہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ جوش اور ولولہ، یہ جوہر حیات وہی کیفیت ہزار شیوہ ہے جسے اقبال عشق کہتا ہے جو کبھی تحصیل علم کا وجدانی ذریعہ بنتی ہے اور عرفان کہلاتی ہے، جو کبھی زندگی کو دوام بخشتی ہے جو کبھی سوز و ساز اور ذوق طلب کے مرحلوں سے گزر کر انسان کو ان روحانی بلندیوں تک پہنچاتی ہے جن کا نقطۂ عروج مقام کبریا ہے۔ عشق کے جذبہ اور شوق کی حالت ہمارے احساس ذات کو قوی اور شخصیت کے شعور کو مضبوط بنا دیتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں ''میں چونکہ عشق کرتا ہوں اس لیے ہوں۔'' عشق ہی زندگی کی ضمانت ہے۔ عشق ہی حیات بعد الموت کا ضامن ہے۔

ڈاکٹر سعید نور الدین نے عشق حقیقی کے تناظر میں بہت خوب لکھا ہے آپ پہلے انسان کی عظمت کا ذکر کرتا ہے اور ''حضورؐ بحیثیت کامل انسان'' کا نظریہ واضح کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ حضورؐ سے عشق کی اہمیت قرآن کی روشنی میں کرتے ہیں ذیل میں کچھ انتخاب آپ کی کتاب لیا گیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ ارشاد ہے۔ ومارمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ (جب تم نے مٹھی بھر کر پھینکا تھا تو وہ تم نے نہیں پھینکا بلکہ وہ تو اللہ نے خود پھینکا تھا۔) بقول علامہ اقبال کہ اس مومن کامل اور انسان کامل میں یہ قوت اور قدرت ہوتی ہے کہ اس کا عزم و ارادہ تقدیر الٰہی ہو جاتا ہے، اور میدان جنگ میں اس کا تیر تیر خداوندی ہوتا ہے۔ اقبال کا شعر ملاحظہ کیجئے:

عزم او خلاقِ تقدیر حق است روز ہجا تیر او تیر حق است

حضرت آدم (جو ابو البشر یا انسانیت کے اولیں پیکر تھے) اپنے ظاہر کے لحاظ سے خلق کی صورت تھے تو اپنے باطن کے لحاظ سے حق کی صورت۔ خداوند عزوجل کا ارشاد، فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی۔ یہاں تسویہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب جسم آدم میں ہر قسم کی صلاحیت پیدا ہو گئی تب اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونکی۔ روح پھونکنے کے معنے صرف یہی نہیں کہ جسد آدم میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ بلکہ یہ بھی ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات اور صفات کا پرتو آدم پر ڈالا۔ چونکہ آدم کا تسویہ پورا ہو چکا تھا، انہوں نے اس پرتو کو قبول کیا اور امانت الٰہی کے متحمل ہو گئے۔

اسی لئے انسان میں جملہ صفات الٰہی کا پرتو پایا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان ان صفات کے لئے اللہ کا محتاج ہے، اور اللہ کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں۔ انسان ظلی عکسی اور اضافی طور پر صفات الٰہی کا حامل بنا، جبھی تو اس کو مسجود ملائک کا اہم اور مقتدر رتبہ حاصل ہوا۔ مسجود ملائک ہونا گویا اعلامیہ تھا کہ وجود کے ارتقا نے مکمل شکل اختیار کر لی۔

حدیث شریف میں آیا ہے ان اللہ خلق آدم علی صورتہ (خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا) ذات باری ہر قسم کی تجسیم و تشبیہ سے پاک ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہاں صورت سے مراد جسمانی شکل نہیں ہو سکتی، بلکہ معنوی شکل و صورت مقصود ہے۔ یعنی خدا کی صفات کاملہ کا عکس موجودات میں سب سے زیادہ انسان ہی میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (حسن، اخلاق صرف خدا تعالیٰ کا خلق عظیم ہے)۔ ارباب معرفت نے اسی لئے یہ تعلیم دی ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ (خدا کے سے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو) جو کوئی جس درجے تک اخلاق خداوندی سے نسبت کاملہ پیدا کرے گا، وہ اسی قدر شرف انسانیت سے آراستہ اور احسن التقویم کی

وجود کے مراتب میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا انسان اکمل ہے۔ اور جملہ افراد انسانی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے ارفع و اکمل ہیں اور مظہر اتم ہیں حق تعالیٰ کے۔ اس لئے صرف آپ ہی انسان کامل ہیں۔

کائنات اور اس میں جو کچھ ہے سب کچھ آپ ہی کے صدقے میں وجود میں آیا ہے۔ ایک حدیث قدسی ہے **لولاک لما خلقت الافلاک** (اگر آپ کی ذات والا صفات وجود پانے والی نہ ہوتی تو میں یہ زمین و آسمان اور یہ کائنات کچھ پیدا نہ کرتا) اقبال کے اشعار دیکھئے۔ فرماتے ہیں:

عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ **لولاک** نہیں

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ **لولاک**

ولایت ، بادشاہی ، علمِ اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اقبال کا مردِ مومن جو معرفتِ خودی رکھتا ہے اور اتباعِ نبوی میں اسوۂ حسنہ پر اپنی زندگی کو ڈھالتا ہے، انفس و آفاق کو مسخر کر لیتا ہے۔ ضمیر کائنات کے اسرار و رموز اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ وہ ابن الوقت نہیں رہتا۔ بلکہ ابو الوقت اور ابو الحال کے بلند مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔

اقبال اور محبِ رسول

یہ عشق کا جذبہ حبِ خدا اور حبِ رسولؐ سے میسر ہوتا ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے، والذین آمنوا اشد حباللہ (جو مومن ہیں وہ خدا کی ذات سے زیادہ سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔) محبِ خدا، عشقِ رسولؐ کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی۔ قرآن شریف میں واضح طور پر فرمایا ہے، قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو اول میرا اتباع کرو۔ اس پیروی و اتباع کی برکت سے تم کو میری محبت حاصل ہوگی، اور محبتِ رسول سے تم حبِ الٰہی تک پہنچ جاؤ گے، جس کے صلے میں تم کو بارگاہِ الٰہی سے یہ انعام عطا ہوگا کہ خود خدا تم سے محبت فرمائے گا) اسی لئے علامہ نصیحت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے وہ سوز طلب کرو جو حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کو ملا تھا۔ عشقِ نبیؐ کا تھوڑا سا حصہ حق سے طلب کرو کہ یہ مل جائے تو یہ بھی بہت ہے۔ شعر ہے:

سوز صدیقؓ و علیؓ از حق طلب
ذرۂ عشقِ نبیؐ از حق طلب

انسان کامل

اقبال کی مختصر نظم ''مردِ بزرگ'' ایک ایسے ہی صحیح قسم کے مردِ مومن کی تعریف کرتی ہے جو انسانِ کامل (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع و تقلید کے شرف سے آراستہ ہے:

اس کی نفرت بھی عمیق ، اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق
مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق
اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محروم نہیں پیرانِ طریق

مدارج روحانی اور کمالاتِ باطنی میں اس درجہ ترقی ممکن ہے کہ پھر بندۂ مومن سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ جائے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے، صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ (اللہ کا رنگ! اور اس کے رنگ سے زیادہ اچھا اور چوکھا اور کون سا رنگ ہو سکتا ہے!!)

حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ انسان اوصافِ عالیہ کے لئے اصطرلاب کے مانند ہے۔ انسان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں اوصافِ خداوندی کا پرتو پایا جائے۔ جو صفت بھی انسان میں پائی جاتی ہے وہ اسی کا عکس ہوتی ہے۔ بعینہٖ ایسے جیسے کہ پانی میں چاند کا عکس نظر آتا ہے۔ خلق کو صاف اور پاک پانی کے مانند سمجھو جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا عکس نظر آتا ہے۔ مولانا کے اشعار یہ ہیں:

آدم اصطرلاب اوصافِ عدوست
وصفِ آدم مظہر آیات اوست
ہر چہ در وے می نماید عکس اوست
ہم چو عکس ماہ اندر آب جوست
خلق را چوں آب داں صاف و زلال
وندرو تاباں صفاتِ ذوالجلال

انسان کامل

حق تعالیٰ نے سب سے پہلا تنزل حقیقتِ محمدیؐ میں فرمایا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اول ما خلق اللہ نوری (یعنی پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ میرا نور تھا)۔ نیز فرمایا کہ کنت نبیاً وآدم بین الماء والطین (یعنی میں نبی تھا جب کہ آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے اور ابھی ان کو وجود حاصل نہیں ہوا تھا) آپؐ کل موجودات سے اسبق اور کل مخلوقات سے اکمل ہیں۔ آپؐ اصل ہیں جملہ کائنات کی۔ حدیثِ قدسی ہے **لولاک لما خلقت الافلاک** (یعنی اگر آپؐ کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں کائنات ہی کو پیدا نہ کرتا۔) آپؐ پر تکمیلِ انسانیت ختم ہوئی۔ دراصل وہ قطب جس پر احکامِ عالم کا دارومدار ہے، اور جو ازل سے ابد تک دائرہ وجود کا مرکز ہے، حقیقتاً ایک ہی ہے، اور وہ ہے حقیقتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور آپ ہی کی ذات واحد انسان کامل ہے۔

مردِ مومن کے لئے واحد مثالی پیکر یہی انسان کامل یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ آپ تک رسائی جیسا کہ پہلے وضاحت کی گئی، عشق کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ اور عشق کی تکمیل اسوۂ حسنہ کی پیروی کے بغیر ممکن نہیں۔ جس نے آپؐ کے اسوۂ طیبہ کا اتباع کیا، اسے آپؐ کی محبت حاصل ہوئی۔ اور جسے یہ سعادت نصیب ہوگئی اسے سب کچھ مل گیا۔ مختصر یہ کہ بندۂ مومن جو توحید کا رازدار، متاعِ مصطفویؐ کا امین اور اسوۂ حسنہ کا سرگرم متبع ہوتا ہے۔ جو احکامِ الٰہی اور فرامینِ مصطفویؐ کے اتباع کی بدولت روحانی ارتقا کے منازل طے کرتا ہے عشقِ رسولؐ جس کا زادِ راہ اور قرآنِ عظیم جس کا ساز و برگ ہوتا ہے، اسے وہ شوکت و سطوت نصیب ہوتی ہے، جو اسے ساری کائنات پر تصرف اور غلبہ بخشتی ہے۔ اور اسے انفس و آفاق کی تسخیر اور ان پر کامل تصرف حاصل ہو جاتا ہے، اس کی ذات اوصافِ خداوندی کا پرتو اور جلال و جمال کا مظہر ہوتی ہے۔

علامہ اقبال مولانا گرامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مسلم تو دۂ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے۔ یہ ایک قوت نورانیہ ہے کہ جامع ہے جواہر موسویت (علیہ السلام) یہ ایک قوتِ نورانیہ ہے کہ جامع ہے جواہر موسویت (علیہ السلام) اور ابراہیمیت (علیہ السلام) کی۔ آگ اسے چھو جائے تو برد و سلام بن جائے۔ پانی اس کی لپیٹ سے خشک

جذب کرلیتا ہے،عدم بود کو کھا جاتا ہے،پستی بلندی میں سما جاتی ہے،مگر جو قوت جامع اضداد ہو، اور مخلل تمام تناقضات کی ہو، اسے کون جذب کرے!! مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی قوت حیات وموت کو اپنے اندر جذب کر کے حیات وموت کا تناقض مٹا چکی ہے۔ مسلم ضعیف جذبات متناقض یعنی قہر ومحبت کو اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے اور اس کا دائرہ اثر اخلاقی تناقضات تک ہی محدود نہیں، بلکہ تمام طبعی تناقضات پر بھی حاوی ہے۔ پھر مسلم جو حامل ہے محمدیت کا، اور وارث ہے موسویت اور ابراہیمیت کا۔ کیونکر کسی ''شے'' میں جذب ہو سکتا ہے۔ البتہ اس زمان ومکان کی مقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے، اور اس کی قوتِ جاذبہ بھی ذاتی اور فطری نہیں، بلکہ مستعار ہے ایک کفِ پا سے۔ جس نے اس ریگستان کے چمکتے ہوئے ذروں کو کبھی پامال کیا تھا۔

طیب عثمان ندوی اقبال کے عشقِ رسول پر لکھتے ہیں کہ: اقبال کے والہانہ عشق کا اندازہ ان کے اس شعر سے ہوتا ہے جو اپنے اندر محبت وعقیدت کی ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہے۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اقبال کے عشق رسول کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنے خدا سے تمنا بھی کرتے ہیں تو اس بات کہ قیامت کے دن ان کا نامۂ اعمال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے پوشیدہ رہے تا کہ ان کی نظروں میں ندامت ورسوائی نہ اٹھانی پڑے۔

مکن رسوا حضور خواجہؐ مارا
حساب من زچشم اونہاں گیر

سچ تو یہ ہے کہ اقبال کے عشق بے پایاں کا اندازہ بڑا ہی مشکل ہے، ان کا آخری مجموعہ کلام ''ارمغان حجاز'' ایک ایسا پیام محبت ہے، جس میں عشق کی سوزش، اس کی سرخوشی ومستی، آہ ونالہ، سوز وساز، تب وتاب اور درد وداغ سب کچھ پنہاں ہے۔ اس سلسلہ میں کلام اقبال کی کہاں تک توضیح وتشریح سے کام لیا جائے؟ بلکہ حق تو یہ ہے کہ ترجمہ سے شعر کی حسن وخوبی اور اس کی ساری کیفیت بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ اقبال ہی کی زبان میں عشق ومحبت کے چند کیف آگیں نغموں سے اپنے دلوں میں سرور وشوق پیدا کیجئے۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شان جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگویم
بپائے خواجہؐ چشماں را بمالیم

گہے شعر عراقی را نجوانم
گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگ عرب را
شریک نغمہ ہائے سار بانم

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے
رمیداز سینۂ او سوز آہے
دلش نالد! چرا نالد؟ نداند
نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

مرا ایں تنہائی و آہ و فغاں بہ
سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب، کجا میخانۂ شوق
تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ

زبان ما غریباں از نگاہیست
حدیث دردمنداں اشک و آہیست
کشادم چشم و بربستم لب خویش
سخن اندر طریق ماگناہیست

مرا ایں سوز از فیض دم تست
بتاکم موج مے از زمزم تست
خجل ملک جماز درویشی من
کہ دل در سینۂ من محرم تست

تسخیر اور عمل:

مرد مومن کی شخصیت کی تکمیل اس کے عمل سے ہوتی ہے یہ بات پہلے ہی واضح کی جا چکی ہے کہ مومن کے عمل سے مراد عمل صالح ہے اور عمل صالح سراپا خیر ہے۔ مرد مومن پابند احکام الٰہی ہے اس لیے وہ جو کچھ بھی کرتا ہے محض اپنی انفرادیت کی بقا اور تکمیل کی خاطر کرتا ہے اور یہی منشائے الٰہی بھی ہے۔ قرآن حکیم کا مزاج یہی ہے کہ انسان اپنے منصب حقیقی پر فائز ہو اور قادر مطلق کا عرفان حاصل کرے کیونکہ معبود حقیقی کے احسانات کا صحیح معنوں میں شکر یہ ادا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بندہ اولاً خدا کی کرم فرمائیوں سے آشنا ہو جائے۔ ہبوط آدم سے اقبال نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انسان کو جنت کی چار دیواری سے نکال کر کرہ ارض میں اس لیے بھیجا گیا کہ وہ ایک وسیع وعریض کائنات میں اپنے عمل کے ذریعے اپنی ذات کے تحفظ کا گر سیکھے اور صحیفۂ فطرت کا مشاہدہ کر کے اسے اپنی قوت عمل سے مخر کرے اس مرحلے میں وہ خود بخود رموز فطرت سے آشنا ہو کر قدرت کاملہ کی نوازشوں کا تہہ دل سے معترف ہو جائے گا۔

اقبال تخلیقی عمل کے قائل ہیں نہ کہ میکانی عمل کے۔ وہ خدا کی طرح نائب خدا یعنی انسان کو بھی تخلیقی قوتوں کا سرچشمہ تسلیم کرتے ہیں۔ انسان کبھی اپنے طور پر کائنات پر قابو پا کر ترمیم وتنسیخ کر کے مادے کی شکل میں خاطر خواہ تبدیلی کر لیتا ہے اور اسے معنویت عطا کر کے اپنی ضروریات کے لائق بنا لیتا ہے۔ لہٰذا ان تصرفات کی وجہ سے ہی وہ نیابت خداوندی کا اہل بن کر خالق ثانوی کا درجہ حاصل کر پاتا ہے۔ مرد مومن قوت تخلیقی اور جذبہ تسخیر سے سرشار ہوتا ہے۔ وہ اس بات پر عقیدہ رکھتا ہے کہ

عمل سے زندگی محکم ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

شخصیت کو بلند ترین مقام یعنی نیابت الٰہی کا درجہ عمل ہی کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے۔ خودی عمل پیہم ہی سے پرورش پاتی ہے اور عمل ہی خودی کا اظہار بھی ہے۔ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اقبال کے نزدیک ''لا'' ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل کے ذریعے لافانی اور لازوال ہو جاتی ہے۔

''انسان جو کچھ بھی ہے وہ چیز نہیں بلکہ عمل ہے اور انسان کے اعمال جس مقصد کی سمت رہبری کرتے ہیں، اس سے اس کی شخصیت متعین ہوتی ہے جسم اور روح کا جو تعلق ہے وہ عمل اور مقصد کا تعلق ہے کیونکہ جسم خود ایک جامد شے نہیں جو خلا میں رکھ دی گئی ہو بلکہ اعمال وواقعات کا نظام ہے مگر اس عمل کی رہنمائی روح یا خودی کرتی ہے اگر جسم اعمال کا نظام ہے تو روح تجربوں کا۔ اس طرح مادی کو دی

جاتا ہے تو ایک بلندتر شعور پیدا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت کہ روح اپنے اعلیٰ مدارج مادہ سے حاصل کرتی ہے، کسی طرح روح کی افضلیت کے منافی نہیں ہے۔ زندگی کی ارتقاء کی ابتدائی منزلوں میں ذہن جسم کے تابع ہوتا ہے۔ مگر جیسے جیسے ذہن بلند ہوتا جاتا ہے جسم کو اپنے تابع کر لیتا ہے اور آخر اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ بالکل آزاد ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

''مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، اعمال صالح کرتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور اپنے آپ کی مدافعت اس وقت کرتے ہیں جب ان پر زیادتی کی جائے۔''

دوسری جگہ ارشادی باری ہے:

''اور یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ بیشک یہ تمام زمین ہمارے صالح بندوں کی میراث ہے۔''

اقبال کا فلسفہ عمل بھی قرآن حکیم ہی سے ماخوذ ہے اس لیے وہ مرد مومن کو یہ نکتہ بتاتے ہیں کہ

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کیلیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کیلیے
عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

مسئلہ فنا:

اقبال وصال کے بجائے فراق کے قائل ہیں کیونکہ فنا کا تصور احساس عشق کو کند کر دیتا ہے۔ مرد مومن کہاں کوں ذوق و جستجو کا پیکر ہے اور بہر حال وہ اپنی ذات کا پاس اور احترام روا رکھتا ہے۔ عام صوفیا کے یہاں فنا سے مراد ذات خداوندی میں جذب ہو جانا ہے لیکن اقبال کا مرد مومن اپنا مقام برقرار رکھنے اور وجود کی محافظت اور مدافعت کے طور پر خود کو خدا میں فنا کرنے کی بجائے خود خدا کو اپنی ذات میں جذب کر لیتا ہے اور اس کی ذات سے کسب فیض کر کے اپنی ذات کو اور بھی منفرد اور ''مولا صفات'' بناتا ہے۔

''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' میں اقبال نے ایک بزرگی صوفی عبد القدوس گنگوہی کا فقرہ نقل کیا ہے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے نقطہ نظر کی بھرپور وضاحت کی ہے۔ حضرت عبد القدوس گنگوہی سے منقول ہے کہ ''محمد عربی فلک افلاک پر تشریف لے گئے اور واپس آئے۔ لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں اس مقام پر پہنچتا تو کبھی واپس نہ لوٹتا۔''

اقبال فرماتے ہیں:

''تمام صوفی لٹریچر میں اس فقرے سے بہتر الفاظ مشکل سے ملیں گے۔ جن کے ذریعے ایک فقرے کے اندر پیغمبرانہ اور صوفیانہ شعور کے لطیف نفسیاتی شعور کو اس خوبی سے بیان کیا جا سکے۔ صوفی واقعی اپنے انفرادی تجربے کی اس دنیا سے واپس نہیں آنا چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے جیسا کہ اس کے لیے لازمی ہے تو اس کی مراجعت بنی نوع انسان کے لیے کوئی وقعت اور اولیت نہیں رکھتی۔ لیکن نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ واپس آتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وقت کی رو میں داخل ہو کر تاریخ کی متحرک قوتوں پر قابو حاصل کر لے اور اس کے ذریعے مقاصد کا جہان تازہ پیدا کرے۔ صوفی کی انتہا وجدانی تجربہ ہے لیکن پیغمبر کے لیے حقیقت اولیٰ سے روشناسی ان نفسیاتی قوتوں کی بیداری کا پیغام ہوتا ہے جو ایک عالم کو ہلا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ نئی قوتوں کی بیداری سے جس دنیا کی تعمیر ہوتی ہے، اس میں پیغمبر کے مذہبی خیالات و احساسات زندہ حقیقت میں تبدیل ہو جانے کے لیے بیتاب ہوتے ہیں۔''

تقدیر اور مومن:

مسئلہ جبر و اختیار کے متعلق قدیم صوفیا اور علماء کے خیالات کی جھلکیاں اس سے قبل پیش کی جا چکی ہیں کہ ان میں سے اکثر تن بہ تقدیر تھے۔ انہوں نے تقدیر کو پہلے سے بنا بنایا ایک لائحہ عمل قرار دیا جس کی وجہ سے اس کائنات میں انسان مجبور محض تھا۔ اس کا ہر فعل اور عمل خواہ شر ہو یا خیر خدا کی مرضی کے مطابق سرزد ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نظریے کے تحت شر کا ذمہ دار بھی خدا ہی تھا۔ لیکن اقبال کے فلسفہ عمل کے ذیل میں یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ اقبال کا مرد مومن تقدیر کے اس مفہوم کا سخت مخالف ہے اور وہ خود کو اپنی تقدیر کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور عذاب و ثواب کا ضامن وہ خود ہے کیونکہ وہ جبر سے اختیار کی طرف مائل ہے۔ اس کا عمل فی نفس ذاتی، شخصی اور اختیاری ہے اگر بندہ تقدیر کا پابند ہو جائے تو پھر سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ کیونکہ عمل سے خیر و شر کی تمیز مقصود ہو جائے گیا ور ارتقاء کی راہیں مسدود ہو جائیں گی اس لیے وہ اس بات میں عقیدہ رکھتا ہے کہ

ایک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

غرض احکام الٰہی مومن کی تقدیر کے ضامن ہیں۔ اگر انسان کو گفتار و کردار کے ذیل میں خدا نے مختار نہ بنایا ہوتا تو پھر اوامر و نواہی کی حاجت ہی نہ ہوتی مولانا روم سے اس باب میں اقبال نے کسب فیض کیا ہے اور اقبال کا بھی کم و بیش وہی خیال ہے جو مرشد رومی کا۔ اشیاء کے اسباب و علل متعین ہیں۔ آگ جلا دیتی ہے، پانی ڈبو دیتا ہے، گناہ انسان کو اسفل سافلین کے درجے پر پہنچا دیتا ہے۔ خیر کثیر سے اس کی شخصیت پروان چڑھتی ہے اور وہ جنت کا مستحق ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کو خدا نے خیر و شر کا سراغ بتا دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق دونوں راہوں میں سے کوئی اختیار کر لے۔ انجام بہر کیف وہی ہوگا جس کے متعلق خدا نے پہلے ہی سے حکم لگا رکھا ہے۔ لیکن اقبال اپنے عہد کے روایتی مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر کڑھتے ہیں کیونکہ ان کا عمل سلبی ہے۔

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

اقبال تقدیر کے مسئلے کو یوں حل کرتے ہیں۔

اے کہ گوئی، بودنی ایں بود شد
کارہا پابند آئیں بود، شد
معنی تقدیر کم فہمیدہ
نے خودی رائے خدا را دیدہ
مرد مومن با خدا دارد نیاز
''با تو ما سازیم تو با ما ساز
عزم او خلاق تقدیر حق است
روز ہیجا تیر او تیر حق است

ہر کہ از تقدیر خویش آگاہ نیست
خاک او با سوز جاں ہمراہ نیست

''جاوید نامہ'' میں جب زندہ رود تقدیر کے متعلق یہ سوال کرتا ہے

سائل و محروم تقدیر حق است
حاکم و محکوم تقدیر حق است

اقبال کی نظم ''تقدیر'' میں ''ابلیس و یزداں'' کے مکالموں سے یہ بات اور صاف ہو جاتی ہے۔اس نظم میں ابلیس خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ وہ زندانی نزدیک و دور و دیر و زود
حرف استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

ذرا یزداں کا جواب سنیئے!

خدا۔ کب کھلا تجھ پہ یہ راز؟ انکار سے پہلے کے بعد؟
طابلیس۔ بعد ! اے تیری تجلی سے کمالات وجود

جب شیطان نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اس کے بعد اس نے یہ سوچا کہ دراصل مشیت ایزدی یہی تھی کہ مجھے مردود قرار دیا جائے لیکن خدا نے اسے بتلایا کہ جب تجھ پر یہ راز انکار کے بعد کھلا اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ تو انکار کے معاملے میں مختار تھا۔

دراصل صداقت جبر و اختیار کے بین بین ہے۔ انسان ان معنوں میں مجبور ہے کہ خالق کائنات اس کے اردوں اور عزائم کا بھی خالق ہے لیکن عملی زندگی میں ہر آدمی اپنے طور پر مختار ہے۔اس کے اعمال و افعال خود اسی کے ارادوں کے مظہر ہیں۔امر و نہی اور اطاعت و فرماں برداری کے احکام شرعی کی اسی لیے حاجت ہوتی ہے اقبال کہتے ہیں۔

فاش می خواہی اگر اسرار دیں
جز با عماق ضمیر خود مبیں
گر نہ بینی دین تو مجبوری است
ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است
بندہ تا حق رانہ بیند آشکار
برتنی آید زجبر و اختیار

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

جب مرد مومن اپنی مرضی کو احکام الٰہی کا پابند بنا کر مشیت ایزدی کی گھات میں لگا رہتا ہے اور اس کا کوئی فعل خدا کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا تو اس وقت خدا کی مرضی اور بندے کے عمل میں کوئی فرق نہیں رہتا اور مرد مومن اس راز سے بخوبی آشنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ دین کی راہوں پر پختہ عزم و یقین کے ساتھ گامزن رہتا ہے۔شریعت محمدی اس کا مزاج بن جاتی ہے ایسی صورت میں جبر سے اختیار کے سوتے پھوٹتے ہیں اور وہ خود تقدیر الٰہی بن جاتا ہے۔کیونکہ احکام الٰہی کو مومن اپنا مقدر سمجھتا ہے اور مشیت کو اپنے وعدوں کا بہر حال بھرپور پاس ہوتا ہے۔اس لیے جہاں خدا کی مرضی اور مرد مومن کے عمل میں نکتہ اتصال پیدا ہوتا ہے، وہاں تقدیر کی قیود ختم ہو جاتی ہیں۔

پختہ مردے پختہ تر گردد زجبر
جبر مردم خار را آغوش قبر

علامہ اقبال کا تصور تقدیر

اقبال کے فلسفے کی روح خودی ہے اور اگر تقدیر کا وہ مفہوم قبول کر لیا جائے جسے عام مروج معنوں میں ''قسمت'' کہا جاتا ہے تو اثبات خودی یا تعمیر خودی کا مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا اور نفی خودی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔اس ضمن میں حضرت علامہ کے اپنے کلمات یہ ہیں:

''قرآن مجید نے بارہا تقدیر کی طرف اشارہ کیا ہے لہذا ہمیں تقدیر کے مسئلے پر بھی غور کر لینا چاہیئے، بالخصوص اس لیے کہ ''زوال مغرب'' میں اسپنگلر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام خود کی نفی کا خواہش مند ہے۔''

حضرت علامہ کی نظروں میں یہ کائنات آدم کی کارگاہ ہے جس میں اسے اپنے جملہ امکانات اور قوی کو بروئے کار لانا ہے۔انہوں نے اپنی نظم ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' میں بالفاظ ذیل اس عندلے کا اظہار کیا ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ، ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ!

ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ آدم کی یہ کارگہ، یہ دنیا، یہ کائنات خود اپنی جگہ تا حال مکمل نہیں، یہ نہ مسدود ہے نہ مقفل

کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون!

ان کے نزدیک یہ جہاں، جہان نامی ہے چنانچہ ہر لحظہ بڑھتے رہنے والے جہان کی اس کیفیت پر قرآن کے حوالے سے استدلال کرتے ہیں ''کل یوم ھوفی شان'' (ہر روز خدا کسی نئے رنگ، مال، روپ اور دھندے میں ہوتا ہے) یزید فی الخلق مایشاء ''خلق میں حسب منشاء ورضا اضافہ کرتا رہتا ہے''

حضرت علامہ دوسرے خطبے میں فرماتے ہیں اور اس اقتباس کے مطالعے سے ان کی فکر کی نہج کا پتہ بخوبی چل جاتا ہے۔

''ہم اسے (کائنات کو) موجود کہتے ہیں تو ان معنوں میں کہ وہ ایک غیر معین امکان ہے چنانچہ بطور ایک ''نامی کل'' زمانے کا یہی تصور ہے جس کو قرآن پاک نے تقدیر سے تعبیر کیا ہے لیکن جس کو نہ اسلامی دنیا ٹھیک سمجھ سکی نہ غیر اسلامی دنیا۔دراصل تقدیر عبارت ہے اس زمانے سے جس کا انکشاف ابھی باقی ہے۔''

بزبان شعر انہوں نے یہی بات اس طرح بیان کی:

سلسلہ روز و شب، تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
یہ کائنات! ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون!
جہاں اور بھی ابھی بے نمود!

یہ کائنات جسے حضرت علامہ ''نامی کل'' کہتے ہیں، ایک غیر معین امکان اس لیے ہے کہ بڑھنے اور تکمیل کی راہیں طے کرنے کی آزادی ہے۔ اسے یکبارگی کامل وسالم وجامع بنا کر نہیں بھیج دیا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر زمانہ تخلیق کے جوہر سے محروم ہوتا۔ اور اس کا دوران محض گردش بر کار ہوتا، جس کا مطلب ہے تکرار محض۔ یہی باعث ہے کہ وہ طشے کے نظریہ Eternal Recurrence کو محض Eternal Repitition قرار دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ''کڑی میکانیت'' اس مضمون کو ان کے اپنے بیان میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے:

''قرآن پاک کا ارشاد ہے ''کل یوم ھوفی شان'' لہٰذا زمان حقیقی کی زندگی زمان مسلسل کی زنجیروں سے ذادی اور ابداء کا عمل ہے اور اس لیے تخلیق کا فعل بھی آزادی کا فعل ہے کیونکہ تخلیق تکرار کی ضد ہے اور تکرار خاصہ ہے میکانیاتی طریق کار کا۔''

نظم ''زمانہ'' کا ایک شعر ہے۔

مری صراحی سے قطرہ قطرہ لئے حوادث تپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

اب اگلا مرحلہ آتا ہے، تکرار سے تو انکار ہو چکا لیکن کیا مخلوقات کا ممکنات کو کسی بندھے بندھائے انداز میں اور ضابطے کی کڑی زنجیروں میں کس کے خارج کے ہر لحظہ سے حکم دیا جاتا ہے یا ادب سکھایا جاتا ہے یا خود پر سے کے اندر وہ جوہر ودیعت کر دیا گیا ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے تکمیلی مراحل خود اپنے اندر سے اور اپنی ذات میں طے کر رہا ہے۔ حضرت علامہ خود زمانے کو امکان غیر معین جانتے ہیں اور کارخانہ قدرت کو قوانے ذاتی سے مالا مال جانتے ہیں جو اندرونی زور نمو سے بروئے کار آتی رہتی ہیں۔

حضرت علامہ کے الفاظ میں:

''ہم زمانے کی حرکت کا تصور ایک پہلے کھینچے ہوئے خط کی شکل میں نہیں کریں گے کیونکہ یہ خط ابھی کھنچ رہا ہے اور اس سے مطلب ہے وہ امکانات جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں اور ہو سکتا ہے نہ آئیں۔''

یہ وقوع میں آئیں یا نہ آئیں Open Possibilities کا ترجمہ ہے (آپ جائیں تو اس کا ترجمہ ''غیر معین امکانات'' کر لیں) اسی نکتے کی وضاحت کے طور پر سطور ذیل بھی ملاحظہ ہو جائیں۔

''وہ ہستی جس سے اس کو جزو وکل کا سا تعلق ہے اس میں اضافہ ممکن ہے، ہم اس کو غیر محدود کہتے ہیں تو ان معنوں میں کہ اس کی وسعت پر کوئی حد قائم نہیں کی جا سکتی، یعنی وہ غیر محدود ہے تو بالقوۃ، بالفعل نہیں اور اس لیے فطرت کا تصور بھی ایک زندہ اور پر لحظہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی وحدت نامیہ کی حیثیت سے کرنا چاہئے جس کے نشو ونما پر ہم خارج سے کوئی حد قائم نہیں کر سکتے۔ اس کی کوئی حد ہے تو داخلی، یعنی وہ ذات مشہود جو اس میں جاری وساری ہے اور جس نے اس کو سہارا دے دیا ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے: ون الی ربک المنتھیٰ۔''

یہ ہے اس جہاں کی کیفیت وفطرت جس میں آدم کو بسایا گیا ہے۔ یہ جہاں آدم کا تربیت کدہ بھی ہے اور تجربہ گاہ بھی۔ اسے اپنی جملہ صلاحیتوں کی مدد سے یہاں اپنا مقام آپ پیدا کرنا ہے۔ ہر فرد آدم ایک ذمہ دار ہستی ہے، ہر ایک کو اپنے عمل کا بھار خود اٹھانا ہے ''ان لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ'' اور قیامت کے روز خدا کے حضور بھی ہر ایک کو فرداً فرداً جانا ہے۔ وکلھم اتیہ یوم القیمۃ فردا۔

واضح ہے کہ اگر اسے قیامت کے روز اپنے ذاتی نامہ اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے تو یہ جواب دہی اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک یہ بات مان نہ لی جائے کہ آدمی پر اس کے اعمال کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ پسند وناپسند کا مالک ہے، وہ صاحب نظر وارادہ ہے، اور وہ انتخاب واختیار (Choice) کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے۔ اگر وہ بیدار ہے اور تعمیر ذات کے لیے سرگرم ہے تو اس کی حیثیت کچھ اور ہے اور اگر وہ غافل ہے اور کم ہمتی وضعف ارادہ کا مظاہرہ کرتا ہے تو محروم رہتا ہے۔ بزبان ''زمانہ'' یوں کہہ لیجئے:

ہر ایک سے آشنا ہوں، لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ
نہ تھا اگر تو شریک محفل، قصور تیرا ہے یا کہ میرا
مرا فلسفہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مے شبانہ!

حضرت علامہ کی ''تشکیل جدید'' کے پہلے خطبے کی پہلی سطور ہی یہ ہیں۔

''یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے اور ترکیب کیا ہے؟ کیا اس کی ساخت میں دوامی عنصر موجود ہے؟ ہمیں اس سے کیا تعلق ہے اور ہمارا اس میں کیا مقام ہے؟ باعتبار اس مقام کے ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟''

اس آخری جملے سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ آدم کو معنوی اعتبار سے کوئی بنا بنایا اور بندھا بندھایا وجود نہیں جانتے کہ جس طرح بنایا گیا بن گیا، جس طرح باندھ دیا گیا بندھ گیا۔ یوں کہ اس میں ارتقاء وکمال کی کوئی اہلیت، ہمت اور عزیمت موجود نہیں۔ ''ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟'' تقاضا کرتا ہے کہ اپنے طرز عمل کی تعین خود آدم ہی کو کرنا ہے، اختیار (Choice) اس کا اپنا ہے۔

حضرت علامہ نے ''تقدیر'' کی اس تعبیر سے سخت اختلاف کیا ہے جسے عرف عام میں قسمت کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اس اختلاف کا اظہار تلخ لہجے میں کیا ہے۔ تقدیر کی اس عام اور مروج تعبیر کا مفہوم تو یہ ہوا کہ آدمی دنیا کے میدان عمل میں وارد ہو کر بھی آزادی عمل کا حق نہیں رکھتا، اسے جیسا بنا کر ارسال کر دیا گیا ہے ویسا ہی رہتا ہے جس کے نتیجہ میں بڑے اعتماد کے ساتھ فرض کیا جا سکتا ہے کہ جو مقدر ہے وہ تو ہو کر رہے گا، سعی وسرگرمی بے سود ہے۔ نہ حال سنوارا جا سکتا ہے نہ مستقبل۔ اسی طرح نہ حال بگاڑا جا سکتا ہے نہ مستقبل۔ یہ وہ کیفیت ہے جسے ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا'' ہونا قرار دیا جائے گا اور اسی کیفیت کا پیدا کردہ وہ رویہ تھا کہ مسلم ملت ''تن بہ تقدیر'' ہو کر بیٹھ رہی اور مغرب کی مادہ پرست قوموں نے اٹھ کر ان کا چارج سنبھال لیا۔

فرنگی صید بست از کعبہ و دیر
صدا از خانقاہان رفت 'لاغیر'
حکایت پیش ملا باز گفتم!
دعا فرمود 'یا رب عاقبت خیر'

یہ خیال یا عقیدہ ''نفی خودی'' کا متضمن ہے۔ اس خیال کے حامی افراد ولولے اور عزم کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی حیثیت جمادات ونباتات کی سی ہو کر رہ جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ نباتی وجمادا تی حیثیت اس حیثیت سے نہایت پست ہے جو آدمی کو نیابت الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے باعث حاصل ہے۔

اقبال کی خودی پر ایک مضمون 20 اپریل 1958ء کو روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' میں شائع ہوا۔ اسے خلیفہ عبدالحکیم نے لکھا ہے اور اس میں علامہ اقبال کے تقدیر اور خودی کے تصور کو انہوں نے بہت عمدہ طریقے سے پیش کیا۔ یہاں کچھ حصہ دیا جا رہا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

Iqbal's concept of God has devilated very much from the common Muslim belief. For him there is no fore-knowledge in the mund of God of a detailed plan of creation which has to realise itself in the processes of time. Socrates, Plato, Aristotle and their Muslim followers like

Ibn-e-Sina and Farabi said that all real knowledge is knowledge of universals only and tehrefore God has no knowledge of the particulars. Iqbal in company with Bergson has advanced a steop furhter and says that God could not be creative if he were merely implementing a plan that existed from eternity: His activity is free Iqbal dentes any predestination and any divine knowledge of it. This makes man also free although within great limitations; man is destined to be an architect of his own fate. It is his destiny to realise his potentialities free, free from the mechanical compulsion of the physical universe and free from any compelling will of God. God created man in His own image and therefore he must share God's attribute of freewill. According to the Quran humanity and freedom of will emerged at the same tiem. Man's first act of disobedience was an announcement of this fact. It was the dangerous and risky gift of free will which the rest of the creation refused to accept; man accepted it, although if improperly used it may make him sink to the lowest abyss: through ignorance and tyranny. Again to quote the Quran. God could have made everyone a beliver but He did not choose to creat virtuous automations. It is the purpose of man's life to unify his will with the will of God but this lifeexalting surrender must be a voluntary act of a free being. Progress of life is progress in freedom.

خیر وشر:

مردمومن کا ہر عمل خدا کی مرضی کے عین مطابق ہے۔اس کی خودی خدا آشنا، اس کا عشق خدا کا رفیق اس کی اداخدا شناس اور وہ خود خدا مست ہے۔ایسی حالت میں اس کے عمل میں خیر وشر کی تلاش الگ عنوان سے تحصیل حاصل کرنے کے مترادف ہے کیونکہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ مردمومن سرلپا خیر ہے اور سنت نبوی پر کاربند ہے۔پھر بھی اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال کا مردمومن اعمال قبیحہ اور اعمال صالح کیشناخت کے لیے ایک تجرباتی میزان بھی رکھتا ہے اور جہاں خیر وشر کی شناخت میں التباس کا خوف ہوتا ہے وہاں وہ اپنے عمل کو اسی میزان پر رکھ کر پرکھتا ہے۔کیونکہ خیر وشر دو مختلف دھارے ضرور ہیں لیکن دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔دونوں کا ماخذ حیات ہے اور حیات ہر لحہ متغیر ہے۔جس عمل سے حیات داخلی یا خارجی طور پر مجروح اور ضعیف ہوتی ہے یعنی جو اعمال اسے خدا سے دور رکھتے ہیں ابلیس سے قریب تر کر دیتے ہیں وہ شر ہیں اور جن سے اس کی شخصیت پر نکھار آتا ہے وہ خیر ہیں۔

''اقبال ہی کے نزدیک وہ تمام افعال و اعمال جو تشکیل و استحکام خودی میں معاون ہوں، خیر ہیں اور اس کے برعکس اگر خودی کو کمزور و ضعیف کرنے کا باعث ہوں، شر ہیں''

اقبال کے لفظوں میں اس کی صراحت سنئے:

''انسان سے متعلق یہ تصور کہ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جو لامحدود قوت کی حامل ہے، قرآنی تعلیمات کے نقطہ نظر سے انسانی اعمال کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔وہ چیز جو انسان کے اندر شخصیت کے احساس کو تیز کر دے، خیر ہے اور جو اسے کمزور کرنے کا باعث ہو، وہ شر ہے۔اس طرح اقتدار قوت اور استحکام فضائل یا اخلاقی خوبیاں ہیں اور اس کے برعکس کمزوری اور ناتوانی برائی ہے۔''

اپنے ایک مقالہ ''خلافت اسلامیہ'' میں بھی اقبال نے لکھا ہے کہ احترام ذات اور ارتقائے ذات کا اصول اخلاقیات اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔

''اخلاقیات اسلام کا تمام دارومدار اس واحد مسئلہ پر ہے کہ فرد من حیث الفرد کیا حیثیت رکھتا ہے۔زندگی کا کوئی طرز عمل یا رویہ جو فرد کے آزادانہ ارتقاء و عروج کے راستے میں حائل ہو، وہ شریعت اسلامیہ اور اخلاقیات اسلام کے قطعاً خلاف ہے۔''

عمل:

اقبال کے مردمومن کے تمام فلسفے کی بنیاد عمل ہے۔بے عملی کو تو وہ زندیقی کے مترادف سمجھتا ہے۔مردمومن ایمان اور عمل کا موازن مرکب ہے۔عرفان خداوندی کے بعد عمل ہی سے اس کی شخصیت کا تعین ہوتا ہے، عمل ہی کا شرعی نام جہاد ہے۔عمل راز حیات اور سر کائنات ہے۔عمل ہی سے افراد بنتے اور قومیں سنورتی ہیں۔مردمومن عمل کا زندہ پیکر ہوتا ہے۔اس کی قوت، ہمت، حوصلہ، شجاعت، عزم، استقلال، ثبات، جوش، ولولہ، علوظرف اور بلند ہمتی۔سب کے سب اس سے عمل مسلسل کے متقاضی ہیں اسی لیے اسے بار بار عمل کی تلقین کی جاتی ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

کانپتا ہے دل ترا اندیشہ طوفاں سے کیا
ناخدا تو ،بحر تو کشتی بھی تو ،ساحل بھی تو

دائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مئے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا
ہر قطرہ ہے بحر بیکرانہ

دہقاں اگر نہ ہو تن آساں
ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ

روز و شب آئینہ تدبیر ماست
روز و شب آئینہ تقدیر ماست
با تو گویم اے جوان سخت کوش

ہر کہ خود را صاحب امروز کرد
گرداد گردد سپہر گرد گرد

ادبہان رنگ ربور آبر دست
دوش ازو، امروز از و فردا زوست

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج زکود رفتہ، تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم، گر نہ روم نیستم

خلاصہ یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک بقائے شخصی، ارتقائے ذات اور خدا شناسی کے لیے عمل کی اتنی ضرورت ہے کہ وہ کاہل اور نکمے انسانوں کو زمین پر ایک بار گراں تصور کرتا ہے۔ زندگی کی دلیل ہی جہد مسلسل ہے جو زندگی زمانے کے دوش بدوش نہیں چلتی، زمانہ اسے اپنی دست برد سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اور جو زندگی اپنے عمل کے ذریعے ہر لحہ شریک تخلیق ہے وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد اور لافانی ہے اقبال کے مطابق شخصیت کے استحکام کا انحصار عمل پر ہے۔ خودی کی بلندی اور انفرادیت کی تکمیل عمل کے بغیر ناممکن ہے۔ علاوہ کہ مرد مومن محض عمل کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ عمل کا مقصد خارجی اور باطنی فتحمندیوں کے علاوہ انفرادیت کی بقا ہے۔ بقول اقبال

''انسان کی زندگی کا مقصد اولیٰ عمل ہے۔ قرآن کریم میں جہاں یہ ارشاد ہے کہ جن اور انسان کی تخلیق کا مقصد خدا کی عبادت کرنا ہے، وہاں عبادت کا مطلب عمل ہے، چھوٹے پیمانے پر ہر انسان خالق ہے اور تخلیقی قوتوں کو ختم کرنا ایک زبردست گناہ ہے۔ رسول اقدس کی اس دنیا میں تشریف آوری کا مقصد لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ عمل خیر ہے اور فقدان عمل شر ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا خیال کیے بغیر جدوجہد جاری رکھو۔''

شان مومن:

فقر، شاہینی، قلندری، درویشی اور حریت فلسفہ خودی، عشق اور عمل سے وابستہ مومن کی شخصیت کے اور کتنے ہی گوشے ایسے ہیں جو اس کے نیابت الٰہی کے درجے پر فائز ہونے میں معاون ہیں۔ اس کے کردار کی ان جہتوں کو مختصر طور پر واضح کرنے کے لیے ہم نے یہ ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں۔ فقر، قلندری شاہینی، درویشی اور حریت پسندی کی شانیں ہی مرد مومن کو دوسرے تمام قسم کے کرداروں سے ممتاز کرتی ہیں۔

فقر:

''فقر'' طریقت کی ایک اصطلاح ہے جسے اقبال نے قطعی الگ معنوں میں استعمال کیا ہے کیونکہ وہ خود صوفیانہ طریقہ کار کا من وعن قائل نہیں۔ اقبال کے مطابق شریعت کو پرکھنے اور بہ نظر تعمق اس پر عمل کرنے کا نام ہی طریقت ہے۔

پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن با عماق حیات
تا بہ بینی زشت و خوب کار چیست
اندرایں نہہ پردہ اسرار چیست
ہر کہ از سر نبی گیرو نصیب
ہم بہ جبریل امیں گردد قریب
اے کہ می نازی بہ قرآن عظیم
تا کجا در ہجرہ می ہاشمی مقیم
در جہاں اسرار دیں را فاش کن
نکتہ شرع مبین را فاش کن

کس نہ گردو در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبین ایں است و بس

اقبال فقر کو بہت اونچا درجہ دیتے ہیں۔ فقر کو عام طور پر بیکسی مسکینی اور مجبوری کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اقبال فقر و استغنا سے وہ بے نیازی مراد لیتے ہیں جسے مادی وسائل کی موجودگی اور غیر موجودگی کا خیال تک نہ ہو۔ اگر یہ وسائل ہوں تو اچھا اور اگر نہ ہوں تو بھی اچھا۔ اگر وہ موجود ہوں تو ان کی موجودگی کے باوجود انسان ان میں گھر کر نہ رہ جائے۔ وہ ان سے بے نیاز ہو نہ کہ ان کے متعلق فکرمند۔ وہ انہیں حاصل کرنے یا ان کی حفاظت کے لیے اعلیٰ اقدار کو قربان نہ کرے بلکہ یہ تمام دنیاوی چیزیں اس کے قبضے میں اس کی اعلیٰ اقدار کی بنا پر آ جائیں لیکن اس کے باوجود وہ ان سے بالکل بے نیاز ہو۔ اس بے نیازی اور مجبوری میں نہ صرف اختلاف بلکہ تضاد ہے۔ جیسا کہ اقبال نے اپنی نظم ''فقر'' (بال جبریل) میں بتایا ہے، اس لفظ کے معنی اسی کتاب میں ایک غزل میں پوری طرح بیان کیے گئے ہیں۔

غزل پیش خدمت ہے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ
علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جو یائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقام نظر، علم مقام خبر
فقر میں مستی ثواب علم میں مستی گناہ
علم کا مقصود اور فقر کا مقصود اور
اشہد ان لا الہ اشہد ان لا الہ
چڑھتی ہے جب فقر کی شان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینہ مہر و ماہ

فقر:

ایک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
ایک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
ایک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
ایک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

غرض فقرنا داری اور بے کسی کا نام نہیں بلکہ یہ مرد مومن کی ایک ایسی شان ہے جس کے ذریعہ اس کے قدموں تلے بادشاہی لوٹتی ہے لیکن وہ بادشاہ نہیں بنتا۔ اسے حوریں دعوت نظارہ دیتی ہیں لیکن وہ اغماض سے کام لیتا ہے۔ اس کے قدموں تلے ساری دنیا کی دولت رکھ دی جاتی ہے لیکن وہ اس سے بے نیاز رہتا ہے۔ وہ محرم راز دردن میخانہ ہونے کی وجہ سے ان تمام چیزوں کو کم اہم تصور کرتا ہے اور اسی عفت قلب ونگاہ کی وجہ سے اس میں مسیحائی اور کلیمی کے خواص پیدا ہوتے ہیں اور اس پر اسرار شہنشاہی کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس فقر کی تلاش کہیں دور کرنے کی حاجت نہیں۔ بس یہ فقر بھی فقیر دو جہاں، تاجدار مدینہ کے اس فرمان کے تابع ہے کہ ''الفقر فخری'' (فقیری پر مجھے فخر ہے) عشق رسول کے باعث مرد مومن کو یہ میراث نصیب ہوتی ہے۔ یہ فقر ایسی فقیری سکھاتا ہے جس کے سامنے ساری دنیا کی بادشاہت ہیچ پوچ ہے۔

فقر خو ماہی از تہی و سنی منال
عافیت درحال دنے درجاہ و مال
صدق و اخلاص دنیا ز و سوز و درد
نے زرد وسیم و قماش سرخ و زرد

فقر کا تعلق مادیت سے نہیں بلکہ وروحانیت سے ہے یہ قلب ونگاہ اور روح کی ایک مستانہ ادا ہے جو بڑی دلفریب ہے جس کے جلو میں ''صدق و اخلاص دنیا ز وسوز و درد'' ہے۔ خالصتاً اسلامی اصطلاح میں فقر کی قوت اور شوکت دیدنی ہے۔

باسلاطین در فتد مرد فقیر
از شکوہ بوریا لرزد سریر
از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر
دار ہاند خلق را از جبر و قہر
می نگیر و جزباں صحرا مقام
کاندرو شاہین گریز داز حمام
قلب اور قوت از جذب و سلوک
پیش سلطاں نعرہ اولا ملوک

توحید خالص:

فقر کی شان یہ ہے کہ ایک بوریا نشین سے قیصر و کسریٰ لرزتے ہیں۔ وہ توحید خالص کا اس درجہ عرفان حاصل کر لیتا ہے کہ ''پیش سلطان نعرہ اولا ملوک'' کی مصداق ہوتا ہے۔ دنیا سے آمریت کو ختم کر کے یہ فقر ہی حکومت الٰہی کا قیام کرتا ہے۔ اور اللہ کی زمین پر غیر اللہ کی حکومت کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔

چیست فقر اے بندگان آب و گل
یک نگاہ راہ میں ایک زندہ دل
فقر ، کار خویش را سنجیدن است
بر دو حرف لا الٰہ پیچیدن است
فقر خیبر گیر با نان شعیر
بستہ فتراک اور سلطان و میر
فقر ذوق و شوق ست و تسلیم و رضا ست
ما امینم ایں متاع مصطفٰے است
فقر بہ کرد بیاں شجوں زند
بر نو ایس جہاں شجوں زند
بر مقام دیگر انداز و ترا
از زجاج الماس می ساز و ترا
برگ و ساز اور قرآن عظیم
مرد درد ریشے نہ گنجد ور گلیم

فقر قرآں، احتساب ہست دبود
نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقر مومن چیست تسخیر جہات
بندہ از تاثیر اومولا صفات

یعنی فقر توحید کا رازدار اور متاع مصطفوی کا امین ہے صدق واخلاص ونیاز وسوز، درد وداغ، ذوق وشوق، تسلیم ورضا اور تسخیر جہات کے عناصر کی امیزش سے پیدا ہوتا ہے۔

شاہینی:

''شاہینی'' بھی فقیری کی طرح تسخیر جہت اور جہاں بینی اور دور اندیشی کا ایک علامتی پیکر ہے۔ یہ علامتی پیکر بھی مومن کی فقیرانہ شان کا غماز ہے۔ شاہین کی علامتی اہمیت کے متعلق کود اقبال لکھتے ہیں:

''شاہین کی تشبیہہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ 1۔ خوددار اور غیرت مند ہے کہ اوروں کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ 2۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ 3۔ بلند پرواز ہے۔ 4۔ خلوت پسند ہے۔ 5۔ تیز نگاہ ہے۔''

شاہین کی بے تعلقی اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں وطن پرستی کے دام میں گرفتار ہیں۔ فقط امت محمدیہ ہی جغرافیائی حدود سے ماورا کسی سرزمین کی بجائے اسلامی عقیدے کو اپنا مامن تصور کرتی ہے۔ اس طرح اس کا وطن کا تصور جغرافیائی نہیں بلکہ خالصتاً مذہبی اور روحانی ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقی بھی ہے۔ عقل خود بیں کا یہ قائل نہیں، لیکن جہاں بینی اس کی فطرت ہے۔

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است
بال بلبل دگرد بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آنکہ بر دوانہ افتادہ زخاک
آں کہ گیر و خورش ازدانہ پردیں دگر است

شاہین میں جلالا کے پرتو موجود ہیں اور یہی مومن کے مزاج کا نمایاں عنصر ہے لہذا شاہینی کے بعد ہی اس سے جمال کی توقع کی جا سکتی ہے دوسرے طیور نے اپنے اندر جمال کی صفت پیدا کر لی ہے جس کا تعلق مومن کی حرکی مزاج سے نہیں ہے اسی لیے اسے شاہینی مرغوب ہے۔

بہ پرواز او شاہینی بیا موز
تلاش دانہ در خاشاک تا کے
کر بلال و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

شاہین اپنی بلند پروازی کے سبب کائنات کا احتساب اس انداز میں کرتا ہے کہ اس میں بلندی وپستی کے تمام اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔ وہ وجود کی تاریک گلیوں میں کھو نہیں جاتا بلکہ زندگی کے تمام احوال ومقامات سے آشنا ہوتا ہے۔

ہمت ہو پرکشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا ہے تو نام اس کا آسماں
زیر پر آ گیا تو ہی آسماں زمین

''بال جبریل'' میں ''شاہین'' کے عنوان سے جو نظم ہے، اس میں فقر کی بھرپور وضاحت ملتی ہے اور شاہین کے پیکر میں مردِ فقیر نظر آنے لگتا ہے۔

شاہین:

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارہ
جہاں رزق کا نام ہے آب دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل
نہ بیماری نغمہ آشیانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ان کی بہت دلربانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہو کاری
جوانمرد کی ضربت غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اس خاکداں سے شاہین اس لیے کنارہ کش ہے کہ یہاں محض شکم پروری ہی کو سب کچھ تصور کیا جاتا ہے۔ پیٹ بھر جانے سے روح بھی آسودہ ہو جائے یہ ضروری نہیں، روح کی غذا کچھ اور ہے۔ اس لیے روح کی آسودگی کے لیے مردِ مومن شاہین کی طرح خلوت اختیار کرتا ہے اور بیابانوں کی تنہائی میں اپنے ہی وجود سے لطف اندوز ہوتا ہے نہ اسے نغمہ، مطرب کی ضرورت ہے نہ اسے بہار و خزاں سے واسطہ خیابانیوں کی دلربا ادائیں اس کے تصورات میں خلل انداز ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ ان سے گریزاں ہے کیونکہ تعمیرات ذات کے مرحلوں میں رنگ و بو سے زیادہ روح کی گہرائیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بیاباں کی وسعت اور صحت پرور فضا شاہین کے بال و پر کو توانائی بخشتی ہے۔ مردِ مومن بھی باطن کے پنجے مروڑنے کی خاطر بیابانی ہوتا ہے اور خود کو اس لائق بناتا ہے کہ غیر خدا سے پوری قوت کے ساتھ ٹکرا سکے۔ شاہین کو در اصل کبوتر کی خون آشامی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ اس پلٹنے اور جھپٹنے میں اس کا یہ مقصد پوشیدہ ہوتا ہے کہ لہو کی حرارت برقرار رہے۔ کیونکہ خون کی سردی موت کے مترادف ہے۔ قناعت اور توکل بھی اس کا شعار ہے۔

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کار آشیاں بندی

درویشی قلندری:

قلندری بھی فقر سے مماثل مردِ مومن کی ایک صفت ہے البتہ فقیر کی بہ نسبت قلندر کا انداز نظر کسی حد تک زیادہ رومانی ہے۔ درویشی اور قلندری میں بڑا نازک فرق ہے۔ در اصل شاہین، درویش، قلندر، فقیر اور مرد حر سب کے سب مردِ مومن کے احوال و مقامات کی مختلف شانوں کی غمازی کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان علامتوں میں مردِ مومن کی پوری شخصیت کی جھلک بھی نظر آتی ہے لیکن ان میں کسی ایک علامت میں مردِ مومن کے کردار کے تمام پہلوؤں کی سمائی نہیں ہو پاتی۔ ہاں مومن کے تیور کبھی کبھی روپ ان میں جھلکتے ہیں۔ لہٰذا ان اصطلاحوں کو مردِ مومن کے کردار کے مختلف پہلوؤں سے الگ ہٹا کر پرکھنا قرین انصاف نہیں ہے۔

''انسان کامل کے لیے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اقبال درویش کی علامت بھی استعمال کرتے ہیں۔ تصوف کی اصطلاح میں درویش وہ ہے جو علائق دنیوی سے بالکل کنارہ کر چکا ہو اور یوں خلوت گزیں ہو گیا ہو کہ کائنات سمٹ کر اس کے اندر سما گئی ہو۔ یہ وہ منزل ہے جہاں سے سالک اور طالب حقیقت مقام فنا کی طرف بڑھتا ہے۔ عجمی تصوف میں درویشی سے جو تصورات وابستہ ہیں وہ کم و بیش بے عملی کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے کلام میں درویش کے تصور میں بے عملی کا شائبہ تک موجود نہیں ہو سکتا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ درویشی اور قلندری مکمل انسانیت کی دو منزلوں کے نام ہیں۔ درویش کے مرحلے پر انسان کامل خلوت گزیں ہو جاتا ہے لیکن مقصد یہ ہوتا کہ یکسوئی حاصل کر کے تسخیر کائنات کی طرف متوجہ ہو۔ ظاہر ہوگا کہ قلندر کے مقابلے میں اقبال کا درویش بے عمل تو نہیں، لیکن کم عمل ضرور ہے۔ اسی کی وجہ یہ ہے کہ درویشی کے مرحلہ پر اقبال طالب حقیقت کو تفکر کے مرحلوں سے گزارتا ہے، قلندری عمل کا مقام ہے، درویش ہونے کی وجہ سے طالب نے جو کچھ سوچا ہے، قلندر ہونے کی وجہ سے ایک شکل خارجی دیتا ہے۔ بالفاظ یوں کہا جا سکتا ہے کہ درویشی کے مرحلے پر وہ دنیائے نو جو انسان کو تعمیر کرتی ہے، ذہن میں صورت پذیر ہوتی ہے، قلندری کے تمام پر یہ دنیا خارجا صورت پذیر اور متشکل ہو جاتی ہے۔ درویشی کا تعلق تحصیل علم، یکسوئی، خلوت گزینی اور مراقبے سے ہے قلندری کا عمل ہے اور متعلقہ کوائف سے

مذکورہ بالا بیان اس قدر سلجھا ہوا ہے کہ اس پر مزید کسی بحث کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

''درویشی'' کو بھی اقبال نے ایک نیا رنگ دیا ہے۔ صوفیا کے یہاں درحقیقت جو پورا مردِ مومن تھا وہ اقبال کے یہاں آتے آتے محض درویش رہ گیا۔ یعنی وہ جہاں ہیں اور خدا ہیں تو ہو گیا، لیکن اس نے باعمل ہو کر اپنے تجربات اور اپنی شخصیت سے نیابت الٰہی کے فرائض انجام دینے سے گریز کیا اور اس کی ذات کے کئی مرحلے صوفی خلوتوں ہی کی نظر ہو گئے۔ حق تو یہ تھا کہ جب اس نے اپنی ذات کو پختہ تر بنا لیا تو اسے فکر و عمل کی تجربہ گاہ میں پرکھنا چاہئے تھا۔ خدا کا نصب العینی آدم اسی صلاحیتوں کو عملی جامہ پہنانے اور نائب ہونے کی حیثیت سے اس دنیا کو سنوارنے میں اس کا شریک کار ہے۔ لیکن درویش ایک منزل ہے مقصد نہیں۔ اقبال نے جتنی بھی صوفیانہ اصطلاحیں اپنی شاعری میں استعمال کی ہیں۔ تقریباً سب کی قلب ماہیت کر دی ہے۔ اس لیے قدیم علامتوں کے پرانے مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے اقبال کو سمجھنے میں غلط فہمیوں کا شکار ہونے کا خطرہ ہے۔ در اصل مردِ مومن کے تصور سے وابستہ ہو کر تمام علامتیں یا جبی پہلو کی حامل ہو جاتی ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مردِ مومن کے لیے درویشی محض قلندری کا دیباچہ ہے۔ درویشی ایک منظم اور محسوس منصوبہ ہے جسے قلندری عملی جامہ پہناتی ہے لیکن اقبال کے یہاں ان دونوں صفات کا مردِ مومن کی شخصیت میں امتزاج موجود ہے کیونکہ اقبال کے سامنے رسول اکرمؐ کی زندگی ہے۔ نبوت سے قبل حضورؐ نے غار حرا کو اپنی خلوتوں سے سجایا تھا اور نبوت کے درجے پر فائز ہونے کے بعد ساری دنیا کو بلکہ دونوں عالم کو تمام نوع انسانی کے علاوہ ساری خدائی کو اپنے فیوض سے مالا مال کر دیا۔ ''بال جبریل'' میں درویشی کا ذکر اقبال یوں کرتے ہیں:

این راز ہے مردان حر کی درویشی
کہ جبریل سے ہے اس کو نسبت خویشی
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

درویش کا تعارف خود اس کی زبانی سنیے

خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دل نہ صفاہاں نہ سمر قند

درویشی میں تدبر و تفکر کا انداز ہوتا ہے۔اس کی تشریح مندرجہ ذیل اشعار میں کی گئی ہے۔

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشہ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز
اے حلقہ درویشاں وہ مرد خدا کیسا
ہے جس کے گریباں میں ہنگامہ دستاخیز

خلوت گزینی اور تنہائی میں درویش کے احوال ومقامات ملاحظہ ہوں:

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبریل دے تو کہوں
نہ تو زمین کے لیے ہے نہ اسماں کیلئے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کیلئے
مرے گلوں میں ہے ایک نغمہ جبریل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کیلئے

درویش اور قلندر کے درمیان اقبال کے یہاں جو نازک فرق ہے۔اس کی وضاحت کے دوران دونوں کی صفات واضح ہوچکی ہیں اور دونوں کا مزاج بھی سامنے آچکا ہے۔دونوں مرد مومن کی دو منزلیں ہیں۔درویش کے مزاج میں خلوت گزیں، بے نیاز اور بے تعلقی ہے، وہ علم کے نور سے معمور ہے۔لیکن دنور حیات سے سرشار نہیں۔قلندری اس کے بعد کی منزل ہے۔اس لیے اس کے تیور میں تیکھاپن ہے کیونکہ نظریات میں جب ذوق نمونہ پیدا ہوتا ہے بھی وہ عمل کے پیکر میں ڈھلتے ہیں۔اس مرحلے میں جو نفسیاتی تناؤ اور درستگی ہوتی ہے وہ قلندر کے مزاج میں موجود ہے۔یہ اپنی خودی اور جذبہ عشق سے سرشار ہوکر جہاں میں تیشہ بدست پھرتا ہے اور غیر اللہ کو قلندرانہ شعان کے ساتھ صفر ہستی پر پسپا کرتا ہے۔مراتب کے اعتبار سے قلندری درویشی سے افضل ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

''ضرب کلیم'' میں ''قلندر'' کے عنوان سے اقبال کی نظم قلندر کی صفات کا مکمل خاکہ پیش کرتی ہے

قلندر کی پہچان:

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندہ حق تو بھی ادھر جا
ہنگامے میں مرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا بنگاہ قلندر سے گزر جا
میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا
توڑا نہیں جا دو مری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرات تو مکر جا
مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

مرد مومن کی ذات میں جب قلندرانہ شان جلوہ گر ہوتی ہے تو وہ عملی دنیا میں قدم رکھتا۔ قانون الہیہ کے ''لا الہ'' کے پہلو پر پورے عزم ویقین کے ساتھ کاربند ہوتا ہے۔''لا الہ'' اس کی معاشرتی اور خارجی زندگی میں کام آتا ہے اور فرعونیت کا خاتمہ کرتے وقت جذب ومستی کا یہ خمیر بیدردانہ اور بیباکانہ قدم اٹھاتا ہے۔درویشی کے بعد یہ سروری کی صفت ہے۔اس مرحلے میں مرد مومن میں غضب کا قلندرانہ بانکپن ہوتا ہے۔وہ اپنی قوت اور ہمت کے سامنے تمام مظاہر فطرت کو انتہائی حقیر سمجھتا ہے اور اسکا یہی انداز ہے ''لا الہ'' کے نعوذ میں مدد کرتا ہے یہ فعال پیکر بڑا البیلا اور غضبناک ہے۔باطل کی تمام قوتوں کو اس کے اشاروں پر چلنا ہوگا۔اور اس کی تقلید کرنی ہوگی کیونکہ اس کی شخصیت اس قدر ہنگامہ خیز ہے کہ اس کے سامنے دوسری کسی قوت (باطل) کا استحکام غیر یقینی ہے۔ جو قوتیں اس کے زور بازو کا اندازہ کر لیتی ہیں، وہ تصادم سے منحرف ہوکر نظر میں بچا کر اس کی زد سے نکل سکتی ہیں۔کیونکہ یہ خالق طوفان بھی ہے اور کشتی وملاح کا محتاج نہیں۔اس لیے سیل رواں کو بھی متنبہ کرتا ہے کہ وہ مزاحم ہونے کی بجائے تھم جائے۔ورنہ ''ہر فرعونے راموسیٰ'' کی عملی تشریح سامنے آجائے گی۔اس کی تکبیر کے سامنے سامری کے تمام جادو کے سانپوں کو چاہئے بل پکڑ لیں۔ورنہ بصورت دیگر سوکھی ہوئی لاٹھی انہیں نگل جائے گی۔قلندر کی نگاہ محض اس مادی کائنات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ ستاروں سے آگے کے جہانوں کا بھی محاسبہ کرتا ہے۔ایسا اس لیے ممکن ہے کہ وہ زمانے کا کھلونا نہیں ہے بلکہ خود زمانہ اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔غرض قلندر بیباک، نڈر، طاقتور، سرمست ہونے کے علاوہ اپنے اندر بھرپور روحانی قوتیں بھی رکھتا ہے۔اسے حکومت کے قیام میں کوئی طاقت نہ تو ٹوک سکتی ہے اور نہ زمانے کا کوئی موڑ اسے روک سکتا ہے۔

حریت:

''انسانی سیرت وشخصیت کی انفرادی واجتماعی تعبیر وارتقا کے لیے حریت فکر وضمیر شرط اولین ہے۔غلامی کی زنجیریں نہ صرف جسم کو بلکہ فکر وضمیر کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور انسان ہے جان، بے چہرہ اور بے روح ہوجاتا ہے۔اقبال نے اپنی شاعری میں غلامی کے اس انسان کش ماحول پر ضربیں لگائیں۔آزادی وطن کے لیے ان کی تڑپ اور بیقراری اس لیے ہے کہ انسان غلامی کے طوق و سلاسل سے آزاد ہوکر اپنی سیرت وشخصیت کی تعمیر کر سکے اور اسے اپنا مقام حاصل ہوجائے۔ایک بندہ آزاد ہی انسانی صلاحیتوں کے لامحدود امکانات کی تلاش وجستجو اور حیات وکائنات میں انسان کے مقام اور اس کی تقدیر کا تعین کر سکتا ہے کیونکہ ''ہے بندہ آزاد خود ایک زندہ کرامات'' محکوم آزاد کا ہمسر ہو نہیں سکتا کہ محکوم بندہ افلاک ہے اور آزاد خواجہ افلاک، یعنی محکوم دنیا کا غلام اور آزاد دنیا کا ملک ہے۔اس لیے اقبال کا یہ فیصلہ ہے کہ:

آدمیت احترام آدمی
باخبر شواز مقام آدمی

بندہ آزاد راشانے دگر
مرگ اور امی دہد جانے دگر
ہو بندہ آزاد اگر صاحب الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لیے مہمیز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

مرد مومن چونکہ گفتار اور کردار میں آزاد ہوتا ہے، اس لیے آزادی اس کا پیدائشی حق ہے۔ بندگی میں گھٹ کر انسان ایک ''جو نے کم آب'' بن جاتا ہے اور آزادی اسے ''بحر بیکراں'' میں تبدیل کر دیتی ہے۔اس سلسلے میں ایک بات قابل غور ہے۔''مرد حر ہومر کے فری مین کی طرح نہیں ہے بلکہ یہ خدا

سجدوں سے اسے نجات مل جاتی ہے۔ ایک آستاں کا وہ پابند ہے اور اسی پابندی کے حصار میں اس کی آزادی کی نشوونما ہوتی ہے کیونکہ دل میں خوف خدا آتے ہی ساری دنیا کا خوف دل سے نکل جاتا ہے۔ آزادی تمام نوع انسانی کا حق ہے، اس لیے اقبال کہتے ہیں:

دراصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہوسکتے ہیں بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کردیں اور ایک دوسرے کی شخصیت کو تسلیم کرلیں، ملوکیت خواہ وہ جمہوریت کی قبائیں کیوں نہ پوشیدہ ہو انسان کو فوز وفلاح سے آشنا نہیں کرسکتی بلکہ انسانی فلاح تمام انسانوں کے مساوات اور حریت میں پنہاں ہے۔

غلامی کی تاریکی میں انسان کی بصارت اور بصیرت گم ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے آپ سے بے بہرہ ہوجاتا ہے اور اپنی یہی یافت اس کے بس کا روگ نہیں، کیونکہ اس کے جسم اور روح پر تو کسی دوسرے کا تسلط ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک انسانی شباہت کے سوا اس کے پاس کیا بچ جاتا ہے۔

جاں بھی گرو غیرہ بدن گھر گرو غیر
فسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
آزاد کی دولت دل روشن نفس گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدہ نمناک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہدوش
وہ بندہ افلاک ہے یہ خواجہ افلاک

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پہ
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

غلامی نام ہے جسم پروری کے لیے قلب وذہن اور جسم وروح کے سودا کرنے کا۔ غلام ان چیزوں کو بہت ہی سستے داموں میں بیچ دیتا ہے۔ اس لیے وہ ایک متحرک میت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

دین و دانش را غلام ارزاں دہد
تا بدن رازندہ دار و جاں نہ بد
گرچہ برلب ہائے اونام خدا است
قبلہ اوطاقت فرمازوا است

طاقتے نامش و دروغ با فروغ
از بطون او تزاید جز روغ

از غلامی ذوق دیدارے مجوئے
از غلامی جان بیدارے مجوتے

دراصل غلام تو فرمانبرداؤں کا بندہ ہوتا ہے ٹھیک اس کے برعکس مرد حر "نعرہ لاملکو" کا قائل ہے۔ اس لیے غلام کے قلب میں زندگی کی سمائی کی گنجائش مسدود ہوجاتی ہے کیونکہ مرد حر کا مسلک تسخیر جہات ہے۔ لیکن غلام کا مقصد حیات صرف کھانا پینا لمبی نیند سونا اور مرجانا ہے۔

دیدہ ار محنت دیدن نبرد
دیر جہاں خورد دگراں خوابیدہ دمرد

خدا کی بندی کے اندر حیات کا حرکی پہلو مضمر ہے۔ اس لیے بندہ خدا کی آزادی پروان چڑھتی ہے لیکن بندوں کی بندگی میں سکون وجمود ہے اور موت کے مترادف ہے۔ اس کی حدود کے اندر انسان کے تخلیقی ارتقاء کے امکانات نہیں اور انسان غلام رہ کر نائب الٰہی نہیں بن سکتا۔ اس لیے مرد حر محبوب خدا رسول مقبول کی پیروی کرتا ہے۔ اور بندوں کی غلامی کو انسانیت کے لیے ننگ سمجھتا ہے یہی وہ بندگی ہے جو آدمی کو اسفل السافلین کی طرف لے جاتی ہے۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت نہ لے نذر قبا و جم کرد

ارتقاء کی آخری منزلوں میں تو مرد حر کو خدا سے بھی مزید آزادی کا طلبگار رہتا ہے اور وہ حیات کے تمام ممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے لیکن اس کی یہ آرزو کفر والحاد کی طرف مائل نہیں ہوتی، بلکہ وہ خدا سے جتنا قریب ہوتا ہے اس کی کارگزاریوں اور عمل میں اسی تناسب سے اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کا جذبہ حریت کو اس سے یہاں تک کہلواتا ہے۔

خدائی اہتمام خشک و تر ہے
خداوند خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

مرد مومن پر بحیثیت مجموعی ایک مختصر نظر

مرد مومن کا تخلیقی ارتقا:

اقبال کا "مرد مومن" محض ایک تخلیقی اور حیاتی پیکر نہیں ہے۔ اب تک کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے کہ مرد مومن عہد مسلسل یعنی پیہم سے بنتا ہے اور یہی عمل کا تواتر اسے تخلیقی ارتقا کی منزلوں کے طے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ زوال آدم سے ہی مرد مومن کو یہ سبق ملا ہے کہ اسے اپنا جہاں اپنے خون جگر سے پیدا کرنا ہے جنت سے نکلنے کی منزل حیات مومن کی پیکار اور کوششوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ اختیار کی دنیا میں قدم رکھتا ہے اور اپنی بصارت اور بصیرت سے کام لے کر تسخیر جہاں میں مصروف ہوجاتا ہے۔

مرد مومن کا حیاتی شعور:

مرد مومن" انسان اور کائنات انسان اور انسان، انسان اور خدا کے رشتوں سے بخوبی آشنا ہوتا ہے اور فطرت کے رموز وعلائم کو آئینہ ایام میں کھلی کتاب کی طرح دیکھتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ

دمادم رواں ہے یم زندگی
ہر ایک شے سے پیدا رم زندگی
اسی سے ہوتی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود
گراں گرچہ ہے صحبت آب وگل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم یہ بت خانہ شش جہالت
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں

سن و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاند ی میں ہونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں ہونے میں پارے میں ہے
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل وحور
کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں
فریب نظر ہے سکون وثبات
تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پر دراز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست وبلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ وساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لزت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہان مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاق دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت وکہسار سے نوج نوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زودرس
ازل سے ابد تک رم یک نفس
زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے
یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

مردمومن جب زندگی کا مشاہدہ مذکورہ بالا انداز میں کرلیتا ہے تب اسے اسکا بھی ادراک ہوتا ہے کہ زمانہ دراصل اس کی حیات کے تسلسل ہے سے وابستہ ہے اور وہ تسخیر جہالت میں معاون ہے تن وہ زمانے کی لہر کو اپنی مٹھی میں تھام لینے کا عزم پیدا کرتا ہے اور زمانے کے سیل کو وہ پی جاتا ہے اور حیات کا ہر لمحہ عمل کی زنبیل میں ڈال دیتا ہے اس کے متواتر عمل کے لیے اسے یقین محکم کی دولت توحید اور رسالت کے عقیدے پر بھرپور ایمان اسے کی وجہ سے ملتی ہے یہی ایمان اسے موحد اور عاشق رسول بناتا ہے۔اس عشق کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت بلندیوں کو چھوتی چلی جاتی ہے اور اس کا عمل اس کی شخصیت کا مظہر بن کر اس کی ذات کا استحکام کرتا جاتا ہے رفتہ رفتہ اس کے عوامل کی یہی لاتناعی ترکیب وتنظیم اس کی حیات بن جاتی ہے اور اس حیات میں اتنی توانائی ہوتی ہے کہ اس کے سیل رواں میں خس وخاشاک پرکاہ کی طرح بہہ جاتے ہیں یہ ساری قوت حاصل کرتے وقت اس کے زمانے کا مزاج اور تیور موجود رہتا ہے اسی لیے جذبہ تسخیر سے سرشار ہوکر یہ فقیر اپنے ذہن میں یہ نقش تحلیل کرلیتا ہے

مردمومن کی قوتوں کا سرچشمہ:

"مردمومن" کی ساری قوت وفراست اور روحانی سربلندی کا پس منظر اطاعت خدا اور عشق رسول سے وابستہ ہے ورنہ مسلمان کی خودی بھی طاقت حاصل کرسکتی ہے قوت محض مردمومن کے لیے کوئی بہت اہم چیز نہیں، بلکہ مردمومن کی قوت مقصد حیات کی تکمیل کے لیے ہے چونکہ حیات کے اسرار سربستہ بیحد پیچیدہ اور پریشان کن ہیں، ان کی گرہ کشئی کرکس وناکس کے بس کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے اقبال کا مردمومن اس کے لیے آسان ترین راستہ اختیار کرتا ہے وہ آسان ترین راستہ کیا ہے؟ وحی اور الہام کا راستہ ختم نبوت کے بعد وحی کے راستے مسدود ہوگئے اس لیے مردمومن بے چون وچرا رسول اکرم کا اسوہ حسنہ اور قرآن کریم کی اتباع میں مصروف ہوجاتا ہے کیوں کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں خدا نے زندگی کے ملتہائے مقصود اور تسلیم ورضا کے قوانین مرتب کردیے ہیں حیات کا مکمل لائحہ عمل تیار کرکے دیدیا ہے حیات کی تمام دشوار گزار راہوں کی رہبری کردی ہے یہ کتاب ایسی ہے جو محض حکیمانہ نکات بیان نہیں کرتی بلکہ ایک دستور حیات ہے جسے عملی جامہ پہنانا انسان کی تخلیق کا عین مقصد ہے رسول اکرم کی ذات چونکہ قرآن کریم کی عملی تصویر ہے، اس لیے مردمومن راہ سلاک میں رسول کے نشان قدیم پر حد درجہ عقیدت مندانہ اور والہانہ انداز میں گامزن ہوجاتا ہے جب حیات کی شاہراہوں کی تمام پر پیچ ترواریوں کی سیر کرلیتا ہے تو اپنے عقائد کو اپنے تفکر سے پرکھتا ہے اور پرکھنے کے بعد یہ عقائد اس کی شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں۔یہی اس کا ایمان ہوتا ہے جسے عمل کا جامہ پہنانے کے لیے توحید خالص کی منزل سے گزرنے کے بعد اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ۔

بمصطفی برساں خویش را کہ دیں ہمہ دست
اگر باؤ نرسیدی تمام بو لہبی است

مذکورہ تقلید یار میں "مردمومن" کی خودی مجروح نہیں ہوتی بلکہ اس کا استحکام ہوتا ہے۔کیوں کہ یہی وہ تقلید ہے جس کے ذریعہ وہ حیات کے تعمیر کردہ بت خانہ شش جہالت کی ارشش سے نکل کر اپنے منصب کو پہچان پاتا ہے۔اس کی انفرادیت کا مقام متعین ہوتا ہے اور وہ خود کو خدا کے سامنے جھکا کے ساری دنیا کو اپنے سامنے جھکا دیتا ہے خدا کے سوا ہر سجدہ کر حرام سمجھتا ہے اس لیے باطل کی تمام قوتوں کو فریب نظر سمجھ کر خس "لا" کی ضرب سے شکست دیتا ہے اسے اس کا عرفان ہوتا ہے کہ خدا قادر مطلق ہے۔بقیہ دوسری تمام طاقتیں اسی سے ماخوذ ہیں اور باطل چونکہ خدا سے کٹ جاتا ہے اس لیے مرد خدا کی ایک ہی ضرب میں پاش پاش ہوجاتا ہے۔اس بت شکنی میں اسے تدریجی طور پر فائدے ہیں ایک تو اپنی ذات کا احساس اور اپنی قوت بازو پر بھروسہ ہوتا ہے اور دوسرے خدا کی وحدانیت اور اس کی قادر مطلق ہونے کا عرفان ہوتا ہے اس عرفان سے عملی طور پر اسے دو فائدے ہوتے ہیں اولا وہ خودکو نیت ایزدی میں گم کر

مشیت ایزدی کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔تب صحیح معنوں میں اس کے دل سے ہر طرح کا خوف وہراس نکل جاتا ہے اور انسان پرستی اور مظاہر پرستی سے نکل کر خدا پرست بن جاتا ہے اور جب قطعی طور پر اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں گم کر دیتا ہے تو خود "مردمومن" کی مرضی بھی رضائے الٰہی بن جاتی ہے۔اس لیے اس کے بازووں کی آزمائش تو درکنار نگاہوں کی تاب بھی ممکن نہیں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مردمومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

نیابت کے مذکورہ بالا مقام پر پہنچ کر وہ ببانگ وہل معاشرے کے دوسرے انسانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اسفل السافلین کی منزل سے نکل جاؤ یہ تمہارا مقدر نہیں بلکہ تمہارے اعمال نے تمہیں ارزل بنا دیا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

تو اگر خواہی مسلمان زیستین
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستین

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

''اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا کرو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلاتا ہے جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔(قرآن کریم)

''اللہ کے نزدیک تم میں بڑا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔''

''مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، اعمال صالح کرتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور اپنے آپ کی مدافعت اس وقت کرتے ہیں جب ان پر زیادتی کی جائے۔''

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی حالت یوں سمجھے کہ گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا یا جیسے (مرغی کے چوزے کو) کوئی (عقابی پنجوں والا) پرندہ اچک کر لے جائے، یا جیسے تند و تیز ہوا کے جھونکے (پرکاہ کی طرح) اسے کسی دور دراز مقام پر پھینک دیں۔''

''وسخر لکم مافی السموات والارض جمیعاً''

جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے جو کچھ ان پستیوں اور بلندیوں میں ہے سب کچھ تمہارے تابع فرمان رکھا ہے۔

اور یقیناً ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ بے شک یہ تمام زمین ہمارے صالح بندوں کی میراث ہے۔''

بے شک ان مظاہر فطرت کے اندر صاحبان عقل وخرد کے لیے آیات ہیں، یعنی وہ لوگ جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔''

''ان فی ذالک آیات۔۔۔۔وعلیٰ جنوبھم''

''مت گھبراؤ، مت خوف کھاؤ تم دنیا میں سب سے بلند ہو بشرطیکہ تم مومن ہو۔''

مشرک اگر قوت وتوانائی حاصل بھی کر لیتا ہے تو شتر بے مہار کی طرح جدھر منہ اٹھاتا ہے، ادھر ہی چل دیتا ہے، لیکن مردمومن موحد ہے اس کی منزل اسے معلوم ہے۔اسے اپنی مقصد سے والہانہ محبت ہے۔اس لیے حصول مقصد کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے تا کہ انسانیت کے صحیح مقام پر پہنچ سکے۔پھر جب اس کا عمل صالح ہوتا ہے تو وہ خدا کا وارث بن کر اس زمین پر اس کی نیابت کے فرائض انجام دیتا ہے اور دوسری قوموں سے احتساب کرتا ہے۔قرآن کی تعلیمات سے سرشار ہو کر ''مردمومن'' ''لا الٰہ'' اور ''الا اللہ'' کے بعد محمد الرسول اللہ کی شاہراہ پر اپنی زندگی کو لگا دیتا ہے۔

''اگر کوئی شخص قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کرنا چاہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ قرآن جو پیغام انسان کو دیتا ہے وہ ہے ''لا الٰہ'' اور ''الا اللہ'' اس کلمے کے دو حصے ہیں۔ایک سلبی (Negative) یعنی اس امر کا یقین، اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے۔جس کی غلامی اختیار کی جائے، جسے آقا تسلیم کیا جائے جسے اپنی حاجات کا قبلہ مقصود سمجھا جائے۔یہ نفی کا پہلو ہے تخریبی پہلو ہے۔یعنی جو کچھ پہلے ذہن میں موجود ہے اسے مٹا دینا ہوگا۔بھلا دینا ہوگا جب زمین یوں صاف ہو جائے (Affirmative) آئے گا۔تمام قوتوں کے انکار کے بعد اس امر کا اقرار آئے گا۔یاں مگر ایک ایسی قوت ہے جس کی غلامی اختیار کرنا ضروری ہے۔جس کے سامنے جھکنا زیبا ہے اور جسے اللہ کہتے ہیں۔تمام قوتوں کو راستے سے ہٹا کر یوں خدا اور بندے کا براہ راست تعلق پیدا کر دینا ہی قرآن حکیم کی تعلیم ہے۔اس تعلیم کو دنیا میں سب سے پہلے ایک منضبط شکل میں پیش کرنے والے حضرت خلیل اللہ تھے۔اور ان کی حیات مقدسہ کا یہ اہم واقعہ سب کو معلوم ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کے صنم کدہ کے تمام بتوں کو پہلے توڑا اور اس کے بعد خدائے واحد کی طرف دعوت دی۔پہلا قدم ''لا الٰہ'' تھا اور اس کے بعد ''الا اللہ'' جب تک مکان خالی ہو نیا مکین آکر نہیں بستا۔'' اس حقیقت کا انکشاف ''مردمومن'' پر جب ہوتا ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ

صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیل
یہ وہ نکتہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

مردمومن شرک سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔شرک کا مفہوم اس کے نزدیک وسیع ہے۔اس کی راہ میں خواہ مال واولاد کا بت ہو یا عزت وجاہ، دولت وثروت کا بت ہو یا حکومت وسلطنت کا، ملک ونسب کا بت ہو یا رنگ ونسل وقومیت کا سب کو مسمار کر دیتا ہے کیونکہ بت پرستی سے اس کے ضمیر کن نکاں کر تھیں پہنچتی ہے۔وہ تھوڑی دیر کے لیے ان چھاؤں میں آرام تو کر لیتا ہے لیکن پھر اپنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ہر سائے کو کہ منزل تصور کرنا احمقوں کا شیوہ ہے۔اس لیے مردمومن کی نگاہ کائنات کی کرشمہ سازیوں پر یلغار کرتی رہتی ہے اور وہ تسخیر جہات کر کے حکومت الٰہیہ کے قیام کا متمنی ہو جاتا ہے تا کہ وہ کائنات کی صحیح معنوں میں نگہبانی کر سکے اور اپنے آقائے حقیقی کی نظر میں محبوب تر ہوتا چلا جائے یہی اس کا مقصد اخروی ہے اور اس کے حصول کے لیے تقلید یار کی شرط ہے کیونکہ ''مردمومن'' اس نکتے سے واقف ہے کہ عشق رسول کے بغیر ان منزلوں کے لیے پتے نہیں ملتے۔رسول اکرم کی تقلید کے بعد تو یہ راہیں خود اسے دیار محبوب کی طرف بلا کر لے جاتی ہیں۔اس لیے ''مردمومن'' خود کو رسول کے قدموں میں ڈال دیتا ہے اور تربیت کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔زمین سے آسمان کا رابطہ قائم کرنے کی تڑپ اس میں اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ تمام علائق کو عشق رسول کے سامنے توڑ دیتا ہے۔اپنے اہل وعیال، دوست واحباب حالی موالی حتیٰ کہ اپنی جان بھی ہتھیلی پر رکھ کر اتباع سنت کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

''قسم ہے تیرے پروردگار کی، ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اپنے ان تمام معاملات میں، جن میں اختلاف کرتے ہیں، اے رسول تمہیں اپنا حاکم تسلیم نہ کر لیں، پھر تمہارے فیصلوں پر دل میں بھی کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہ کریں، بلکہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کر لیں۔''

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے: رسول اللہ نے فرمایا:

''تم میں سے اس وقت تک کوئی مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو اس کی جان، مال، اولاد، اور ماں باپ سے اور سارے آدمیوں سے زیادہ دوست نہ ہوؤں۔''

حضرت عمرؓ نے رسول اقدس کی خدمت میں عرض کیا۔

''یا رسول اللہ سب چیزوں سے زیادہ مجھے محبوب ہو۔لیکن میری جان جو کہ میرے دونوں

[illegible]

تیری جان سے زیادہ عزیز نہ ہوں گا، اس وقت تک تو کامل مسلمان نہ ہوگا۔ پس حضرت عمرؓ نے قسم کھائی اور کہا۔ "اس خدا کی قسم ہے جس نے آپ پر کتاب بھیجی آپ میرے نزدیک جان سے زیادہ دوست ہیں۔ رسول خدا نے فرمایا کہ: اے عمر اب تیرا ایمان پورا ہوا اور تو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کامل مومن ہے۔"

اقبال کا مرد مومن مذکورہ بالا احکامات کی روشنی میں ہی یہ اقدام کرتا ہے کہ۔

مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باؤ نرسیدی، تمام بولہبی است

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی
اے پناہ من حریم کوئے تو
من بامید سے دویدیم سوئے تو
با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ او پنہاں و تو پیدائے من

قائم مقام خلافت:

جب مومن نیابت الٰہی کے درجے پر فائز ہو کر اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے تو دونوں کی مرضی کا تفاوت قطعاً ختم ہو جاتا ہے اور اسی موڑ پر اس کے زور بازو کا اندازہ لگانے کی جسارت کرنے والے نگاہوں کی کرشمہ سازیوں سے ہی بدل جاتے ہیں اور بے تیغ بھی لشکر شکنی کر پاتا ہے۔

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

قرآن نے کہا:

"تم نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے۔ تم نے تیر اندازی نہیں کہ بلکہ وہ تو اللہ نے کی ہے، تلواریں تمہاری تھیں اور ان میں بجلیاں ہمارے غضب کی کوند رہی تھیں۔ نیزے تمہارے تھے اور ان کی انیوں کے ساتھ قضائیں ہماری لپٹ رہی تھیں۔"

اسی لئے نیابت پر فائز مرد مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے اور اس کی ضرب کاری سے کوہ گراں چور چور ہو جاتے ہیں۔ اقبال اس کی عکاسی یوں کرتے ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

"مرد مومن کی قوت اور توانائی کے سرچشمے کی وضاحت کے بعد اس کی صفات ملاحظہ ہوں۔

مرد مومن کی صفات

تکمیل ذات کے بعد "مرد مومن" کیا ہوتا ہے۔ اس کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔ اقبال کہتا ہے ایسے ہی مرد مومن کی مثال اس روشن آفتاب کی سی ہے جس کے لئے غروب نہیں جو ہمیشہ طلوع ہی رہتا ہے۔ اگر ایک طرف غروب ہوا تو دوسری جانب طلوع ہوا۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اور یہ بات یقیناً سچ ہے تاریخ کے صفحات اس بات پر شاہد ہیں کہ جب کبھی عالم اسلام کے کسی حصہ پر مسلمانوں ہی کی کمزوریوں کے باعث کوئی افتاد پڑی تو فوراً ہی اس کی تلافی کسی دوسرے حصہ میں ہو گئی، اگر اسلام کو عالم کے ایک حصہ میں کچھ نقصان پہنچا تو دوسرے حصہ میں اسے ایک بڑی فتح حاصل ہوئی، اسلام کا اگر ایک ستارہ گردش میں آیا تو مطلع عالم پر ایک "نیا ستارہ" نمودار ہوا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اندلس کا خاتمہ ملت اسلامیہ کے لئے ایک اندوہناک واقعہ اور عظیم حادثہ تھا لیکن ساتھ ہی یورپ کے قلب پر حکومت ترکیہ کی ایک نئی اسلامی حکومت نمودار ہوئی، غرناطہ کا سقوط اور دولت عثمانیہ کا عروج یہ دو واقعے ہیں جو ایک ہی زمانہ میں واقع ہوئے۔ تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی بھی تاریخ اسلام کا بڑا افسوسناک حادثہ ہے لیکن اسی زمانہ میں ہندوستان کی مسلم حکومت نے ترقی و وسعت اختیار کی اور اس انیسویں صدی کے شروع میں یورپ کے ہاتھوں عالم اسلامی کو سخت چرکے لگے اور یورپ کی حکومتوں نے حکومت ترکیہ کو وراثت کے طور پر تقسیم کر لیا، لیکن ساتھ ہی سارا عالم اسلام جیسے جاگ اُٹھا، ذہنی بیداری عام ہوئی، آزادی وحریت کا سیاسی شعور پیدا ہوا اور مختلف اسلامی تحریکیں چل پڑیں۔ آج ایسا نظر آ رہا ہے کہ جیسے سارا عالم اسلام ایک نئی کروٹ لینے کو ہے، دیکھئے پردۂ غیب میں کیا پوشیدہ ہے؟ تاریخ اسلامی ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اسلام کا آفتاب اگر ایک افق میں چھپتا ہے تو دوسرے افق سے اس کی تیز کرنیں نمودار ہوتی ہیں اور یہ اس لئے کہ اسلام ہی اللہ کا وہ آخری پیغام ہے جو ساری انسانیت کے لئے شمع ہدایت ہے۔ اس کے بعد اس عالم کے لئے اب کوئی دوسرا پیام نہیں، اور مسلمان اس "پیغام" کی حامل آخری امت ہے اگر یہ ہلاک اور ضائع ہو گئے تو پھر وہ آخری پیغام ضائع ہو جائے گا اور انسانیت کی کشتی ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے گا۔ علامہ اقبال نے اپنی بے مثال نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اس حقیقت کی اچھی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے تمثیلی انداز میں یہ بات واضح کی ہے کہ آج ابلیسی نظام کو سارا خطرہ وخوف "اسلام" ہی سے ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ اسلام کا آئین چشم عالم سے پوشیدہ رہے تو اچھا کیونکہ اسی میں ہمارا بقا ہے اور یہ غنیمت ہے کہ آج خود مومن محروم یقیں ہے اور پھر اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ اچھا ہے انہیں الٰہیات اور علم کلام کے مباحث میں الجھائے رکھو تا کہ بساط زندگی میں ان کے تمام مہرے مات ہوں اور اسی میں ہماری خیر ہے کہ اس جہان پر اوروں کا قبضہ رہے اور مومن قیامت تک غلام رہے، کیونکہ

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں اس حقیقت کی طرف خوب نشاندہی کی ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کے غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دامن سے نکال دو

اقبال کی طبیعت حساس کو جب مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے اور خون کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی شاعری سے خون دل و

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں تجھ میں
گفتار دلبرانہ ، کردار قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل ، سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا ، جذب قلندرانہ
اسی قسم کا شکوہ اور دوسری جگہ بھی فرماتے ہیں
وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

خرابیوں کی وجہ

اقبال کے نزدیک ان تمام خرابیوں کا باعث مومن کا وہ قلب ہے جس سے ایمان خالی ہو چکا ہے اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہیں۔ کہتا ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج ، دل پریشاں ، سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

اقبال کی نگاہوں کے سامنے مسلمانوں کی موجودہ حالت وکیفیت عیاں ہے اور وہ اس حالت زار پر بے چین و پریشان اور شکوہ سنج بھی ہے، لیکن چونکہ اقبال یاس وقنوط کا شاعر نہیں بلکہ امید اور آس یقین وایمان کا ''پیغام بر'' ہے اس لئے وہ مایوس نہیں ہے، اسے اس بات پر یقین ہے کہ عالم اسلام کو جو سیاسی تھپیڑے لگے ہیں اس نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے اور ان میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ہے اپنی مشہور نظم ''طلوع اسلام'' میں وہ کہتا ہے۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی
عروق مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگا حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی ، ذہن ہندی ، نطق اعرابی

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

مرد حق از کس نہ گیرد رنگ و بو
مرد حق از حق پذیرد رنگ و بو
ہر زماں ..... اندر تنش جانے دگر
ہر زماں اورا چو حق شانے دگر
بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام اورانہ اوکس را غلام
بندہ حق مرد آزاد است و بس
ملک و آئیش خداداد است و بس
رسم و راہ و دیں و آئیش زحق
زشت و حزب و تلخ و نوشیش زحق

مرد مومن اس جہان رنگ وبو میں سوائے خدا اور رسول کے کسی کی اتباع نہیں کرتا اور نہ کسی کے سامنے جھکتا ہے، نہ وہ خود کسی کا غلام ہے اور نہ کسی کو غلام بنانا پسند کرتا ہے۔ وہ ہر لحہ متغیر ہے، اس کی بے نیازی ہی اسے خدا پرستی سکھاتی ہے۔ خدا پرستی اور بت شکنی اس کے کردار کے دو واضح رخ ہیں۔ وہ حد درجہ توانا اور مضبوط اور بیباک ہوتا ہے۔ اس کی تمام قوتوں کا سرچشمہ دین فطرت ہے۔ وہ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اس لئے فطرت تمام خزانے اس پر نچھاور کر دیتی ہے۔ اس کے لئے ملک وآئین خداداد ہے، اس کی پسند اور ناپسند وہی ہوگی جو خدا کی پسند اور ناپسند ہے، خوب وزشت کا معیار اس کا بھی وہی ہے جو خدا اور اس کے رسول کا ہے ایسی صورت میں مرد مومن کے کاموں میں خدائی مزاحم نہیں کیوں کہ مزاحمت میں خود خدائی کا مقصد مجروح ہوتا ہے۔ خدا مرد مومن کو اپنا شریک کار بنالیتا ہے اور انسانیت کو اس کے بلند مقاصد کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔ انسانیت کو انسانوں کی بندگی سے نجات دلاتا ہے اور ساری دنیا کے لئے رحمت بن جاتا ہے۔ تمام باطل قوتوں کو سرنگوں کر کے خدا کی حکومت قائم کرتا ہے اور خدا کے بندوں پر کسی بندے کی حکومت قطعی برداشت نہیں کرتا۔

مرد حُر محکم زور دلا تخف
ما بمیدان سر بجیب او سر بکف
مرد حُر از لا لہٗ روشن ضمیر
می نہ گردد بندۂ سلطان و میر

''مرد مومن'' کے بدل جانے سے ساری دنیا بدل جاتی ہے اور وہ نعرۂ لاخوف کے ساتھ الحکم للہ پر عمل پیرا ہو کر انی جاعل فی الارض خلیفہ کا مصداق بن جاتا ہے۔ اس کی سرشت میں حریت اور بیباکی کا جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ راہ میں حائل تمام چٹانوں کو پیس کر رکھ دیتا ہے، لیکن اگر گلستان سے گزرنا ہو تو پھر..... ''جوئے نغمہ خواں'' بن جاتا ہے، وہ آگ اور پانی کا متوازن ہمیشہ سے ہے۔ شکستوں سے چور چور انہیں کو کرتا ہے جو کوہ گراں بن کر خدا کی راہ میں حائل ہیں ورنہ کمزوروں اور بے کسوں کا تو وہ والی ہے۔

گزر جا بن کے سیل تندو کوہ بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
رہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری

زیرکی اور عیاری سے اسے نفرت ہے۔ البتہ عقل سلیم کا وہ قائل ہے۔ وہ سادگی اور پرکاری کا نمونہ ہے۔ انسانوں کی گمراہ کن عقل پر اسے کبھی بھروسہ نہیں، البتہ خدا ئیں عقل کو وہ پسند کرتا ہے، اس کی گفتار اور اس کے کردار میں اللہ کی شان جلوہ گر ہوتی ہے۔ ''قہاری وغفاری وقدوسی وجبروت، کے چار عناصر سے اس کا مزاج بنتا ہے، وہ بندۂ خاکی تو ہے لیکن اپنی روحانی قوتوں کو اتنی وسعت دے لیتا ہے کہ جبریل کا ہم نشیں بھی ہے بلکہ مسجود ملائک ہے ''قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن'' یعنی احکام خداوندی کی عملی تفسیر ہے اور قرآنی احکامات سے اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے ارادے

ہوتے رہتے ہیں۔مزاج کے دور خاپن کا یہ عالم ہے کہ لالہ کے جگر کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے تو دریاؤں کیلئے بجائے خود طوفان ہے جس سے اس کی پہنائی پناہ مانگتی ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایہ جبریل امین بندہ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرد و ازلی کے روز و شب
آہنگ میں یکتا صفت سورۃ رحمان

جباری، قہاری، کریمی، رحیمی اور ستاری کی صفات اس میں بھی پیدا ہو جاتی ہیں، یہ بھی اپنے طور پر اللہ کی عطا کردہ صفات کو بروئے کار لاتا ہے۔یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اللہ کی بے شمار صفات ہیں۔ان میں سے بعض صفات کو مومن قرب الٰہی کی وجہ سے اپنے کردار میں جذب کر لیتا ہے اور چونکہ اللہ نے اس میں اپنی ہی روح پھونکی ہے اس لیے اس کی شخصیت میں خدائی شان کا عکس موجود ہے۔اس لیے اس کی قوت بازو کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔وہ آسمان و زمین کی قلب ماہیت میں مصروف ہے۔وہ تقدیر کے پانسے کو پلٹ سکتا ہے۔کیونکہ اس کی نہ تو اپنی کوئی خواہش ہوتی ہے اور نہ اپنی مرضی وہ تو رضائے الٰہی کو عملی جامہ پہناتا ہے۔اس لیے وہ بجائے خود تقدیر الٰہی بن جاتا ہے۔

بندہ مومن ز آیات خدا است
ہر جہاں اندر براد چوں قبا است
چوں کہن گرد و جہانے در برش
می دہد قرآن جہانے دیگرش

نہ تو زمین کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
نفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیر و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
خدا نے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقین پیدا کرانے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں فانی، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تیری فطرت ، میں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کویا امتحاں تو ہے

قرآن کا یہ ارشاد کہ" اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنایا کہ تم تمام نوع انسانی کے (اعمال) نگراں ہو اور تمہارے (اعمال کے) نگراں رسول ہوں" ایسے ہی مرد مومن کے لیے ہے۔نیابت الٰہی کے درجے پر فائز ہو کر یہ مرد قلندر دنیا کی قوموں کے اعمال با احتساب کرتا ہے اور غور سے دیکھتا ہے کہ کون سی قوم ٹھیک سے کام کر رہی ہے اور کون غیر خدا کے راستے پر جاری ہے جو غیر اللہ کی پرستار قومیں ہوتی ہیں نہیں وہ "سود و بہبود ہمہ" کے اصول کے تحت اپنی حکومت میں جذب کر لیتا ہے۔اقوام عالم کا یہ نگراں رسول عربی کا سپاہی ہوتا ہے۔اور خدائے واحد کا سچا بندہ۔اس کی غرض و غایت بندوں کو ان کی قوت طاقت اور صلاحیت سے آگاہ کرنا ہے۔قوموں کو مضبوط و مستحکم بنانا ہے نہ کہ تباہ کرنا، ہاں شیطان سے مرد مومن کی آمیزش ہے۔اس لیے جو قومیں اس کی پرستار ہیں وہ انہیں اپنی ٹھوکروں سے پاش پاش کر دیتا ہے کیونکہ اس عالم ک وہ اپنی میراث سمجھتا ہے۔

عالم ہے فقط دمن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہو

قلندر کی پہچان:

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندہ حق تو بھی ادھر جا
جگا ہیں میرے تیری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا نگاہ قلندر سے گزر جا
میں کشتی نہ ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا
توڑا نہیں رہا جادو میری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرات تو مکر جا
مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

مرد مومن زمانے کے ہمسفر ہے۔وہ وقت کے دوش بدوش چلتا ہے اس کی جسمانی اور روحانی قوتوں کا یہ عالم ہے کہ وہ ساری دنیا کو کہتا ہے کہ "میں جدھر جاتا ہوں تو بھی ادھر چل اور اگر روگردانی کی اور اپنی پر فریب طاقت و قوت کے بھروسے اکڑنے کی سوچی تو یہ جان لے کہ میرے اندر تیری برداشت کی حدوں سے زیادہ قوت موجود ہے۔اس لیے بہتر ہے کہ میری نگاہوں میں نگاہیں ڈالنے کی جرات نہ کر۔اگر تجھے اپنی قوتوں کا اتنا ہی بھرم ہے تو خبردار کہ میں سر پر پاؤں رکھ کر گزر جاؤں گا۔اس لیے بہتر ہے کہ خدا کی حکومت کو تسلیم کر لے اگر کوئی خدا کا منکر اس پر بھی نہ سنے تو پھر "مرد مومن" اسے ایڑ لگانے میں دیر نہیں کرتا اور خدا کی لاٹھی سے سب کو ایک راستے پر ہانکتا ہے۔کیونکہ اسی میں سب کی فلاح و بہبود پوشیدہ ہے۔وہ افراد کے علاوہ قوموں کا بھی مقدر پلٹ دیتا ہے وہ ساری زندگی اپنے لہو سے اس

کائنات فقط اس کی میراث ہے۔

مردمومن فقیری میں بادشاہی کرتا ہے اور یہ ایسا فقیر ہوتا ہے جسے دنیا کے بادشاہ خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ یہ مفت قلب نگاہ کا پیکر مسیح وکلیم کا ہمسر ہوتا ہے اور حقائق اس پر خود بخود منکشف ہوتے ہیں۔ یہ عقل کی زیرکی اور علم کی بصیرتوں سے اور آگے بڑھ کر عشق کے دریا میں غوطے لگاتا ہے اور اپنے آپ میں ایک انجمن بن جاتا ہے۔ اس کا ایک پاؤں زمین پر ہوتا ہے تو دوسرا عرش معلیٰ پر زمین اور آسمان کی دوریوں کو وہ مصلیٰ کی طرح سمیٹ کر اپنے قلب کے نہاں خانوں میں ڈال دیتا ہے اور امیری اس کا مقدر بن جاتی ہے اس کی امیری باعراللہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکی عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ
علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جوئے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقام نظر، علم مقام خبر
فقر میں مستی ثواب علم میں مستی گناہ
نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

''مردمومن'' ایک ایسا فقہ اور درویش عاشق ہے جس کی فقیرانہ شان میں شاہینی کی جھلک ہوتی ہے۔ وہ کسب حلال کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی کھلاتا ہے اوروں کی دی ہوئی روٹی کو موت کے برابر تصور کرتا ہے۔ بے تعلق ایسا ہے کہ گھر تک بنانے کا قائل نہیں ہے کیونکہ وہ تو ساری کائنات کا وارث ہے، چند گز رزہین میں اپنے متحرک پیکر کے لیے قبر کیوں تیار کرلے بلندیوں سے اسے پیار ہے اس کی نگاہ کائنات کے تمام کونوں کھدروں کا محاسبہ کرتی رہتی ہے لیکن وہ خود تنہا رہتا ہے یا پھر خدا اس کی صحبت اختیار کرتا ہے۔

کیا میں نے اس خاداں سے کنارہ
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت میری راہبانہ
ہوا تے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جوانمرد کی ضربت غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

یہ اپنی حریت کا اس قدر دلدادہ ہے کہ اس رزق سے بھی پرہیز کرتا ہے جس سے غلامی کی بو آتی ہے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہ ایسا درویش ہوتا ہے جو فقیہ وصوفی سے گریزاں ہوتا ہے کیونکہ ان کی وجہ سے قوموں کے سفینے ڈوب چکے ہیں۔

ایں راز ہے مردان حر کی درویشی
کہ جبریل سے ہے اس کی نسبت خویشی
کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوشی اندیشی

خیروشر کے متعلق اس نے جو معیار قائم کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ

پیش باطل تیغ و پیش حق سپر
امر و نہی او عیار خیر و شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم
ہم بقہر اندر مزاج او کریم

''اخلاقیات اسلام کا معیار اس واحد سکہ پر ہے کہ فرد من حیث الفرد کیا حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کا کوئی طرز عمل یا رویہ جو فرد کے آزادانہ ارتقاء وعروج کے راستے میں حائل ہو وہ شریعت اسلامیہ اور اخلاقیات اسلام کے قطعاً خلاف ہے۔''

''وہ چیز جو انسان کے اندر شخصیت کے احساس کو تیز کرے خیر ہے اور جو اسے کمزور کرنے کا باعث ہو وہ شر ہے۔''

تقدیر کے عام مفہوم سے بھی مردمومن گریزاں ہے وہ اپنی تقدیر کا ذمہ دار خود کو قرار دیتا ہے اس کے مطابق تقدیر تدبیر کی محتاج ہے تدبیر کے لازمی نتائج کے طور پر تقدیر بنتی یا بگڑتی ہے۔ تدبیر اور تقدیر کے مسئلے کو وہ جبر واختیار کے بین بین سمجھتا ہے۔

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقدرا بھی ناخوش ابھی خور سند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مردمومن اس درجہ سخت جان ہے کہ آتش نمرود میں خاموش ہی رہتا ہے۔ وہ کوئی دانہ اسپند نہیں جو زندگی کے اولا میں پھوٹ پڑے، وہ ''پرسوز نظر بازو نکو بیں وکم آزار'' ہے گو اس کی جیب خالی ہے۔ لیکن بے زری اس کے نزدیک کوئی عیب نہیں، کیونکہ اسے زر پرستوں سے نفرت ہے، وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے اور آزادی کے ساتھ حق بات کہتا ہے، کرتا ہے اور تجدید معاشرہ کر کے دوسروں کو بھی حق کی طرف مائل کر دیتا ہے۔

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندہ مومن ہوں نہیں دار اسپند
پرسوز و نظر بازو نکو بیں ہیں کم آزار
آزار دگر قہار و تہی کیسہ دور سند

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لیے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے
راز ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

قوت وطاقت، روحانیت وعظمت کا یہ پیکر اپنے مزاج کے اعتبار سے دورخا ہے۔ یہ کوہ و بیاباں پر تو بجلی بن کرگرتا ہے اور پتھروں کے کلیجے میں خنجر کی طرح اتر جاتا ہے، لیکن خس وخاشاک اور نرم ونازک موجودات کا محافظ ہے۔ دوستوں کے درمیان ریشم کے لچھے دھاگے کی مانند ہوتا ہے لیکن ''رزم حق وباطل ہوتو فولاد ہے مومن'' وہ خاکی ہوتے ہوئے بھی اس خاکداں سے بے تعلق ہے۔ اس کی حریفانہ کشاکش تو افلاک سے ہے۔ کنجشک حمام اس کی نظر میں بے حد چھوٹے شکار ہیں وہ تو جبریل اور اسرافیل کا شکاری ہے اور اتنا بھولا بھالا ہے کہ فرشتے اس کی اداؤں پر قربان ہیں لیکن ''حوروں کو شکایت ہے کہ کم آمیز ہے مومن''

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و اسرافیل کا صیاد ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کہ کم آمیز ہے مومن

مردمومن کا سیاسی اور مذہبی مسلک:

قرآن چونکہ انفرادی یا شخصی حکومت کی اجازت نہیں دیتا وہ ملوکیت ہی نہیں ان تمام طرز حکومتوں کا دشمن ہے جس میں انسانوں کے بنائے ہوئے آئین طوق سلاسل کے طور پر انسانوں کے گلے میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اور کبھی فرد تنہا اور کبھی جماعتیں انسان کو اخلاقی اور معاشی اعتبار سے پردے کے پیچھے سے لوٹ لیتی ہیں۔ قرآن بجائے خود خدا کا کلام ہے قانون ہے جسے اپنے عصر کا اکمل ترین مردمومن نافذ کرتا ہے۔

نقش قرآں تا دریں عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ وردل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

اسی لیے اس میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ قانون ترمیموں اور تنسیخوں سے مبرا ہے، تجدید کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ارشاد باری ہے۔ ''لاتبدیل لکلمت اللہ'' یعنی خدا کی باتوں میں (ذرہ بھر بھی) تبدیلی نہیں ہوتی۔ اقبال کا مردمومن بھی اس کا تہہ دل سے معترف ہے۔

حرف اور اریب نے تبدیل نے : آیہ اش شرمندہ تاویل نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا۔

''موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے۔ اس کا دماغ مغربی خیالات کی لانگاہ بنا ہوا ہے اور میں علی روس الاشہاد کہتا ہوں کہ اپنی قومی روایات کے پیرایہ سے عاری ہو کر اور مغربی لٹریچر کے نشہ میں سرشار رہ کر اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل بہت پرے ہٹا دیا ہے۔ بلاخوف تردید میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے، لیکن بایں ہمہ ہمارے نوجوان کو جو اپنی قوم کی سوانح عمری سے بالکل نابلد ہے مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استمناً واستعداد رجوع کرنا پڑتا ہے۔ عقلی و اورکی لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے حصص سے خالی ہے جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر جس کا اعتراف، تجربہ آج ہم سے کرا رہا ہے، نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکت احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنالینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنج وہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب علم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصورات سے نابلد ہے، روحانی طور بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے اور اگر موجودہ صورت حال اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے ہماری جماعت کے جسم بالکل ہی نکل جائے گی۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ مترشح ہے کہ نصب العینی معاشرہ کے نوجوانوں کو ان کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی روایات کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخی بصیرت کو بھی پورے طور پر نکھارا جائے گا تاکہ خدا اور رسول کی اطاعت ان کے دلوں سے اپج سکے۔ اس کے علاوہ ان میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا ہو سکے۔

قرآن میں ارشاد باری ہے کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ اس شخص کی مغفرت نہیں کرتا جو اس کے ساتھ شریک شرک کرے اور اس کے سوا جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

''جملہ اختیارات اللہ کے لیے ہیں۔''

ظاہر ہے، انسان جب خدا کے احکام کی پیروی چھوڑ دیتا ہے تو اس کی آزادی اور روحانی بلندی جاتی رہتی ہے اور نیچے کے طور پر وہ انسان پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے، کہیں قیصر وکسریٰ کی غلامی کرتا ہے تو کہیں کاہن وپاپا کے دربار میں سجدہ ریز ہوتا ہے کبھی سلطان وامیر کی پوجا کرتا ہے تو کبھی ناسوم اور نادیدہ فرضی قوت فطرت کے سامنے سجدے کرتا ہے۔ نصب العینی معاشرے کا ہر فرد ان امور کا بھرپور شعور رکھتا ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ جب کتے بھی ایک دوسرے کے سامنے سامنے سرتسلیم خم نہیں کرتے تو بھلا ایک باشعور انسان انسانوں کے آگے کیوں جھکے۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد وجم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تراست
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سرخم کرد
بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مند زیر دست
سطوت کسریٰ یصر رہزنش
بند ہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر

صاحب اورنگ دہم پیر کنشت
باج برکشت خراب او نوشت
درکلیسا ابنقف رضواں فروش
بہرایں صید زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرو
خرمنش مع زادہ با آتش سپرد
از غلامی فطرت اوروں شدہ
نغمہ با اندر نئے اوخوں شدہ

نصب العینی معاشرے کا ہر فرد بشر مذہب کا شخصی شعور رکھے گا اور اس پر عمل پیرا ہوگا۔ اسے الگ سے کسی سیاسی شعور کی حاجت نہیں ہے کیونکہ اسلام بجائے خود ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے اندر زندگی کی تمام ہمتوں کو جذب کیے ہوئے ہے۔ قرآن ہی اسے سیاست کے رموز سے بھی آشنا کردے گا اور اس کی سیاست منافقت اور چالاکی کے مترادف نہیں ہوگی بلکہ اس کی آزادی ضمیر کا نام ہی حریت اور سیاست ہے۔ وہ کسی بندے کا غلام نہیں ہوگا اور نہ اس کا کوئی بندہ ہوگا۔ اس کا امیر جس خدا کے سامنے جھکے گا، اسی خدا اور رسول کی پیروی و اطاعت سارا معاشرہ کرے گا۔ قرآن ایک کھلا ہوا دستور حیات ہے اس لیے ہر فرد اپنے طور پر اس کے رموز سے آشنا ہونے کی کوشش کر لے گا اور تصادم اور ٹکراؤ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کیونکہ سارے معاشرے کی حیات احکام خداوندی کی پابند ہوگی۔ سب پر ایک ہی قانون نافذ ہوگا، حد تو یہ ہے کہ اس کا امیر بھی اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ معزول کر دیا جائے گا۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ایک وہی باقی بتان آزری

فرد از توحید لاہوتی شود
ملت از توحید جبروتی شود
ہر دو از توحیدی گیرد کمال
زندگی ایں راجلال آں راجمال
ملتے چوں می شود توحید مست
قوت و جبروت می آید بدست

اسلام امیر کی اطاعت کا حکم دیتا ہے۔ لیکن اس کے نافذ کردہ قوانین اس وقت تک قابل عمل ہیں جب تک وہ اللہ کے حکم کے عین مطابق ہوں۔ اگر اس کے حکم میں اس کی شخصی اور ذاتی غرض کارفرما ہو تو اس کا حکم لائق تقلید نہیں، تاریخ شاہد ہے کہ خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ نے بار خلافت سنبھالنے کے بعد حکومت الٰہی کے اسی پس منظر میں کہا تھا۔

”جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت پر تم لازم نہیں۔“

خدا کا یہی وہ اٹل قانون ہے جو آدمی کو آدمی کا احترام کرنا سکھاتا ہے

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

اور آخر میں اس نصب العینی معاشرے کی تمام صفات کو اقبال ایک شعر میں دیکھیے۔

چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

مردمومن اور ابلیس :

مردمومن شیطان کو اپنا بدترین دشمن تصور کرتا ہے کیونکہ وہ اس سے اگر نفرت کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نافرمان خدا اور مردود ہے۔ ورنہ مردمومن، کو فعال رکھنے اور قوت تصادم کی پرکھ گناہوں سے بچنے کے حوصلوں کی جانچ شیطان ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس لیے اقبال کے مردمومن کو شیطان کی انانیت اور عمل پذیری بہت پسند ہے۔ اس معاملے میں وہ قدرے رومانی ہے اور اس کے کردار کی چھاپ سارے نصب العینی معاشرے پر پڑتی ہے۔ وہ اپنی ہر نیکی کو رسول کے اسوۂ حسنہ سے حاصل کرتا ہے اور اپنے ذوق تصادم سے مجبور ہو کر شیطان سے پوری قوت کے ساتھ ٹکراتا ہے اور ابلیس کو شکست دے کر اپنے تجربے میں ایک نیا اضافہ کرتا چلتا ہے۔ شیطان کے بندے شیطان کے پھندوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ابلیس مردمومن سے پناہ مانگتا ہے اور اس کے سامنے لرزاں و ترساں نظر آتا ہے۔ اس طرح ”مردمومن“ کے معاشرے میں اذانوں کی گونج سے ابلیس کا دم گھٹتا ہے اوف وہ خالی ہاتھ واپس جاتا ہے۔ اقبال کا مردمومن اپنی جمعیت کے افراد کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ خدا نے ایک ہی شیطان پیدا کیا تھا لیکن شیطان نے عالم خاک سے ان گنت خاکی نہاد شیطان پیدا کر لیے ہیں، اس لیے ان سے ہوشیار رہو۔

مشو نخچیر ابلیسان ایں عصر
خسان را غمزہ شاں سازگار است
اصیلا راہمہ ابلیس خوشتر
کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است

اقبال کا مردمومن شیطان کی خودی اور اس کی فعلیت کو پسند کرتا ہے۔ لیکن اس کی خودی کے غلط مفہوم اور نافرمانی سے اسے شدید نفرت ہے۔ اسی لیے: ابلیس کو ”خواجہ اہل فراق“ کے نام سے پکارتا ہے۔

گم بگو آں خواجہ اہل فراق
تشنہ کام و ازازل کونیں لیاق

لیکن ابلیس بھی اس نصب العینی معاشرے میں ہاتھ دھرے بیٹھا رہ جاتا ہے کیونکہ اس معاشرے کا ہر فرد خدا پرست ہوتا ہے اور اس کی خدا پرستی اور خدا ترسی کا مظہر اس کے اعمال و افعال ہوتے ہیں۔ اس لیے شیطان جھک مار کر یہ کہتا ہے:

”اے آدم تو مجھے اب اس آگ سے نجات دے جس میں میں جل رہا ہوں۔ یعنی تجھے گمراہ کرنے کا شغل بمزلہ بار ہے صیاد اس وقت دام بچھاتا ہے جب اسے یقین ہو کہ شکار پھنس سکتا ہے، میرا سارا کاروبار تیری نادانی سے قائم ہے اگر تو کودشناس ہو جائے تو میرا خاتمہ ہو جائے گا۔“

صید اگر زیرک شود صیاد نیست

نیابت الٰہی:

صفات بندہ حق یہ ہیں کہ وہ کسی کا غلام نہیں ہوگا۔ صرف آئین خداوندی کا پابند ہوگا۔ معیار خیر و شر آئین حق سے اخذ کرے گا، اس کی اور پورے معاشرے کی زندگی آئین حق کی تابع ہوگی آئین حق قرآن کریم ہے۔ غیر حق کی تقلید کا نتیجہ تباہی ہے آمری اور ماسوی اللہ کافری ہے۔ غیر اللہ کی حکومت کا لازمی نتیجہ ”وہ خدایاں فربد ہقاں چو ودک“

مردمومن اور عورت:

مردمومن عورت کی عزت و ناموس کا محافظ ہی نہیں بلکہ عورت کی ذات میں انسان کی

نغمہ خیز ازز خمہ زن ساز مرد
از نیاز اوود بالا ناز مرد
پوشش عریانی مرداں زن است
حسن دلجو عشق راہبر اہمن است
عشق حق پر در وہ آغوش او
ایں نوا از زخمہ خاموش او

اقبال اس ذیل میں رقمطراز ہیں:

''امت مسلمہ جس دین فطرت کی حامل ہے اس کا نام ''دین قیم'' ہے ''دین قیم'' کے الفاظ میں ایک عجیب وغریب لطیفہ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوم ہے، اس گروہ کے امور معاشی اور معاری کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کردے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن کی رو سے حقیقی، تمدنی یا سیاسی معنوں میں ''قوم'' دین اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے۔ کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہو نامقبود ومردود ہے۔''

اپنی نظم ''وطنیت'' میں بھی اقبال نے انہیں خیالات کا اعادہ کیا ہے اور مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انہیں متنبہ کیا ہے کہ عصر حاضر نے جہاں ان گنت بت تراشے ہیں وہاں وطنیت کو سب سے اونچا مقام رکھا ہے اور یہ تصور ملت بیضا کے لیے سم قاتل ہے۔

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

عصری انسان اور اقبال:

عصری انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ وہ تو مقام آدمیت سے واقف ہے نہ مقام کبریا سے آگاہ۔ اسے نہ تو انسان کے شرف وعظمت کا پورا احساس ہے اور نہ خدا اور بندے کے تعلقات کا صحیح علم وعرفان گویا عصری انسان ذہنی اعتبار سے ایک ایسی عجیب وغریب حالت میں ہے جہاں وہ عملاً خدا سے تو بیگانہ ہے ہی خود اپنی ذات اور اپنی حقیقت سے بھی بے خبر ہے۔ اس بیگانگی اور بے خبری نے اس کے چاروں طرف بے سکونی اور بے اطمینانی کا ایک جال سا بن دیا ہے۔ اس بے سکونی سے سکون کی طرف آنے کیلئے انسان تمام تر حربے استعمال کر کے مادی اسباب جمع کرتا ہے۔ لیکن اس کی جبلت اسے ان مادی اسباب پر بھی قانع نہیں رہنے دیتی۔ اور وہ کوشش کے باوجود بے سکونی کے جال سے باہر نہیں نکل پاتا۔ اس مرحلے پر اسے خدا یاد آتا ہے اور سکون کے حصول کیلئے وہ حقیقت کبریٰ کا عرفان اور تقریب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ قدم بڑھاتا تو ہے لیکن مادی اسباب ور علائق دنیا کی زنجیریں اس سے راہ پر گامزن نہیں ہونے دیتیں۔ اور تب بے سکونی و بے اطمینانی کے گرداب میں پھنسے ہوئے انسان کے اندر احساس بے بسی کا ایک طوفان سا اٹھتا ہے جو اسے محض خدا سے ہی نہیں خود سے بھی بیگانہ وبدگمان کر دیتا ہے اس قدر کہ اسے اپنے اندر موجود بشری صفات کا ادراک ہو پاتا ہے اور نہ اپنی ذات میں پوشیدہ صفات قدسیہ وملکوتیہ کا یقین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محض مادی اسباب کے ریشمی جال میں جکڑا ہوا انسان اپنی خودی، انا، غیرت وحمیت کا مقام ومرتبہ سب سے محروم ہو کر مادیت کی دلدل میں اس حد تک غرق ہو جاتا ہے کہ پھر وہ انسان نہیں انسان نما حیوان ہو کر رہ جاتا ہے۔ عصری انسان جدید تہذیب کے نام پر کس کس عنوان سے اپنی حیوانیت، وحشت وبربریت کا مظاہرہ کر رہا ہے اس کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس نوع کا انسان نما حیوان نہ تو معاشرے کیلئے کارآمد ہے۔ نہ مذہب کے لئے گوارہ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے حیوانیوں کے ہاتھوں نہ صرف تہذیب جانکنی کے عالم میں ہے بلکہ ایک اعتبار سے مذہب بھی ہدف تنقید بن رہا ہے۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ فکر اقبال کا مرکز ومحور ایک اعتبار سے مثالی انسان کی تلاش وتعمیر ہی قرار پاتا ہے حتیٰ کہ وہ اگر خدا کا بھی تصور کرتے ہیں تو ان کے پیش نظر انسان ہی رہتا ہے۔ اس لئے کہ اقبال انسانیت کے پرستار تھے اور قرآن پاک کے اس قول کے مطابق لقد خلقنا الانسان فی احسن تقوی (ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا) حضرت علامہ بھی انسان کو خدا کی تخلیقات کا بہترین نمونہ سمجھتے ہیں۔ پورے کون ومکان میں دو ہی وجود اقبال کی نگاہ میں قابل لحاظ ہیں۔ خدا اور انسان۔ چونکہ انسان سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے اس لئے بھی وہ اسے افضل ترین مخلوق اور فطرت کا بہترین شاہکار سمجھتے ہیں اور اس شاہکار پر ناز کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اقبال کو اس انسان کی تلاش انسانیت کی تکمیل کی خاطر تھی کیونکہ وہ قرآن کی روشنی میں اس حقیقت کے قائل تھے کہ زندگی کا مقصد انسانیت کو مکمل کرنا ہے اور انسانیت ہی کائنات کی تخلیق، تہذیب اور تکمیل میں خدا کی معاون ہے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ انسان کو اس کا کھویا ہوا مقام مل جائے اس کے اندر روحانی وجسمانی دونوں اعتبار سے اتنی قوت پیدا ہو جائے کہ ستاروں سے آگے کے جہانوں کی تسخیر بھی اس کیلئے سہل ہو جائے صحیح معنوں میں اقبال انسان کو بندہ زمانہ نہیں بلکہ بندہ خدا دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ خلوص اور ایمان کی گہرائیوں سے بندہ خدا ہے بغیر انسان اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ جس کی بشارت قرآن پاک نے دی ہے لیکن اس کے لئے لازم ہے کہ انسان قرآن مجید کی راہنمائی میں سمت اور منزل کا تعین کر کے جدوجہد کرتا ہے۔ آیت قرآنی ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ:

اقبال کے الفاظ میں:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

بلکہ علامہ اقبال عمل اور جدوجہد کو لامحدود کرنے کا بھی درس دیتے ہیں۔

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

دراصل یہ انسان کیلئے خوب سے خوب تر کی تلاش اور ہمہ دم سرگرم عمل رہنے کا پیغام ہے۔ کیونکہ عمل اور جدوجہد زندگی ہے اور زندگی انسان کے پاس اللہ تعالیٰ کی ایک بیش بہا امانت ہے۔ قرآن حکیم میں ہے

''ہم نے انسانوں کو زمینوں کو اور پہاڑوں کو اپنی امانت دکھلائی کسی نے قبول نہ کیا اور اس سے ڈر گئے۔ انسان نے اسکو اٹھالیا۔''

حضرت علامہ انسان کی اسی جرات اور خطر پسند طبیعت کی قدر کرتے ہیں لیکن انسان اسی امانت کی قدر نہیں کر سکا۔ کیونکہ انسان بڑا ظالم اور نادان ہے۔ ''انا کان ظلوما جھولا'' اقبال یہ چاہتے ہیں کہ انسان یہ ثابت کر دے کہ وہ واقعی اس امانت کا اہل تھا اور ہے۔ اقبال کے انسان کامل کے ضمن میں کارلائل کے ہیرو (شوپنہار کے جینیس اور نطشے کے فوق البشر (Superman) سے لے کر محی الدین ابن العربی عبدالکریم جیلی اور مولانا جلال الدین رومی کے انسان کامل کے فلسفیانہ تصورات تک سے پیش کی جا چکی ہیں۔ اقبال کا انسان کامل حقیقی معنوں میں اشرف المخلوقات کہلانے کا حقدار ہے۔ روحانی اعتبار سے اسے خدائے پاک کا تقریب خاص،، حاصل ہے۔ ذات اور کائنات کے تمام اسرار یا

اس کی آنکھوں کے سامنے سے سارے پردے ہٹ گئے ہیں۔

ویسے اقبال کو کس طرح کے مثالی انسان کی تلاش تھی اس کے بارے میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اقبال کو اپنا روحانی سہارا قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس وقت (یعنی اقبال کے عہد میں) شقیت میں ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو مغربی تعلیم پر فخر کرنے والے عام لوگوں سے زیادہ تعلیم پائے ہوئے ہو اور ان سے بڑھ کر ہی مغربی علوم پر نگاہ رکھتا ہو اور پھر وہ اس پر زور طریقے سے اسلامی نظریات کی تائید کرے کہ مغرب زدہ لوگ اس کے سامنے بولنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ فریضہ ایک حد تک خود اقبال نے ادا کرنے کی کوشش کی۔ اقبال کے عہد میں مغرب کی جانب سے بردباری کا سیلاب بس زور وشور کے ساتھ مشرقی اقوام خصوصاً عالم اسلام کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ شاعر مشرق نے اسی زور وشور سے اس کے خلاف جہاد شروع کیا۔ انہوں نے یورپ کے طلسم کے تار و پود بکھیر کر یورپ کی ہوس پرستی، استحصال پسندی اور نو آبادیت (Colonialism) کے خطرناک نتائج اور اس کے خلاف جہاد کی اہمیت سے مشرقی اقوام اور عالم اسلام کو آگاہ کیا۔ دراصل اقبال اپنے عہد کی انسانی زندگی کے بحران اور طوفان سے ساحل کے تماشائی نہیں، بلکہ ناخدا کی طرح وابستہ تھے۔ اپنے زمانے کے حشر خیز تضادات پر نظر رکھتے ہوئے وہ انسانی اخوت مساوات اور آزادی کے جن تصورات تک پہنچے تھے اور اس کے پیچھے بنی نوع انسان کی محبت کا جو جذبہ کارفرما تھا وہ ان کے عہد کے دیگر شعراء اور فلاسفر کے یہاں کم ہی نظر آتا ہے۔ بنی نوع انسان کیلئے اسی جذبہ محبت کی بنا پر وہ خودی کا تصور پیش کرتے ہیں جو انسان کی ذات میں پنہاں صلاحیتوں اور قوت کو بروئے کار لانے کیلئے نسخہ کیمیا ہے اور خودی کی وضاحت کیلئے ہی اقبال انسان کامل، قلندر، مومن، شاہین وغیرہ کی علامتیں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ اقبال کے یہاں انسان کامل ان کے دیگر تصورات کی طرح ایک تصور ہے جس کا بہترین نمونہ رسول پاکؐ کی ذات ہے۔ لیکن اقبال کا تخاطب انسان کامل سے نہیں۔ عصری انسان سے ہے۔ عصری انسان کو ہی مخاطب کر کے اقبال لکھتے ہیں:

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھنے لگے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید تیرے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تیری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہ رسا دیکھ
کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
آئینہ لیام میں آج اپنی ادا دیکھ

ہاں آج ہم اپنی ادا دیکھیں تو محسوس کر سکتے ہیں کہ ہمارا کوئی پرسان حال نہیں، ہم پس رہے ہیں چاروں طرف سے، اقبال اپنی نوٹ بک Stray Reflections میں حال ''The Present'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

People extol the past and deprecate the present, not understanding that the present is the whole of the past concentrated in one point.

میں آخر میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا

Have we Got the Point?